Price Rs. 6-00

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

فروری : ۱۹۹۵ء جلد : ۱۲ شمارہ : ۲ قیمت ۶ روپے

○

زرتعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۲۰۰ "	۳۶۰ "	۳۷۰۰ "
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰،۰۰۰ روپے

○

ترسیل زر کا پتہ ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز ۔ حیدرآباد-1

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے "پبلک پرنٹرس" پتہ بازار میں چھپواکر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

۳

رئیس اختر

حمد

جز تیرے کسی سے نہ رہے کام خدایا
ہو شام و سحر لب پہ ترا نام خدایا

الفاظ تری حمد کو لاؤں میں کہاں سے
یہ سوچ رہا ہوں سحر و شام خدایا

بخشی ہے مجھے تو نے ہی یہ عظمت شعری
ہر چند کہ ہوں بندۂ بے دام خدایا

توحید کی مے جس میں چھلکتی رہے ہر دم
چھوٹے نہ مرے ہاتھ سے وہ جام خدایا

اب تک تو سنبھالا ہے تری چشم کرم نے
قدموں پہ محمدؐ کے ہو انجام خدایا

منزل مرے قدموں کی طرف آپ بڑھے گی
جب ساتھ ہو رحمت تری ہر گام خدایا

دن رات رئیسؔ آج بھی مصروف دعا ہے
ایمان پہ ہو زیست کا انجام خدایا

عیدالفطر

صلاح الدین نیّر

یہ جشنِ عید ہے یہ مسرّت نواز ہے
اُن کے لئے کہ جن کی عبادت میں کٹ گئی
اُن کے لئے جو دین کی راہوں میں صبح و شام
خوشبو کے اِک سفر کی طرح تیز گام تھے
مفلس سے، بے نواؤں سے بھی ہم کلام تھے

○

یہ جشنِ عید ہے یہ، مسرت نواز ہے
اُن کے لئے جنہوں نے یتیموں کی لی خبر
جو بے گھروں کے واسطے اِک سائبان تھے
اُن کے لئے جو شمعِ فروزاں کی شکل میں
جلتے رہے ہیں خانہ بدوشوں کے واسطے

○

یہ جشنِ عید ہے یہ مسرت نواز ہے
اُن کے بھی واسطے جو مروّت شناس ہیں
جو دل سے دُور رہتے ہوئے دل کے پاس ہیں
اُن کے لئے جو جیتے ہیں اوروں کے واسطے
جو منتظر ہیں صبح کے پیغام کے لئے
مصروف ہیں جو دین کے ہر کام کے لئے
لیتے ہیں سانس عظمتِ اسلام کے لئے

○

اُن کے لئے جو دین کی راہوں میں صبح و شام
خوشبو کے اِک سفر کی طرح تیز گام تھے
مفلس سے، ہم نواؤں سے بھی ہم کلام تھے

مومن خاں شوق

عیدِ رمضاں

نویدِ مسرت، نشاطِ تمنا!
بہار آشنا، ساعتِ عیدِ رمضاں
عبادت، ریاضت، نماز اور روزے
مسلماں کے حق میں ہیں جنت کے ساماں

نور و نکہت کا جیسے ہو سیلِ رواں
جیسے اخلاص و الفت کا اِک کارواں
درسِ انسانیت جس سے ملتا ہے شوق
عیدِ رمضاں ہے، امن و اماں کا نشاں

عید مفہوم شادمانی ہے
عید مہکی ہوئی کہانی ہے
شوق رمضاں کی عید کا حاصل
میرے مولا کی مہربانی ہے

اسحاق ملک

عید اور مسائل

عید، بادِ صبا، چاندنی، نغمگی
روزہ داروں کے حق میں دُعا، سرخوشی
رحمت بیکراں
اور جب اس کا مفہوم بدلا گیا
ہر دفعہ عید پر
لوگ الجھے ملے، مضمحل، غم زدہ
یوں خوشی میں غموں کی ملاوٹ ہوئی
عید نزدیک آتی گئی جس گھڑی
قلب اور ذہن کو اِک تھکاوٹ ہوئی
خواہشوں نے پچھاڑا ہے ایمان کو!
روح کی تازگی بے صدا ہو گئی
اور پھر عید اِک مسئلہ ہو گئی

غزلیں

محمد قمر الدین صابری

[1]

نہیں ہے وہ مجھ سے قریب تر آیا — جدھر بھی میں نے نظر کی وہی نظر
کلی چٹک کے چمن میں بہار لے آئی — کھلا جو پھول بہ اندازِ نو نکھر
وہیں سے ہو گی ہر راہِ زندگی روشن — نظر کے راستے جب دل میں وہ اتر
زمانہ جذبۂ صادق مٹا نہیں سکتا — دبا جو عشق تو اک بار پھر ابھر
تھا اس کی بزم میں اس کا جمال ہوش ربا — گیا تھا ہوش میں آیا تو بے خبر
جوابِ عرضِ تمنا حسین تھا اس کا — لئے وہ ہاتھوں میں اک شاخِ بے ثمر

ادب کی چاندنی نزدیک و دور پھیل گئی
تمہاری بزم میں اس شان سے قمر آیا

[2]

محترمہ عائشہ بیگم رباب

بگڑی کیسے بنائیں مشکل ہے — انہیں کیونکر منائیں مشکل ہے
باوفا کو کچھ اور کہہ بیٹھے — بات کیسے نبھائیں مشکل ہے
ان کا بے جا عتاب جاری ہے — اور ہم مسکرائیں؟ مشکل ہے
موت جن کی بنے رفیقِ حیات — انہیں کیسے جگائیں مشکل ہے
خاک ہی خاک اڑتی ہے ہر سو — کیسے محفل سجائیں مشکل ہے
ہم مشکل سے ہیں رہبر و رہزن — کس کے ہمراہ جائیں مشکل ہے

دل ہی جب بجھ کے رہ گیا ہو رباب
کیا ہنسیں کیا ہنسائیں مشکل ہے

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

بس ترا نام لکھ دیا ہے
قصہ تمام لکھ دیا ہے

ایک ہی لفظ کن کہا اور
سارا نظام لکھ دیا ہے

جذبات کی اک دوکان دنیا
ہر شے کا دام لکھ دیا ہے

یہ کیا غضب کیا کہ میں نے
شام کو شام لکھ دیا ہے

حصہ بقدر ظرف اس نے
نام بنام لکھ دیا ہے

اہل نظر پڑھیں کہ ہم نے
حرف دوام لکھ دیا ہے

اپنی غزل میں میں نے رحمت
اپنا مقام لکھ دیا ہے

شفیع اقبال

کون جانے کہ زندگی کیا ہے
رنج کیا چیز ہے خوشی کیا ہے

کم سے کم اک نگاہ دز دیدہ
ہم سے ایسی بھی بے رخی کیا ہے

دعوئے دوستی تو کر بیٹھے
یہ بھی جانا کہ دوستی کیا ہے؟

تیری صورت جواب ماہ تمام
تیرا جلوہ ہے چاندنی کیا ہے

زندگی غم کا غم خوشی کا نام
کیا بتائیں کہ زندگی کیا ہے

زندگی نام ہے اگر غم کا
پھر یہ ہنگامہ خوشی کیا ہے

عام دیدار حسن، عشق آرزاں
اک تماشہ ہے عاشقی کیا ہے

ہے شفیع چشم مست کا صدقہ
ورنہ ساغر میں دلکشی کیا ہے

رحیم رامش
معتمد بزم بہار ادب
سرپور کاغذ نگر

غزلیں

تھا جو کل تک مگر وہ آج نہیں
وقت کا پہلا سا مزاج نہیں

بھیج دیتے ہیں غیر ملکوں کو
دیش کے واسطے اناج نہیں

ہم حکومت دلوں پہ کرتے ہیں
پاس اپنے تو تخت و تاج نہیں

ظلم سے کب وہ باز آئیگا
لب پہ جب اپنے احتجاج نہیں

ہو مرض کوئی تو شفا پائیں
شک کا کوئی مگر علاج نہیں

کسی مظلوم کی مدد کرنا
اس زمانے میں یہ رواج نہیں

ظلم چپ چاپ یوں ہی سہ لینا
تیرے رامش کا یہ مزاج نہیں

کیسا یہ زندگی میں مری حادثہ ہوا
"تم کیا جدا ہوئے مرا سایہ جدا ہوا"

اب یہ پتہ چلا ہے وہ کیوں بے وفا ہوا
میرا رقیب بھی تھا اسی سے ملا ہوا

دو چار پل گزارے مرے ساتھ اس نے کیا
ظالم قرار دل کا ہی لے کر ہوا ہوا

اس میں تمام اسکی تھی خوشبو بسی ہوئی
جب جب بھی مجھ کو خط ملا اسکا لکھا ہوا

ناآشنا تھا پیار کے مطلب سے جو یہاں
میں کیا کروں اسی پہ مرا دل فدا ہوا

حیرت سے تک رہے تھے سخنور سبھی اسے
رامش جو بزم میں تری نغمہ سرا ہوا

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

آزمائش اور عزیمت!

جس وقت پولیس پورش کا حیرت انگیز واقعہ پیش آیا اس وقت حضرت مولانا مدظلہ رائے بریلی میں تھے حادثہ کی اطلاع پا کر وہاں سے تشریف لائے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں اساتذہ، طلبہ، اسٹاف اور شہریوں کی بڑی تعداد کی موجودگی میں حضرت مولانا مدظلہ نے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی۔

الحمد للہ کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔

میرے عزیز ساتھیو! اور دارالعلوم کے فرزندو! اور شریف خاندان کے افراد! میں اس آیت کو اپنی تقریر کا عنوان بنانا چاہتا تھا جو ابھی قاری صاحب نے پڑھی، اور یہ بالکل حسب حال ہے بلکہ مسلمانوں کو، امت اسلامیہ کو بالعموم، اور حاملین علم کو اور ذمہ داروں کو، اور جو دینی منصب رکھتے ہیں اور جن پر امت کی ذمہ داری ہے نہ صرف دعوت و اصلاح کی، بلکہ امت کے لیے نمونہ بننے کی ان کے لئے ایک ہدایت نامہ ہے اور پیشین گوئی بھی ہے اور یہ تبارک وتعالیٰ کے عالم الغیب ہونے، اور اس کے رحیم و رحمٰن ہونے، اس کے عزیز ذوانتقام ہونے، ان تمام صفات کی یہ آیت گویا

جلوہ گر ہے اور اس کا ایک دستور العمل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولنبلونکم بشئی من الخوف، الخ اے مسلمانو! اور پھر آیت کا سیاق بتاتا ہے کہ ان میں بھی (یعنی مسلمانوں میں بھی) جو دعوت کا امتیاز رکھتے ہیں، عقیدے کا امتیاز رکھتے ہیں، ایمانی طاقت کا امتیاز رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی دعوت و اصلاح کی ذمہ داری کا امتیاز رکھتے ہیں وہ خاص طور پر مخاطب ہیں آیت کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ وہ طبقہ جو اونچا طبقہ ہو، یا اہل علم کا طبقہ ہو، اور جو داعیوں کا طبقہ ہے وہ خاص طور پر مخاطب ہے، "ولنبلونکم بشئی من الخوف" اور ہم تمہاری آزمائش کریں گے ذرا تھوڑے سے خوف سے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور رحمت ہے کہ وہ "بشئی من الخوف" کہہ رہا ہے، اللہ تبارک تعالیٰ کہہ رہا ہے اللہ کے نزدیک جو بھی بڑے سے بڑے مصائب پیش آتے ہیں، بڑے سے بڑے خطرات درپیش ہوتے ہیں یہ سب اس کے نزدیک "بشئی من الخوف" ہے، اس سے تسکین دینی بھی مقصود ہے اور حقیقت بیان کرنی بھی مقصود ہے، کہ بہت بڑی گستاخی، عیب، ہائل اور لرزہ براندام کرنے والی چیز تو بڑی چیز ہے اس کا تحمل بھی نہیں یہ جو مسائل پیش آتے ہیں جو آزمائش پیش آتی ہے یہ "بشئی من الخوف" ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے تسکین بھی دی ہے، اور تیار بھی کر دیا اس کے لیے کہ وہ بہت اہمیت نہ دے کہ "بشئی من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات" یہ سب لفظ بتاتے ہیں کہ نقص من الاموال والانفس والثمرات" اس کو لفظ نقص سے تعبیر کیا اور اس کو بشئی من الخوف سے تعبیر کیا، اور وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ اور ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیجیے کہ جب کوئی مصیبت پہونچتی ہے تو وہ کہتے ہیں "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہ ہم کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے ہم اللہ کے ہیں اس کو اختیار ہے کہ جو چیز ہمارے لیے پسند کرے، جس چیز کو ہماری ترقی درجات کا ذریعہ سمجھے، جس چیز کو وہ مصلحت سمجھے وہ پیش آسکتی ہے۔

عزیزو! ہم جن کا نام لیوا ہیں اور جن کے وارث ہیں، جن علمائے ربانیین کے ہم وارث ہیں، ہم جہاں بیٹھے ہیں یہ ہمارا مرکز ہے، دینی مدارس عموماً یہ ان کی روایت شروع سے یہ رہی ہے کہ

ن کے چوٹی کے علما نے اور اپنے زمانے کے گویا مجددین و مجتہدین، معلمین اور داعیوں نے ایسے حالات کا مقابلہ کیا، جو اُن کو پیش آئے ہیں وہ کوئی تعجب کی بات نہیں ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ آپ پڑھیں تو بعض دفعہ ایسا ہوا کہ مولانا یحییٰ علی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقا جیل خانہ میں تھے ان کو پھانسی کا حکم سنایا گیا، لیکن ان کے چہروں پر ایسی مسکراہٹ تھی کہ انگریز مرد اور لیڈیز جو ایسی تھیں تماشہ دیکھنے کے لیے اور (ENJOY) کرنے کے لیے گویا لطف اٹھانے کے لیے کہ ہمارے دشمنوں کو پھانسی کی سزا سنائی جائے گی تو ہمارے لیے تفریح کا موقع ہوگا۔ اور خوشی کا تو دیکھا کہ مولانا جعفر علی تھانیسری، مولانا یحییٰ علی صادق پوری اور ان کے جو ساتھی تھے جب ان کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، اور بالکل معلوم ہوتا تھا کہ خوشخبری کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ تاریخ میں لکھا ہوا ہے، تاریخ کی بات بتا رہا ہے مولانا جعفر علی تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" پڑھیں، سوانح احمدی پڑھیں، اور سیرت سید احمد شہید پڑھیں تو یہ واقعہ ملے گا، ان میں سے بعض دریائے حیرت میں ڈوب گئے، بعض قریب آ گئے۔ بعض عورتوں نے کہا تم سمجھ رہے ہو؟ اس وقت ہوش میں ہو؟ حواس تمہارے ٹھیک ہیں؟ کیا تم نے سنا کیا کہا گیا؟ کہا ہم نے سنا ہمیں موت کی سزا دی گئی، تو تم اتنے خوش کیوں ہو، کہا شہادت کی خوشی میں تم نہیں جانتے کہ شہادت کیا چیز ہے

تو ہندوستان کی کم از کم عاملی اور قانونی تاریخ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ سزائے موت دی جاتی ہے تو بڑی کوشش کی جاتی ہے کہ دریائے شور کی سزا سے بدل جائے کہ کم سے کم اپنی زندگی باقی رہتی ہے اور وہ کالا پانی بھیج دیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ وہاں برسوں رہ کر آ گئے تھے اور جعفر علی تھانیسری ان ہی لوگوں میں سے ہیں جو انڈومان اور کالے پانی گئے تھے۔ اس کے بعد پھر ان کو معافی دے دی گئی، تو بڑی کوشش کی جاتی ہے، اور بڑے اعلیٰ درجے کے وکیل لائے جاتے ہیں کہ قانون داں اس میں کامیابی حاصل کریں کہ سزائے موت کو عمر دریائے شور سے بدل دیا جائے۔ لیکن پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہمارے علم میں کہ بغیر کسی قانونی چارہ جوئی اور کوشش

کے اس خیال سے سزا بدل گئی کہ یہ بہت خوش تھے، ہم ان کو خوش کرنا نہیں چاہتے اس لئے دریائے شور کی سزا دی جاتی ہے اور دی گئی اور مولانا یحییٰ کا وہیں انتقال ہوا وہیں مدفون ہیں۔ خیر آباد کے ایک بڑے عالم جو ادیب اور شاعر تھے مولانا فضل حق خیر آبادی ان کا ایک دیوان بھی ہے وہ ہمارے کتب خانے میں بھی ہوگا، وہیں ان کا انتقال ہوا، ان بزرگوں کا جہاں انتقال ہوا اس کو "کالا پانی" کہا کرتے تھے۔

میرے عزیزو! یہ ہمارے اسلاف کی تو روایت چلی آ رہی ہے، اور اس سے مختلف اور کم و بیش پست سے طریقے ہوتے تھے جو اس وقت کے حق گو علماء کو اور داعیوں کو بڑی سے بڑی سزا دی جاتی تھی یہاں جو کچھ پیش آیا یہ بات، یہ پہلو، حکومت کا یہ عمل کتنا بے جا اور ہندوستان کو نقصان پہونچانے والا ہے، صرف یہی مدارس ہیں جنہوں نے جنگ آزادی میں بڑا حصہ لیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کون تھے؟ مدرسہ کے آدمی تھے، حضرت مدنی کون تھے؟ مدرسہ کے آدمی تھے، مولانا عبد الباری فرنگی محلی کون تھے؟ مدرسہ کے آدمی تھے، مولانا مدنی خود مولانا آزاد اس ندوہ میں جب یہ ندوہ وہاں گولہ گنج میں تھا وہاں ندوہ میں چھ مہینے رہے، اور مولانا شبلی کی سرپرستی اور ان کی رہنمائی میں الندوہ کے نائب ایڈیٹر تھے، آپ کا اخیر تک تعلق رہا اور وہ مجلس انتظامیہ کے رکن بھی رہے اور ان کا بڑا تعلق تھا یہاں سے۔

لیکن یہ جو پیش آیا اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی، اس میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ چیزیں پیش آسکتی ہیں، اور یہ کوئی پھولوں کا فرش نہیں ہے بلکہ یہ وہ راستہ ہے جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی ہیں اور نشیب و فراز بھی ہیں، آپ کو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہئے اور نہ اس سے دل شکستہ ہونا چاہئے، اس میں تو سراسر نقصان پہونچا، صفائی کے ساتھ کہتا ہوں، حکومت وقت کو، اور اس پارٹی کو جو حکومت کر رہی ہے اس لئے کہ ہندوستان سے باہر کے ممالک میں اس کی بڑی عزت ہے اس ادارہ کی وجہ سے ہندوستان کی بڑی قدر ہے، عالموں کو اور اہل علم کو اور فضلا کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دوسرے کم سے کم اسلامی ممالک میں ہندوستان کا بڑا تعارف ہے، موثر اور

تعارف ہے، اور وہ ان مدارس عربیہ کی وجہ سے ہے، آپ کہیں چلے جائیے، کسی عرب خطے میں
ہند سے لے کر مراکش تک آپ چلے جائیے وہاں آپ انہی مدارس کے نام سنیں گے وہ جانتے بھی
ہیں کسی کو یہاں کے علماء کو جانتے ہیں کہ قاموس کی شرح کس نے لکھا اور اصطلاحات علمیہ پر سب سے
کتابیں پوری اسلامی تاریخ میں دو مانی جاتی ہیں اور وہ دونوں ہندوستانی عالموں کی ہیں ایک
بلگرام کے تھے اور ایک تھانہ بھون کے تھے اصطلاحات علمیہ اس طرح کی کتاب ہے اور اصطلاحات
بہت نازک، مشکل ترین فن ہے اصطلاحی تشریح میں ذرا بھی غلطی ہو جائے تو کیا سے کیا ہو جاتا ہے
اس کی رہنمائی میں جس طرح جہاز کا نقشہ ہوتا ہے جس کی رہنمائی سے جہاز چلتا ہے اس میں اگر
ذرا فرق ہو تو جہاز کہیں پہونچ جاتا ہے۔ یہی اصطلاح کا حال ہوتا ہے پورے اسلامی کتب خانے اور
اسلامی ثقافت، علوم اسلامیہ کی تاریخ میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ محتاط اور سب سے
مسلم کتاب جو ہے ہندوستان کے علماء کی ہے، تمام عرب ممالک میں ہندوستان کی وقعت یہاں
آثار قدیمہ کی وجہ سے ہے اور نہ بڑی عمارتوں کی وجہ سے ہے اور نہ یونیورسیٹیوں اور نہ جامعات کی
وجہ سے ہے ان کی کتابیں بڑی عزت کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں۔ اور پڑھی جاتی ہیں، پڑھائی جاتی
اور سب جانتے ہیں۔

یہ واقعہ جو پیش آیا کہ ایسا بے محل، بے ضرورت اور غیر عاقلانہ واقعہ تھا، جس کو پریس کا لغزش
کہا جائے گا۔ اس کو تو اخباروں میں چھاپا جائے گا اس کے لیے اظہار خیال کا کوئی بڑا ذریعہ استعمال
کیا جائے گا، لیکن آپ سے یہ کہنا ہے کہ اشتعال انگیزی نہ ہو، اور یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو
اس سعادت کی بو لگ گئی، آپ کو بھی وہ جھونکا پہونچ گیا اس ابتلا و آزمائش کا جو علمائے
ربانی کے حصہ میں آیا تھا جو بڑے بڑے اللہ کے مقبول بندوں کے حصہ میں آیا تھا، جن کی مقبولیت میں
کوئی شک نہیں تھا۔ اس ہوا کا باد خزاں نہیں کہتا باد بہاری کا ایک جھونکا آپ کو بھی لگ گیا ان
میں سے بعض لوگوں کو زیادہ حصہ ملا، اور دل پر ہاتھ رکھکر کہتا ہوں جن کو چوٹیں آئیں یا جن کو پریشانی
اٹھانی پڑی وہ انشاء اللہ اس کا اجر آخرت میں پائیں گے۔ اور آخرت میں جس وقت وہ اجر آئے گا۔

اس وقت ان کے دل اللہ کا شکر ادا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹھے بٹھائے ان کو بغیر کوئی بڑا ضرر پہونچائے یہ سعادت عطا فرمائی، ان کو اس کا انعام مل رہا ہے، اور آپ یہ بھی یاد رکھیے کہ کلمۂ حق کہنے کے لیے اور صحیح دعوت پہونچانے کے سلسلہ میں اور علوم نبویہ اور علوم اسلامیہ اور علوم ربانیہ کی حفاظت اور اس کی اشاعت کے سلسلہ کی آپ کو آزمائش بھی پیش آسکتی ہے اور کم سے کم جو آزمائش آئے وہ ہے فاقہ کشی اور عسرت کی زندگی کی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کلمۂ حق کہیں اور آپکو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے یہ ہمارے اسلاف کی روایت ہے اور یہ چیز قابل مبارکباد ہے جس کا اثر ہم سبکے دلوں پر ہے اور اللہ بھی جانتا ہے کہ کیا اثر ہے۔ جیسے ہی اس واقعہ کی اطلاع ملی زبانی اور ایک خط کے ذریعہ، کیا حال رہا ہے۔ دن کس طرح گزرا رات کس طرح گذری اس کو آپ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ انشاء اللہ یہ مدارس رہیں گے ان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ اسی سے اور اللہ کی رحمت متوجہ ہوگی، یہ مدارس ہی ہیں جو بچانے والے ہیں۔

یہ ملک ڈوب رہا ہے اگر کوئی آواز اٹھتی ہے اس کو بچانے اور راستہ دکھانے کے لئے تو ان ہی مدارس سے اٹھتی ہے؟ اخلاق کی تعلیم کون دیتا ہے؟ انسان کے احترام کی دعوت کون دیتا ہے؟ پیام انسانیت کی تحریک کہاں سے اٹھی؟ اتنا بڑا ملک تھا ہزاروں کی تعداد میں سنت اور ان کے یہاں کے فقیر تھے۔ ان کے یہاں اصلی سے اصلی یونیورسٹیاں تھیں کسی کو اتنے بڑے ملک میں توفیق نہیں ہوئی کہ انسانیت کی تحریک شروع کرتا۔ اور انسانیت کی آواز بلند کرتا۔ انسانیت کے پاس و لحاظ عزت و آبرو کی، انسان کو دیکھکر خوش ہونے کی، اتنا بڑا ملک تھا کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہمارے مدارس ہی سے یہ آواز اٹھی خدا کے بڑے عذاب سے بچانے کے لئے اور بڑے بڑے زلزلے اور عظیم وبا کے شکار ہونے نہیں دیتا، وہ سب برکت ہے قرآن شریف کی، حدیث شریف کی اللہ کا نام لینے اور حافظوں کی۔

یہ مدارس تو شفاخانوں سے بھی زیادہ ضروری ہیں۔ دس شفاخانوں سے۔ مرناسب کو ہے، ایک مدرسہ پچاس شفاخانوں سے افضل ہے، یہ جو کوتاہیاں ہیں جرائم پیشے روکتی ہیں اور مجرمین

سزا دیتی ہیں مدارس اس سے بھی زیادہ اہم ہیں اس لیے کہ یہ مدرسے اور یہاں سے نکلنے والوں
کی تقریریں اور ان کی نصیحتیں اور ان کی کوشش وہ اتنی بڑی تعداد میں مجرمین پیدا ہونے نہیں
دیتی۔ حتیٰ کہ یہاں کی مغربیات، ضمیر فروشی پر آمادہ کرنے والی چیزیں ہیں۔ جن کے نزدیک کوئی حقیقت
نہیں ہے۔ جس ملک میں یہ ہوتا ہے کہ ایک معصوم خاتون جسکو بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائے تھے
اس کو جلا دیا جائے اور گلا گھونٹ دیا جائے اس لیے کہ دس ہزار روپے نہیں لائی، کیوں نہیں لائی ؟
اسکوٹر کی فرمائش کی اسکوٹر نہیں لائی، قومی آواز میں میں نے پڑھا اور جائزہ لیا گیا کہ ہر بارہ گھنٹے پر
میں ایک دولہن کو جلا دیا جاتا ہے، جس ملک میں ایسی دولت پرستی ہو کہ پیسے کے لیے سب کچھ
جا سکتا ہے اس ملک کو اگر کوئی چیز بچانے والی ہے تو یہ مدرسے ہیں۔ یاد رکھیں۔ ہمارے
ملک کے حکمراں سیاسی لیڈر، فلسفی اور مصنفین، کہ اگر یہ مدرسے نہ رہے اور کوئی اللہ سے
ڈرنے والا نہ رہا، انسانیت کی کوئی تعلیم دینے والا نہ رہا تو یہ ملک بچنے والا نہیں ہے، میں نے
دیکھا ہے جو اس طرح کے ملک تھے ان کا صرف تاریخ میں نام رہ گیا ہے۔ سمندروں میں ڈوب گئے
زلزلوں اور وباؤں کے شکار ہو گئے تو خود ایک دوسرے کو مار مار کر اور لڑ لڑ کر مر گئے ہیں۔ ابھی
نسل انسانی بچی ہوئی ہے۔ قیامت کیوں نہیں آ رہی ہے۔ اس لیے کہ ابھی اللہ کا نام زندہ ہے
اللہ کا نام لینے والے زندہ ہیں۔ انسان کو دیکھ کر خوش ہونے والے زندہ ہیں اور پیسہ کی حقیقت
جاننے والے زندہ ہیں۔ اس ملک کا اصل معبود پیسہ ہے یہاں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بچپن سے کس طرح
دولت کی پوجا اور تعلیم دی جاتی ہے، اگر عقل ہوتی، سمجھ ہوتی، اور انصاف ہوتا تو وہ ان مدرسوں
کو سینے سے لگاتے اور ان کی تحریروں کو چومتے، اور آنکھوں سے لگاتے کہ مدرسے جو کچھ ہم ان کی
خدمت کر سکیں کریں اور ہم چاہیں جس پر ہاتھ اٹھائیں کس پر شک کریں لیکن ہم ان مدرسوں کی طرف
سے بالکل مطمئن رہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ذہنی افلاس کا اور ہوائے نفس پرستی کا اور غلط سیاست
کا نتیجہ ہے۔ یہ مدرسے آنکھوں میں کھٹکنے لگے ہیں اور یہ کہا جانے لگا ہے کہ جب تک یہ مدرسے
کفر اسلام کا فرق، دینیت و لادینیت کا فرق، شرک کا فرق، اطاعت و معصیت کا فرق

باقی رہے گا، یہ ملک کے حق میں ایک بہت بڑی سازش اور ایک بہت بڑا منصوبہ ہے۔

ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں چاہے دل پر ہاتھ رکھ کر دینی پڑے، آپ کو ایک مرحلے سے مرحلہ سے اللہ نے گذار دیا۔ آپ کی تحریروں، تقریروں، دوروں سے اس ملک میں انسانیت کی فضا پیدا ہو، ماوں قدر دانی کی فضا پیدا ہو، ہندوستان کا نام دوسرے ملکوں میں اونچا ہو، کم سے کم اسلامی ملکوں میں یہاں سے لیکر ترقی اور مراکش تک چلے جائیے۔ ہم تو جاتے ہی رہتے ہیں وہاں ہندوستان کا تعارف علما کے نام سے انکی تصنیفات کے نام سے ہوتا ہے۔ یہاں حجۃ اللہ البالغہ لکھی گئی، یہاں وہ لغت لکھی گئی جس کی مثال نہیں ہے دوسری زبان اور دوسرے ملکوں میں۔ تیس جلدوں میں قاموس کی شرح لکھی، مرتضیٰ زبیدی بلگرامی نے ان کے لئے ایک انکشاف ہوتا ہے جب بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے تھے،

میرے بھائیو! آپ اس کو زیادہ اہمیت نہ دیں حادثہ کا اثر پڑتا ہے اور پڑے گا۔ اس کا کوئی مواخذہ نہیں لیکن آپ کسی طرح کی مایوسی کا شکار نہ ہوں، آپ کو ثابت کرنا ہے کہ یہ ملک ہماری ہی کوششوں سے ہے، اللہ کے نام اور اس کے رسول کے نام اور تعلیم ہی سے اس ملک کو بچایا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ اس کو کوئی ہلاکت سے بچا نہیں سکتی، ہمارے علما اور مدارس کے فضلا نے جنگ آزادی کی تحریک میں سب سے زیادہ قربانی دی اور سب سے زیادہ پیش پیش رہے۔ مالٹا اور انڈمان کی جیلوں میں کون رہا۔ کسی ہندو کا نام نہیں ملتا۔ میں تو ایک مورخ کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ علما صادق پور کو کالا پانی بھیجا گیا۔ ان کے مکانات ڈھائے گئے۔ میں خود شاہد ہوں، میں ایک بار پٹنہ گیا مولانا خلیل رحمۃ اللہ علیہ شیخ یحییٰ علی صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ سے ملانے لے گئے، میرا تعارف کرایا کہ سید صاحب کے خاندان کے ہیں تو وہ اس مجلس میں کہنے لگے کہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان کی طرف سے یہ خط آیا ہے کہ لوگوں نے اس تحریک میں جو نقصان اٹھایا اور ان کا جو کچھ تلف ہوا آپ انکی فہرست بھیجئے حکومت کی طرف سے اس کو ادا کیا جائیگا۔ انہوں نے جواب لکھا کہ جو کچھ اللہ کے لئے چھوڑا اللہ سے اس کو نہیں لیں گے۔

ہے کوئی ہندوستان میں جو یہ کہے، لاکھوں اور کروڑوں کی جائداد ضبط کرلی گئی، تجارت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، لاکھوں اور کروڑوں روپے ہوتے، انھوں نے کہا نہیں جو اللہ کے لیے کیا تھا اسکو نہیں لیں گے، بس میرے بھائیوں وہ آپکے اسلاف تھے۔ آپ ان کے اخلاف ہیں، ہم تشاء مہے کام نہیں لیتے کہ یہ مرحلے بار بار پیش آئیں۔ نسال اللہ العفو والعافیۃ اس واقعہ کو زیادہ اہمیت نہ دیں بلکہ کہیں کہ یہ سعادت بھی اللہ نے ہمیں عطا فرمائی یہ تاسف کی اور تاثر کی بات ہے۔ اللہ کے یہاں اس کا اجر ملے گا۔ آپ عزیمت کے لئے تیار رہیں۔ ہمارا دین رخصتوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس میں رخصتیں بھی ہیں اور عزائم بھی آپ کو عزیمت کے ساتھ دین کی نشر و اشاعت کرنے کی فکر کرنی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کی تعلیم بھی دینی ہے، حب وطن اور ملک کے ساتھ وفاداری کی بھی تعلیم دینی ہے۔ لیکن سب دینی اور اخلاقی روح کے ساتھ اللہ سے ثواب کی لالچ میں اور جو کچھ پیش آئے اس کو برداشت کرنے کے ساتھ اس پر ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم کو ہر قسم کے مکارہ سے محفوظ رکھے، اپنے رستے پر اور اپنے حق کے راستہ پر قائم رکھے، عزیمت کے راستہ پر اس دین اور تعلیم کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اللہ کے راستہ اور رسول کی اتباع، اور اولیاء عظام، شہدائے کرام پر رشک کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر طرح کے خوف سے گھبرانے سے بچائے۔ آمین۔

سلسلہ صفحہ ۲۲ (تعمیر حیات ۲۵/۱۱ ۱۹۸۴ء لکھنؤ سے ماخوذ)

احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں موصوف تقریباً ۲۵ درجن کتابوں کے مصنف ہیں اور اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈین آف فیکلٹی کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہر سال موصوف کی دعوت پر ہزاروں لوگ درگاہ شریف میں حاضری دیتے ہیں۔

۱۹۸۲ء میں جناب گیانی ذیل سنگھ نے درگاہ کی مجوزہ نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

عزیز حسن صابری
ایڈوکیٹ سہارنپوری

سید عثمان جہانگیر شاہ ولایت منگلوری

ایک نوجوان کا شمار بخارا کے امیر لوگوں میں ہوتا تھا عزت دولت شہرت اس کے پاس تھی ایک نیک بیوی اور بچوں سے اس کا گھر شاد آباد تھا وہ ہنسی خوشی اطمینان سے زندگی کے دن گذار رہا تھا اس کی دنیا جنت کا نمونہ تھی۔ ایک دن اس نے سنا کہ بخارا میں چشتیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ عثمان ہارونیؒ تشریف لائے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ ان بزرگ کی زیارت کر آئے وہ وہاں گیا تو ان بزرگ کی پہلی ہی نظر دل کی گہرائیوں میں اتر تی چلی گئی وہ بے تاب ہو گیا اس نے ان بزرگ کی پابوسی کی اور یہ عرض کیا کہ وہ بزرگ اس کو غلامی کا شرف عطا فرمائیں۔ بزرگ نے نوجوان کی عقیدت صادق دیکھی اور ان کی جوہر شناس نظروں نے اس کی اقلیم عشق میں جہانگیری ملاحظہ کی تو اس کو اپنا مرید کر کے سند خلافت بھی عطا فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ماسوی اللہ سے دل نہ لگانا تم دنیائے روحانیت میں جہانگیری کرو گے۔ وہ بزرگ بخارا سے چلے گئے مگر اس نوجوان کے دل میں عشق الٰہی کی آگ بھڑکا گئے۔ اب تو اس کے شب و روز ذکر و فکر میں گذرنے لگے۔

بالآخر وہ نوجوان مشاہدہ جمال حقیقی سے سرفراز ہوا۔ پھر ایک شب ان بزرگ کی زیارت نصیب ہوئی فرمایا کہ نوجوان اب بخارا چھوڑ کر دیار ہند کے شہر منگلور میں جاکر قیام کرو کہ

پیران چشت اہل بہشت نے منگلور کو تمہاری ولایت کا پایۂ تخت مقرر کر دیا اور وہاں کی خلق خدا کو اپنے فیوض و برکات سے راہ ہدایت پر گامزن کرو چنانچہ یہ نوجوان اپنے مرشد کا حکم پاکر ۱۲۹۱ء میں اپنی اہلیہ اور بچوں کو ساتھ لیکر شمالی ہندوستان کے شہر منگلور نزد ہردوار میں آکر قیام پذیر ہوا۔
وہ نوجوان حضرت سید عثمان جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ تھے جو شاہ ولایت، قصبہ منگلوری کے نام سے مشہور ہیں۔
مشہور ہے کہ سلاسل تصوف کے بزرگ اپنے اپنے مشن کی تبلیغ ارشاد و فیوض و برکات کی اشاعت کے لیے کسی بھی خاص علاقہ یا مقام کو روحانی ولایت قرار دے کر اپنے اپنے خلفا کو وہاں بھیجتے تھے۔ شہر منگلور جو اب ضلع ہردوار میں قصبہ منگلور کے نام سے مشہور ہے اپنے وقوع کے لحاظ سے اہم جگہ ہے۔
قصبہ منگلور میں آباد ہونے کے بعد حضرت سید عثمان جہانگیرؒ دن رات اللہ اللہ میں مشغول ہو گئے مثل مشہور ہے کہ عشق اور مشک چھپ کر نہیں رہ سکتے تھوڑے ہی دنوں میں چاروں طرف آپ کی بزرگی کی شہرت ہو گئی لوگ جوق در جوق آپ کے پاس آنے لگے اور طالبان راہ ہدایت رہنمائی فیوض و برکات کے جویا ہوئے چشتیہ مشن کے پیغام محبت خدمت خلق اور عوام کی حاجت روائی کے لیے آپ نے ایک خانقاہ اور اس سے متصل ایک مدرسہ تعمیر کرایا جہاں ایک طرف قال اللہ وقال رسولؐ کے ساتھ ساتھ ذکر الٰہی کی محفلیں جمتی تھیں تو دوسری خلقِ خدا کی خدمت اور حاجت روائی کے لیے روحانی دربار لگتا تھا اور قصبۂ منگلور عالم روحانیت میں سلسلہ چشتیہ کا ایک عظیم مرکز بن گیا اور سید عثمان اپنی ولایت روحانیت میں جہانگیری فرمانے لگے۔ آپ صاحب تصرف بزرگ رہے۔
آپ کی حیاتِ ظاہری ہی میں بے شمار کرامات اور تصرفات کی دور دور تک شہرت ہو گئی تھی۔ چنانچہ آج بھی حضرت مخدوم شاہ سید عثمان جہانگیر چشتی عرف

شاہ ولایت منگلوری کی کرامتیں مشہور ہیں۔

ایک بار ایک شخص مٹھائی لیے آپکے سامنے سے گزرا آپ نے پوچھا کہ تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے اس نے مٹھائی چھپانے کی غرض سے کہہ دیا کہ نمک ہے گھر جاکر جو اس نے اس ڈولیہ کو کھولا تو اس میں بجائے مٹھائی کے نمک برآمد ہوا تو بہت شرمندہ ہوا اور خدمت میں آکر معافی مانگی۔

ایک بار آپ جنگل میں سیر کے لئے گئے ہوئے تھے وہاں ایک چرواہا بکریاں لئے موجود تھا۔ آپ نے ایک بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس چرواہے سے کہا کہ اس بکری کا دودھ پلادو اس نے جواب دیا کہ یہ بکری تو ابھی بچھیا ہے جب جوان ہوکر بیاہے تو دودھ دے گی اس سے پہلے اس میں دودھ کہاں، آپ نے اس بکری کو ایک نظر دیکھا تو اس بکری کے تھنوں سے دودھ برآمد ہونے لگا اور چرواہے نے دودھ آپ کو پیش کیا۔ جو آپنے نوش فرمایا اور وہ دودھ اسقدر تھا کہ وہاں پر موجود دیگر لوگوں نے بھی اس کے دودھ سے سیراب ہوئے۔

ایک دن کی بات ہے کہ موضع بنیڑا نزد دیوبند کا رہنے والا امرسنگھ پونڈیر اس دور کا خوش حال اور نامور راجپوت سردار تھا مع اپنی بی بی جاجن دئی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے کوئی اولاد نہ ہوتی تھی دُنیا بھر کے علاج کر ڈالے سب جتن کئے گر دامن مراد اولاد کے گوہر سے خالی رہا۔ اس نے آپ کی کرامات کا شہرہ سنا میاں بیوی امید کا دامن پھیلائے نیازمندی سے آپ کی خدمت میں آئے اور مطلب کا اظہار کیا آپ نے فرمایا کہ اے سردار تمہارے اولا ہوگی تو ہم کو نذر میں کیا دو گے اس نے عرض کیا پہلا بیٹا آپ کی نذر کرے گا آپ نے دُعا فرمائی۔ وہ خوشی خوشی

۔ اپنے گھر کو گئے کچھ دنوں بعد ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام سلطان سنگھ
اور اسکے بعد تین بیٹے اور پیدا ہوئے۔ امر سنگھ اپنی خوشیوں میں آپ سے کئے ہوئے
کو بھول گیا تھا۔ دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک دن اچانک چاروں بیٹے بیمار
ہو گئے جیوں جیوں علاج کراتا تیوں تیوں وہ بچے اور بیمار ہوتے جاتے اور ان کی بیماری
اتنی شدت اختیار کی کہ ان بچوں کی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ امر سنگھ اسی فکر
حیران و پریشان تھا کہ اسے حضرت سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آیا وہ لرز گیا اور
کیا کہ بچوں کی صحت کا دار و مدار آپ کی دعا پر منحصر ہے فوراً آپ کی خدمت میں
اور اپنے بڑے بیٹے سلطان سنگھ کو آپ کی خدمت میں نذر پیش کیا۔ آپ نے
سلطان کو قبول فرما کر دعا کی چاروں بچے صحتیاب ہوگئے۔ سلطان سنگھ تو اسلام
تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا اور حضرت کا منھ بولا بیٹا بن گیا اور اسکی اولاد
سب مسلمان ہیں آج بھی راؤ طیب کے بہیڑے میں آباد ہے۔

آپ کے زمانہ میں دلی کا بادشاہ بلبن آپ کا بڑا معتقد تھا اور اس نے
آپ کے وصال کے بعد احاطہ شاہ ولایت صاحب میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی
مسجد شاہ ولایت کے نام سے موسوم ہے اس کے بعد بھی کئی بادشاہ اور نواب آپکے
در پر حاضری دینے آئے اس مسجد میں توسیع نواب رامپور نے کرائی تھی۔ شاہان وقت
آپ کی اولاد کو مدد معاش کے لئے جاگیر عطا فرمائی تھی جو سیاسی آفت ۱۸۵۷ء
پا ہونے پر ۱۸۷۱ء میں ضبط بحق سرکار ہو گئی تھی آپ کی اولاد کے پاس سلاطین کے
ئے ہوئے فرامین و اسناد موجود رہیں۔

ایک بار مہاراشٹر کا ایک راجہ اشنان کے لئے ہردوار جا رہا تھا۔ ابھی وہ قصبہ
منگلور تک ہی پہنچا تھا کہ شام ہونے لگی راجہ کو اسی دن سورج غروب ہونے سے پہلے
ہردوار گنگا میں اشنان کرنا ضروری تھا یہ ستر کی مسافت تھی۔ سے راجہ سخت پیچ و تاب

میں تھا کسی عالم میں تھا اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر وہ سورج ڈھلنے سے پہلے ہردوار میں پہنچ کر اشنان نہ کر پایا تو وہ وزیر کو قتل کرا دے گا۔ یہ بات سن کر وزیر بڑا پریشان ہوا ایسے میں کسی نے وزیر کو بتایا کہ قریب ہی ایک بزرگ سید عثمان جہانگیر کی خانقاہ ہے وہاں جاکر اپنا مطلب حاصل کیجئے۔ یہ وزیر راجہ کو ساتھ لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سارا قصہ کہہ سنایا حضرت نے فرمایا کہ راجہ صاحب آپ سورج غروب ہونے سے پہلے گنگا میں اشنان کرلیں گے۔ آپ نے راجہ کو اپنا کمبل اڑھایا اور راجہ سے کہا کہ وہ تصور میں ایک قدم چلے تو راجہ نے اپنے آپ کو ہردوار کی پوڑی پر موجود پایا۔ راجہ نے اشنان کیا تو پھر راجہ نے آپ کی آواز سنی کہ آنکھ بند کر کے تصور میں ایک قدم چلے تو راجہ نے اپنے آپ کو قصبہ منگلور میں موجود پایا۔ چنانچہ راجہ وزیر اور ان کے ہمراہی سب حضرت شاہ ولایت صاحب کے بڑے معتقد ہوئے راجہ نے واپس جاکر آپکے لیے نذرانہ کی ایک رقم مقرر کر دی۔ جو آپکے بعد آپکی اولاد کو کافی دور تک ملتی رہی۔

حضرت سید عثمان جہانگیر نے طویل عمر پائی اور ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی۔ اور اپنی ولایت قصبہ منگلور ہی میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار زیارت گاہ خواص و عام ہے بعطائی فیضان آج بھی بدستور جاری ہے۔

آپ کے تین بیٹے ہوئے جن میں بڑے بیٹے کی اولاد آپ کی درگاہ کی سجادہ نشین ہوتی چلی آئی ہے۔ آجکل آپکے سجادہ نشین حضرت پیرزادہ شاہ سید انوار الحسین انوار منگلوری تھے۔ جو علوم متداولہ کے عالم اور شاعر قادر الکلام تھے آپنے خاندانی روایات کے مطابق اپنے بیٹے جناب پروفیسر ڈاکٹر سید افتخار الحسن عنوان چشتی صاحب کو اپنی حیات ہی میں اپنا جانشین خلیفہ سجادہ نشین و متولی نامزد کر کے رسم دستار ادا کر دی تھی۔

پروفیسر عنوان چشتی اس وقت درگاہ حضرت شاہ ولایت کے سجادہ نشین و متولی ہیں۔ موصوف منفرد شاعر، ممتاز نقاد و محقق اور مقبول و موثر خطیب کی حیثیت سے

سلسلہ صفحہ ۱۷۸ پر

پروفیسر نثار احمد فاروقی
دہلی یونیورسٹی

اسلام ۲۱ ویں صدی میں

قسط سوم

سائنس اور ٹکنالوجی کے قدم اور آگے بڑھ چکے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ
دوسرے سیارے میں نوآبادیاتی نظام کی بنیاد پڑ جائے اسٹار وار کا بھی خطرہ ہے
معاشرتی سطح پر آزادی نسواں میں اضافہ ہوگا جو ملک آج پسماندہ ہیں ان
میں اباحتی معاشرہ PREMISSIVE سوسائٹی تیز رفتاری سے بڑھے گی۔
اخلاقیات صرف یونیورسٹی میں تحقیق کا ایک DISCIPLINE بن کر رہ جائے
جنسی سطح پر اباحتی سماج کو بے باپ کے بچے بھی زیادہ ملیں گے۔ ایڈز کی بیماری
اور پھیلے گی۔ طلاق کے واقعات میں اضافہ ہوگا کیمیاتی کھادوں ہتھیاروں اور دوسری
جراثیم کش دواؤں سے کینسر اور بلڈ پریشر بڑھے گا۔ اعصابی تناؤ بھی آج سے
زیادہ ہوگا ہمارے اس عہد کو بھی لوگ سنہرا زمانہ کہہ کر یاد کریں گے!

آنے والی صدی تناؤ تحیر اور CONFUSION کی صدی ہو گی۔ اس ماحول
میں اسلام بہت اہم رول ادا کر سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان خود کو اس رول کے لیے تیار کریں
اس نئی صدی میں اجتہاد کا دروازہ کھولے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اور اس کے لیے
علماء و فقہا کو اپنا رویہ حالات کی رعایت سے نرم اور لچکیلا بنانا ہوگا۔ اب تک
معاشرت دوسری تہذیبوں کے اثرات قبول کرتی رہی ہے نئی صدی میں دوسری معاشرتیں
مسلمانوں سے کچھ سیکھ سکتی ہیں۔ اس دور کے مسائل معاشرتی سطح پر

مادیت بنام روحانیت MATERIALISM SPIRITUALITY اور جنرل

یعنی اباحت بنام HUMAN ETHICS VS PERMISSIVENESS

انسانی اخلاقیات ہوں گے ۔ زندگی پر مادیت کی گرفت سخت ہو جانے پر شدید روحانی
پیاس پیدا ہوگی ۔ اس کا علاج اسلامی تصوف کے پاس موجود ہے۔ بشرطیکہ اسے صحیح
ڈھنگ سے اور اخلاص کے ساتھ استعمال کیا جائے ہمارے علماء خصوصاً اہلِ خانقاہ اگر
رواج زمانہ کے مطابق عصری مسائل سے آگاہ رہ کر یورپ، امریکہ مشرق بعید وغیرہ
میں خانوادگی عملی اور تبلیغ کے لیے نکلیں گے تو انہیں دوسروں کے مقابلہ میں غیر معمولی کامیابی
حاصل ہو سکتی ہے۔

برنارڈ شا کا یہ قول تو بہت مشہور ہے کہ مستقبل کے انسان کا مذہب اسلام ہے
دنیا کے سامنے اسلام کو جس ڈھنگ سے پیش کرنا چاہیے تھا وہ ہم نے نہیں کیا ورنہ
شاہ کے اس قول کی صداقت ظاہر ہونے لگتی۔ اسلام میں دنیا کے ہر انسان کو متاثر کرنے
کی صلاحیت موجود ہے

پروفیسر ولفرڈ کینٹول اسمتھ نے صحیح لکھا ہے۔

" Mnifestly Islam Could never have became
across The centuries one of The four or
five great world religion had it not like
that others, had The quality of having some
Thing profound and relevent and person
to all sorts, and conditions of Men of
every status, background, capacity
tempramment and aspiration

(Islam in Modern history p.9)

اسلام دنیا کو عظمت انسان کا تصور دیتا ہے اس سے EXPLOTATION رک سکتی ہے جنس کے معاملات میں ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دیتا ہے مگر جنس کو اخلاق اور شریعت دونوں کی شدید نگرانی میں رکھتا ہے۔ اس سے ایڈس جیسا خطرہ کم ہو سکتا ہے۔ مغربی فکر کائنات کو ایک خود کار آٹومیٹک مشین سمجھ لیا ہے۔ جو بے مقصد خود بخود چل رہی ہے۔ اس سے اس نفس کا انکار لازم آتا ہے جس پر مادے کی حقیقت منکشف ہو رہی ہے۔ اگر روح بے حقیقت ہے تو جو کچھ اس پر منکشف ہو رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام ہمیں عرفان نفس کی راہ دکھاتا ہے اور نفس کا رشتہ آفاق سے جوڑتا ہے۔ وہ روح کو امر رب کہتا ہے۔ اور مادے کے بارے میں کہتا ہے کہ اللہ نے کن (ہوجا) کہا اور یہ کائنات پیدا ہو گئی (فیکون) اس طرح مادہ بھی امر رب ہوا۔ مادہ اور روح دونوں کا درجہ برابر ہو گا پھر نفس یعنی (روح) کے لیے حدیث میں بتایا گیا ہے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس طرح نفس کی حقیقت اعلیٰ ہو گئی۔ نئی صدی میں تصوف کی اہمیت خصوصاً دوسری اقوام کے لیے بہت زیادہ ہو گئی اور اس کے ذریعہ سے انہیں اسلام کی آفاقی اقدار اور تعلیمات کی طرف لایا جا سکے گا۔

مستقبل سے مایوس تو نہیں ہونا چاہیے مگر کسی تیاری اور جدوجہد کے بغیر خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھنا حماقت ہے۔ سب سے پہلا نہایت اہم نہایت فوری کام یہ ہے کہ امت اپنے سارے فضول خرچ بند کر کے اپنا سارا بچا ہوا سرمایہ اور پوری کوشش تعلیم کے فروغ میں لگا دے۔ ورنہ اگلی صدی میں بھی اس کا حصہ کا دوسروں کا حلوہ ہی ہو گا۔ ہم تو خیر قید حیات و بند غم سے چھٹ چکے ہوں گے۔ اور شاید ایک حسرت و حرمان بھرا ہوا زخمی احساس اور کربیہ روح اپنے سامان سفر میں لے جائیں گے۔

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہو گا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

(بشکریہ دعوت دہلی)

پی آئی بی
گورنمنٹ آف انڈیا

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک سیاستداں، ادیب، صحافی، انشاء پرداز اور اسلامیات عالم

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں برصغیر کے منظر پر جو نمایاں شخصیتیں ابھریں ان میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ قدرت نے انہیں بیک وقت اتنے گوناگوں اوصاف سے نوازا تھا جو کسی ایک شخصیت میں کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک طرف وہ میدان سیاست کے شہسوار تھے تو دوسری طرف ادیب، انشاء پرداز، عالم اسلامیات اور مفسر قرآن تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مایہ ناز صحافی بھی تھے۔ اس طرح کی جامع شخصیتیں صدیوں میں جنم لیتی رہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا آزاد کی وفات پر پارلیمنٹ میں ان الفاظ میں ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی تھی۔

"مجھے ان کی وہ خوبیاں گنانے کی ضرورت نہیں جنہیں ہم سب جانتے ہیں۔ ان کا علم و فضل، عمیق معلومات اور عظیم خطابت۔ وہ ایک بہت بڑے ادیب تھے اور کافی پہلوؤں سے وہ بڑے تھے۔ لیکن اور بھی دوسرے علماء و فضلاء ہیں۔ دوسرے ادیب اور خطیب موجود ہیں۔ مولانا آزاد میں ماضی کی عظمت اور حال کی عظمت یکجا ہو گئی تھی۔ مجھے ان کی شخصیت ہمیشہ ایسی شخصیتوں کی یاد دلاتی تھی جن کے تئیں میں نے تاریخ میں پڑھا تھا۔ مثلاً یورپ کی تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو نشاۃ ثانیہ کی عظیم شخصیتیں سامنے آتی ہیں۔

یا اس کے کچھ بعد کے دور میں فرانسیسی انقلاب سے کچھ پہلے کی " جامع مسلم " شخصیتیں۔
ذہانت اور عمل کے میدان میں عظیم شخصیتیں "۔

مولانا آزاد میں قدیم دور کی عظیم شخصیتوں میں پائی جانے والی بردباری، رواداری اور صلح و برداشت کی خوبیاں تھیں۔ وہ اس مشترکہ ثقافت کے ایک منفرد نمائندہ تھے جو ہندوستان میں رفتہ رفتہ پروان چڑھی۔ وہ خاص طور پر اس ہندوستانی ثقافت کی نمائندگی کرتے تھے جو مغربی ایشیا، خصوصاً ایران اور عرب کی اقوام سے متاثر ہوئی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں جنم لیا تھا۔ انکی والدہ ایک عرب خاتون تھیں۔ والد ایک سرکردہ ہندوستانی عالم اور مذہبی رہنما مولانا خیرالدین تھے۔ اس زمانے میں ان کا قیام مکہ معظمہ میں تھا، بعد میں وہ اہل خاندان کے ہمراہ کلکتہ تشریف لے آئے۔ مولانا آزاد کے ایام طفلی کلکتہ میں گزرے۔ عربی انکی مادری زبان تھی۔ ابتدائی تعلیم اس مقدس شہر میں انجام پائی۔ کلکتہ میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ابتدائی عربی فارسی نصاب اور درسیات خطاطی کی تکمیل مختلف علماء سے کی۔ اپنے والد سے بھی مختلف کتابوں کے اسباق پڑھے۔ عربی و فارسی پر انہیں جو عبور تھا اس کی مثال اس دور کے علماء میں کم ہی دیکھنے میں آئی۔ مولانا آزاد نے انگریزی اور فرانسیسی زبان کسی اسکول میں حاصل نہیں کی بلکہ اپنی کوششوں سے سیکھی۔ فرانسیسی زبان جیسا کہ قیاس کہتا ہے مولانا آزاد نے عربی کی وساطت سے سیکھی ہو گی۔ چونکہ مولانا کی سیریز ہر طرح کی جدید عصری مطبوعات ہوتی تھیں اور اس زمانے تک بیشتر فرانسیسی کلاسیکی ادب، اور علمی کتابوں کے تراجم عربی میں ہو چکے تھے مولانا نے ان ہی تراجم کے ذریعے اصل فرانسیسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مسٹر ہمایوں کبیر وغیرہ نے لکھا ہے۔

وہ آپ کی لائبریری انگریزی اور فرانسیسی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ آپ نے انگریزی شعراء کا مطالعہ کیا۔ مثلاً شیکسپیئر، ورڈس ورتھ اور شیلی وغیرہ۔ آپ کی لائبریری میں بڑے بڑے مفکرین کی تصانیف موجود تھیں جن میں گوئٹے، اسپنوزا، روسو

مارکس اور ہیوگلک شامل ہیں۔"

مولانا آزاد نے ہماری قومی زندگی کے متعدد شعبوں پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ایک طرف سیاسیات میں ہندوستان کے صف اول کے قائدین میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ دوسری طرف شعرو ادب، صحافت، خطابت اور تفسیر قرآن میں ان کے علمی کارنامے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ملک پر برطانوی راج مسلط ہو چکا، مولانا نے جب آنکھیں کھولیں تو قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا۔ شب و روز قوم کی حالت دیکھ کر رنجیدہ خاطر رہتے تھے۔ آغاز شباب میں انہوں نے ہنگامی انقلاب پسندوں کی ایک تنظیم میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا لیکن بہت ہی جلد انکی رائے بدل گئی اور آزادی کے حصول کے لئے پرامن لیکن پرجوش جدوجہد کی راہ اپنائی اور صحافت کو اس راہ میں ایک موثر حربے کے طور پر اپنایا۔ اپنی ایک جماعت حزب اللہ (خدائی فوج) کے نام سے تشکیل دی جسکے ارکان ملک کو فرنگی تسلط سے آزاد کرانے کا حلف لیتے تھے۔ وہ بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کی ریشمی رومال کی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔

۱۹۰۸ء میں مولانا آزاد کو مصر اور کئی عرب ممالک کے دورہ کا اتفاق ہوا۔ دورۂ مصر کے نتیجے میں مولانا آزاد کو جو سیاسی، علمی اور صحافتی تجربات ہوئے وہ بعد میں انکے کام آئے۔ ادھر ۱۹۱۲ء میں جب ایک طرف اطالیہ (اٹلی) نے ٹرپولی (موجودہ لیبیا) میں اور دوسری طرف یورپی اتحادیوں نے عثمانی سلطنت کے بلقانی علاقوں پر حملہ کیا تو سارے عالم اسلام میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی، اسی بے چینی سے تحریک خلافت نے جنم لیا۔

صحافت میں مولانا آزاد کی انقلاب آفریں تحریروں کا آغاز ہفت روزہ

الہلال سے ہوتا ہے جس کا اجراء جولائی ۱۹۱۲ء میں کلکتہ میں عمل میں آیا اُس وقت ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کسی ایک یا دوسری یورو پی طاقت کے غلام تھے، اس لئے ہندوستان میں مولانا آزاد اور تحریک خلافت کے روح رواں علی برادران اور مصر و دیگر ممالک اسلامیہ میں علامہ جمال الدین افغانی و مفتی محمد عبدہ خلافت تحریک کو سامراج کے مقابلہ میں ایک بڑا ملک تصور کرتے تھے، الہلال نے قوم خصوصاً مسلمانوں کو بیدار کرنے اور انہیں سامراج کی چالوں سے آگاہ کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔

الہلال اگرچہ ہفت روزہ تھا لیکن اسے ایک مکمل اخبار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ادبیات، سائنس، مذہب، سیاست اور عمرانیات پر اس کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کا ہاتھ زمانے کی نبض پر ہے۔ الہلال کی انقلابی تحریروں کو برطانیہ کیسے برداشت کرسکتا تھا، چنانچہ جلد ہی ضمانت طلب کرلی گئی اور دوسری ضمانت اتنی بھاری طلب کی گئی کہ الہلال کے لیے نا قابل برداشت تھی۔ دو برس ہی میں حکومت کے دباؤ کے باعث اگرچہ الہلال بند ہوگیا لیکن اتنی مختصر مدت میں وہ اپنا کام کر گیا تھا الہلال کے متعلق شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی جیسے علما نے لکھا تھا۔

"ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے جو ہمیں الہلال نے یاد دلایا۔"

الہلال کی انقلابی روح کا اندازہ اس اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

"ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے لیکن مسلمانوں کے لیے ایک فرض دینی ہے اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنوں میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت، انسانی جبر و استبداد اور غلامی کو توڑنے کے لئے کی جائے۔"

(الہلال ۸ دسمبر ۱۹۱۲ء)

بلاشبہ الہلال اُردو صحافت کا ایک سنگ میل تھا - دراصل اُردو میں جا
صحافت کا آغاز الہلال ہی سے ہوتا ہے۔

مولانا آزاد نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو البلاغ جاری کیا - یہ اخبار مارچ
تک جاری رہا - ۲۰ رجون ۱۹۲۷ء کو پھر الہلال کا اجراء عمل میں آیا اور اس برس
۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو یہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی زندگی کا سب سے مضبوط ستون ہند
مسلم اتحاد تھا، وہ دل کی گہرائیوں سے اس پر یقین رکھتے تھے کہ یہ ملک اس وقت
تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک ہندو مسلم اور ہندوستان کے تمام فرقے متحد نہ ہوں۔
یہی وجہ ہے کہ جب ملک دو حصوں میں بٹ گیا تو مولانا آزاد کو انتہائی صدمہ پہنچا
انہوں نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز ہندو مسلم اتحاد سے کیا تھا۔ انکی سیاسی بصیرت
اس صدی کے آغاز ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ برطانوی سامراج سے ملک کو آزاد کرا
کی جدوجہد اور خود ملک کی فلاح و بہبود تمام تر ہندو مسلم اتحاد پر منحصر ہے۔
انہوں نے کانگریس کے اجلاس رام گڑھ ۱۹۴۰ء کی صدارت کرتے ہوئے اس
وضاحت کی تھی کہ وطنیت اور اسلامیت کے درمیان کس قسم کا تضاد نہیں ہے
مولانا آزاد نے اعلان کیا۔

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گو
کو اپنی تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے - ہماری زبانیں ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہمارا
معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج اور ہماری آزاد زندگی
بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ
لگ سکی ہو - یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم ا
چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہیے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع

مولانا اسلامی علوم میں ایک جید فاضل تھے۔ الہلال کے بعض گراں قدر مضامین سے اسلامیات پر ان کے عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلامیات میں ان کا کارنامہ تفسیر ترجمان القرآن ہے، جو اگرچہ ان کی مصروف ترین زندگی کے باعث نامکمل رہی۔ اس تفسیر سے مولانا کے علمی مقام کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ سورۂ فاتحہ میں خدا کے تصور پر ان کی معرکتہ الآرا بحث ایسی ہے کہ ہر طالب علم کو اپنی جانب کھینچے گی۔ تفسیر میں انھوں نے نثر کا جو اسلوب اپنایا وہ عام فہم اور اثر انگیز ہے۔ سرکردہ مصنف مالک رام نے ترجمان القرآن میں اسلوب کے متعلق لکھا ہے۔

"جو لطف زبان و بیان اور صحت و برجستگی ترجمان القرآن میں ملی وہ کسی پیشرو یا پیرو کے ہاں دیکھنے میں نہ آئی۔"

ادبی موضوع پر مولانا آزاد نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ انکی خود نوشت سوانح حیات تذکرہ اور الہلال کے کچھ مضامین ادب کے دائرے میں آتے ہیں۔ البتہ غبار خاطر کو مکمل طور پر ادبی شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو دراصل جیل میں اپنے ایک نزدیکی دوست مولانا حبیب الرحمان خاں رئیس بیگم پور کے نام لکھے گئے خطوط تھے جو کہ حوالہ "ڈاک نہیں کئے گئے" تھے۔ غبار خاطر کی نثر ایک مقامی نثر ہے۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں۔

"جس طرح غالب نے اپنی نظم میں، اس طرح مولانا نے اپنی نثر میں کسی دوسرے کے اسلوب نگارش کی تقلید کو گناہ سمجھا ہے۔ یہ کوئی مصنوعی انداز نہیں ہے بلکہ ایک قدرتی انفرادیت ہے۔ اس میں نہ کوئی دوسرا ادیب مولانا کا شریک ہو سکتا ہے، اور نہ ان کی انفرادیت اور ان کے آرٹ کو اپنا کہہ سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد سے فروری ۱۹۵۸ء میں اپنی وفات تک مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم رہے۔ کابینہ کے تمام اہم سیاسی فیصلوں میں ان کا مشورہ شامل ہوتا تھا۔

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
ہیڈ شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

اردو ادب میں اکبرالہ آبادی کا مقام

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے افق پر تبدیلیاں آئیں ان کا گہرا اثر یہاں کی سماجی
اور معاشرتی زندگی پر بھی پڑا۔ ایک گروہ نے یہ سوچنا شروع کیا کہ نئی تہذیب کو اپنائے
بغیر اور مغربی علوم کو حاصل کیے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ صرف مذہبی علم
کے حصول سے ہی ہندوستانیوں کی فلاح ممکن ہے۔ اور ایک گروہ ایسا تھا جو ہندوستانیوں کی
تہذیبی شناخت کو اہم جانتا تھا۔

یہ گروہ تعلیم کا مخالف نہ تھا لیکن اقدار کی شکست اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔
لسان العصر، خان بہادر سید اکبر حسین اکبرالہ آبادی اسی گروہ کے علم بردار تھے۔ جن کی شناخت
ظریفانہ اور طنزیہ شاعری سے ہے۔ اودھ پنچ اردو کا وہ اہم رسالہ ہے جس نے لندن سے نکلنے
والے پنچ کے خطوط پر طنز و مزاح کے پیرائے کو اپنایا۔ اور اردو کو ایسا اسلوب دیا جس میں
طنز، شوخی اور مزاح کے ذریعے ہندوستانیوں کی تہذیبی اقدار کو لوٹنے اور بکھرنے سے
روکنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اکبرالہ آبادی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اور وہ پنچ کے ایک اہم
قلم کار کی حیثیت سے انہوں نے اس دور کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ ان کی فطری شوخی،
ظرافت اور قلم کی کاٹ۔ جب شعر کی زبان میں سماج، تعلیم، سیاست، معاشرت اور بد

پر چوٹ کی تو فکری سطح پر تیزی سے فروغ پاتی ہوئی بے راہ روی کو ایک رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔

اکبر الٰہ آبادی سرکاری ملازم بھی رہے اور شاید اسی لیے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ راست لب و لہجہ میں انگریزی استبداد کے خلاف آواز بلند کرتے لیکن شعری زبان کی وسعت اور ظرافت آمیز اظہار نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لباس

اور اس طرح اکبر نے اپنے موقف کی وضاحت کر دی ہے کہ ظرافت کے پیچھے جو معنی چھپے ہوئے ہیں ان کی تلاش کرنے پر ہی وہ مقصود ملے گا۔ اور ان کی شاعری میں چھپے ہوئے قومی شعور کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ انگریزوں کی استعماریت اور ہندوستانی تہذیب پر ان کے تسلط کے ہمیشہ شاکی رہے۔ سرکاری ملازمت نے ان کے اظہار کی راہ میں روڑے ضرور اٹکائے لیکن وہ دل سے قومی تحریک اور آزادیٔ وطن کے قائل تھے۔ گاندھی جی کے لئے وہ کہتے ہیں۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
پاتے اسے بھی اک دن گاندھی کی گوپیوں میں

مغربی تعلیم کے سیلاب سے اکبر بیزار تھے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ تعلیم کے خلاف تھے۔ خود اپنے لڑکے عشرت حسین کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجا تھا۔ اور جب انہیں محسوس ہوا کہ لندن کی فضا نے عشرت کو اسیر کر لیا ہے تو وہ مشہور نظم لکھی کہ

کھا کے لندن کی ہوا گھر کا مزہ بھول گئے

ان کے نزدیک وطن اور وطن کی تہذیبی اقدار کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ مغربی تعلیم کے اس خطرناک پہلو سے قوم کو بچانا چاہتے تھے جس سے ہندوستانیوں کی شناخت ختم ہو سکتی تھی۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

٭

کل کتابیں باعث ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

٭

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے
واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے
اے فلک انگلش و جرمن ہو مبارک تجھ کو
ہم کو تو اردو و ہندی میں بسر کرنا ہے

٭

علم مغرب پڑھ کے ہوں گی ایسی خود سر بی بیاں
بی بیاں شوہر بنیں گی اور شوہر بی بیاں

٭

اکبر نے تقریباً پچپن برس تک اقلیم شعر پر حکمرانی کی۔ لیکن ابتدائی شاعری میں وہ قدیم روش نمایاں طور پر نظر آتی ہے جو شعرائے لکھنؤ کی نازک خیالیوں کی آوردہ تھی۔

الفت گیسو نے آخر دی مرے دل کو شکست
ہائے کیا انمول شیشہ تھا مگر بال آگیا

انہوں نے غزل کی قدیم روایت کی پاسداری کی ہیں۔ جو اشعار کہے ہیں ان میں ان ہی مضامین کی جھلک نظر آتی ہے۔ جو اس دور کی شاعری کا خاصہ رہی ہے۔

پھر گئی ... دی میں طبیعت کیسی
یہ وفا کیسی تھی صاحب یہ مروت کیسی

آپ بوسہ جو نہیں دیتے تو میں دل کیوں دوں
ایسی باتوں میں مری جان مروت کیسی

یاد قامت سے جو اس دن مل گئی فرصت ہمیں
دیکھ لیں گے دور سے ہم بھی تماشا حشر کا

لیکن ان اشعار کی وجہ سے نہیں غزل میں اکبر نے جو گل کھلائے ان سے فکری سطح پر بھی کہیں کہیں مقام جاں معطر ہوتے ہیں - اور یہ فیض غزل کی ہمہ جہت کیفیت کا ہے

دار فنا سے نہ چلے کچھ تو غم نہیں
فرمائیے تو لائے تھے ملک بقا سے کیا

مدد اے رہنمائے گمرہاں اس دشت غربت میں
مسافر ہوں پریشاں حال ہوں گم کردہ منزل ہوں

توقع رہتی ہے ہر دم کہ دم لینے کی مہلت ہے
معاذ اللہ اپنی موت سے کس درجہ غافل ہوں

میں دیتا جاؤں یاران وطن کو کیا پتا اپنا
خدا جانے مجھے لے جائے وحشت کس بیاباں میں

خانۂ دل کو کیا عشق بتاں نے برباد
کیا سے کیا ہو گئی اللہ کے گھر کی صورت

اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز
مل گئے صاحب سلامت ہو گئی

اور یہ مشہور شعر ان کا ہی ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لیکن اکبر کی عظمت تو اس شاعری سے ہے جس میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی غالب عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اس دور کی فیشن پرستی پر وار کرتے ہیں تو کہتا ہیں۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

نئی محفل کی تنگنائی تو گویا طوق گردن ہے
وہی بت خانہ بہتر تھا وہی زنار اچھی تھی

ان کا خیال میں تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ملازمت حاصل کر لی جائے اور بس

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

وہ تجارت کو طرۂ افتخار مانتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود ملازم ہے لیکن ملازمت سے نالاں نظر آتے ہیں
انہوں نے مغربی اقوام کی سربلندی کا سبب تجارت بتایا ہے

چاتی ہیں قومیں تجارت سے عروج
بس یہی ان کے لئے معراج ہے
ہے تجارت واقعی اک سلطنت
ناز یورپ کو اسی کا آج ہے

اکبر کی ابتدائی شاعری میں جو نازک خیالی نظر آتی ہے اسکا پرتو ان کی ظریفانہ شاعری میں نظر نہیں آتا۔ اپنے مخصوص ظریفانہ رنگ میں شعر کہتے ہوئے اکبر نے نازک خیالی کے لبادے کو اتار پھینکا لیکن رعایت لفظی سے فائدہ اٹھانے کی خو نہ گئی۔

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہوگیا
سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہوگیا
زلف نے پرتو دیں شام کو رہنے نہ دیا
آخر اس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا

کہیں وہ مزاح اور طنز کی حدود کو پار کر کے پھکڑ پن میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس پھکڑ پن میں بھی اکبر مخصوص اصلاحی انداز اپنی پوری آن بان سے نظر آتا ہے یہ بظاہر ابتذال ہے مگر معنوی اعتبار سے ایک بلند مفہوم رکھتا ہے اور ہنسی کے ساتھ کسک بھی پیدا کرتا ہے۔

اکبر نے اُردو شاعری کو نئی لفظیات سے روشناس کرایا اور دوسری زبانوں کے الفاظ خصوصاً انگریزی کے الفاظ استعمال کر کے مزاح کی ایسی کیفیت پیدا کی جو اہل نظر کے لیے تازیانے کا کام رکھتی ہے۔

شیخ آنر کے لیے آتے ہیں میدان کے بیچ
ووٹ ہاتھوں میں ہے اسپیچ قلمدان کے بیچ
کیا کہوں اسکو میں بدبختی نیشن کے سوا
اسکو آتا نہیں اب کچھ امیٹیشن کے سوا

ان کے قلم کے نشتر سے کوئی نہ بچ سکا۔ سیاسی جماعتیں، خلافی ادارے، ان کے سربراہ مذہبی علما سبھی کو اکبر نے نشانہ بنایا۔ ایسے لیڈر جنہوں نے اپنے فائدے کے لیے قوم کا نعرہ لگایا ان کے لیے اکبر کے شعر ایک تازیانے کا کام کرتے ہیں۔

گردن رفتار مرکی ہر اک سمت تن گئی
بگڑی ہو قوم و ملک کی ان کی تو بن گئی

تمام قوم ایڈیٹر بنی ہے یا لیڈر
سبب یہ ہے کہ کوئی اور دلگی نہ رہی

کیا غذر قوم کو ہے ترقی کی بات میں ✽ رغبت کے ساتھ خود ہے وہ لیڈر کے ہات میں
زندگی کو ضرور ہے اک شغل ✽ خیر بالفعل لیڈری ہی سہی

مسودس میں میں داخل نہیں، ہوں قوم کا خادم
چندوں کی فقط آس ہے تنخواہ کہاں ہے

جہاں تک نئی روشنی، مغربی علوم کے حصول، سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کا تعلق ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ وہ آنے والے دنوں کی آہٹ کو محسوس نہیں کرسکے۔ قدامت پرستی نے انہیں نئی روشنی کے خلاف کہنے پر اکسایا تھا۔ مسلمان قوم کے عظیم کارنامے ان کے آگے پیچ تھے۔ حصول علم کے بدلتے ہوئے رجحان پر نشانہ بازی کرتے ہوئے انہیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ زمانے کی کروٹیں کیا گل کھلانے والی ہیں۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اکبر نے اپنے اشعار میں چھپے ہوئے تیر و نشتر سے ان ناسوروں کو کریدا تھا۔ جو آنے والے زمانے کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوسکتے تھے۔ انہوں نے اپنے لفظوں کی کمندوں سے بے راہروی کی طرف بڑھتی ہوئی قوم کو روک کر اپنی تہذیبی شناخت باقی رکھنے پر زور دیا تھا۔ انہوں نے توانائی کی راہ اختیار کرنے کی طرف توجہ ملائی تھی۔ ایک طرف تو اکبر نے اردو شاعری میں طنز و مزاح کے سلسلے کے اسلوب کو فروغ دے کر زندگی کی تنقید کا اہم فریضہ انجام دیا تھا تو دوسری طرف آنے والے زمانے کے طنز و مزاح پر مشتمل [illegible]

رشید الدین
ایم۔اے (عثمانیہ)

احمد سلطان مرحوم

۹ نومبر ۱۹۹۴ء کو میں اپنے دفتر کے روم میں بیٹھا تھا کہ چار بجے شام میرے ایک دوست شفیق اور نگ زیب آئے اور باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ آج صبح احمد سلطان صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ گو وہ دل کے مریض ضرور تھے لیکن میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اس قدر جلد اور اچانک ہم سے جدا ہو جائیں گے۔

وہ آل انڈیا اردو ریسرچ کونسل کے نائب صدر تھے اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ وہ میرے ساتھ زندہ دلان حیدرآباد میں بھی تھے اور مجھ سے سینئر تھے۔ وہاں بھی وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے وہ مزاحیہ شاعری کرتے تھے اور زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ کل ہند مشاعروں میں پابندی سے اپنا کلام سناتے تھے چنانچہ "شگوفہ" کے تازہ شمارہ میں جو جشن حیدرآباد کی مناسبت سے حیدرآباد نمبر کے طور پر نکالا گیا ہے ان کی وہ مزاحیہ نظم شامل ہے جو انھوں نے جشن حیدرآباد کے مزاحیہ مشاعرہ میں سنائی تھی۔

ان کا ریسرچ کا موضوع بھی بہت اچھا تھا یعنی فلمی گیتوں اور مکالموں کے ذریعہ اردو کا فروغ۔ یہ موضوع انھوں نے اس لئے لیا تھا کہ فلموں سے انھیں غیر معمولی

سپی تھی۔ جب سے بولتی فلموں کا دور شروع ہوا اس وقت سے لے کر آج تک وہ
ں کے بارے میں جانتے تھے اور خصوصاً پرانی فلموں کے تو وہ ماہر تھے۔ انہیں ایسی فلموں کے
ے میں بھی بھرپور معلومات تھی جو اس وقت بن تھی جب کہ آپ ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

احمد سلطان کا اُردو زبان و ادب کا ذوق بھی بہت اچھا تھا اور وہ شاعری
مسلسل نثر بھی لکھتے تھے۔ خود ہماری کونسل کے کئی اجلاسوں میں وہ اپنے مضامین
سنا چکے ہیں۔ اس طرح وہ شاعر اور ادیب دونوں تھے۔ اور مختلف رسالوں اور
خباروں میں ان کی بے شمار تحریریں پھیلی پڑی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں
یکجا کر کے شائع کیا جائے۔ کیونکہ بد قسمتی سے ان کی نظم یا نثر میں مطبوعہ شکل میں کوئی کتاب
نہیں ہے۔

احمد سلطان بے حد مخلص اور ملنسار آدمی تھے ان کی طبیعت میں سنجیدگی،
خاکساری اور بڑاپن بہت زیادہ تھا۔ اپنے خاندان میں بھی وہ سب سے بڑے تھے۔ ان
دو چھوٹے بھائی عابد سلطان (جو شاہین تخلص کرتے تھے) اور اختر سلطان کا بھی
ے کے عارضہ کی وجہ سے ہی ہوا۔ اب ان کے صرف ایک بھائی سکندر سلطان بقید حیات ہیں
ور بھوپال میں رہتے ہیں۔

وہ بڑے محنتی آدمی تھے ان کی ساری زندگی جدوجہد سے بھری ہے۔ وہ سنٹرل ریسرچ
یالوجی ٹریننگ میں لائبریرین تھے۔ اسی دوران وہ پانچ سال افغانستان میں بھی رہے اور
ہاں کابل یونیورسٹی کی لائبریری کو باقاعدہ بنایا اور اسے نئے سرے سے ترتیب دے کر
ہاں جدید طریقے رائج کئے۔ بعد میں واپس آکر پھر انہوں نے لیبارٹری میں اپنی ملازمت جاری
ی اور وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

سبکدوشی کے بعد بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے بلکہ اُردو کے اکثر اخباروں میں مختلف
یثیتوں سے کام کیا۔ کبھی کالم لکھے تو کبھی ترجمہ کیا، کبھی فیچر لکھے تو کبھی فلمی رائٹ اَپ۔

آخر میں وہ انوارالعلوم کالج میں انچارج لائبریرین ہو گئے تھے اور اسی ملازمت کے دوران ان کا انتقال ہوا۔

احمد سلطان کو اپنی فیملی سے جن میں پہلے ان کے ماں باپ اور بھائی بہن اور بعد میں ان کی بیوی اور بچے شامل تھے بے حد محبت تھی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے چھوٹے بھائیوں بلکہ اپنے بچوں کو بھی اچھی تعلیم دلوائی۔ ان کے چھوٹے بھائی عابد سلطان شاہین مرحوم کے بارے میں وہ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔ اور مجھ سے کہتے تھے کہ عابد کو ریڈیو اور ٹی وی کے شوق نے کہیں کا نہیں رکھا۔ وہ ان ہی دو محکموں میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں جب کہ وہاں مستقل تقررات ملنے آسان نہیں۔

ان کے ایک دوست نے انتقال کے بعد مجھے بتایا کہ معلوم نہیں مرنے سے کچھ دن قبل ان کے ذہن میں کس طرح خیال آگیا تھا کہ اب وہ زیادہ دن نہیں جئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ان سے ذکر کیا کہ ان کے پاس کچھ رقم ہے جسے وہ بنک میں رکھنا چاہتے ہیں اور بڑے لڑکے کے ساتھ جائنٹ اکاؤنٹ کھولنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ

"آپ کا یہ خیال تو بہت اچھا ہے۔" چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اب ان کے لڑکے کو بنک سے ان کی رقم نکالنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

انہوں نے اپنی ریسرچ کا فرصت سے زیادہ مواد تیار کر لیا تھا اب صرف اسے ترتیب سے لکھنا باقی تھا۔ لیکن ایک تو ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اور دوسرے ایک نوکری بھی انہوں نے اپنے گلے باندھ لی تھی اس لئے انہیں وقت بہت کم ملتا تھا۔ یہی مصروفیات ان کے ریسرچ کے کام میں حائل ہوئیں ورنہ وہ کبھی کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لیتے۔ ویسے چنداں انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد نوکری کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ وہ معاشی طور پر آسودہ حال تھے۔

عجیب اتفاق ہے کہ مرنے سے دس بارہ دن قبل میری ان سے مسلسل تین دن ملاقاتیں

ہوتی رہیں" میرے تیسرے لڑکے وجیہہ الدین کی شادی تھی۔ ۲۶/ اکتوبر کو میں نے انوار العلوم کالج لائبریری میں جاکر انہیں رقعہ دیا۔ بہت خوش ہوئے۔ مجھے مبارکباد دی اور کہا کہ میں ضرور آؤں گا" دوسرے دن شادی تھی۔ وعدہ کے مطابق وہ زندہ دلان حیدرآباد کے گروپ کے ساتھ آئے اور مجھے مبارکباد دے کر اور آئسکریم کھا کر چلے گئے۔ تیسرے دن یعنی ۲۸/ اکتوبر کو ولیمہ تھا اس میں بھی انہوں نے شرکت کی اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔

کسے معلوم تھا کہ یہ ملاقات ان سے میری آخری ملاقات ہوگی۔ ۸/ نومبر کی شام تک وہ اچھے خاصے تھے رات میں ۸ بجے ان کی طبیعت خراب ہوتی اور سینہ میں درد ہونے لگا جس پر انہیں شہر کے ایک خانگی نرسنگ ہوم میگا سٹی میں شریک کر دیا گیا۔ دوسرے دن صبح ۷ بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ تدفین اسی دن مسجد عالمگیر میں بعد عصر عمل میں آئی۔ ان کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی مسقط میں تھے وہ بھی نہ آسکے۔ ان کے لئے میت کو شام تک روکا گیا لیکن انہوں نے آنے سے مجبوری ظاہر کردی۔

احمد سلطان عرب شہزاد تھے اور ان میں وہی مہمان نوازی اور خلوص شامل تھا جو اہل عرب کا خاصہ ہوتا ہے۔ ان کے آباو اجداد آصف جاہی دور میں حیدرآباد آئے اور پھر یہیں کے ہو گئے۔ اب بھی یقین نہیں آتا کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے بلکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب بھی کونسل کے اجلاس میں وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھے ہیں اور یہ مضمون سن رہے ہیں اور کچھ دیر میں اس پر تبصرہ کا آغاز کریں گے۔

(۱۲/ نومبر ۹۴ء کو آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرز کونسل کے اجلاس میں پڑھا گیا)

ایم بھائی آئی۔ پٹیل
وزیر مملکت، دیہی ترقیات

صفائی ستھرائی
صحت مند زندگی کی ضامن

میرا مثالی گاؤں ابھی تک میرے تخیل میں ہے۔ بہرحال، ہر ایک بنی نوع انسان خود اپنے تخیلات کی دنیا میں رہتا ہے۔ میرے خوابوں کے اس گاؤں میں، گاؤں کے لوگ ناعلم نہیں ہوں گے، انہیں ہر بات کی معلومات ہوگی۔ وہ جانوروں کی مانند گندگی اور تاریکی میں زندگی بسر نہیں کریں گے۔ خواتین اور مرد بے فکری اور آزادی سے زندگی بسر کریں گے، جو پوری دنیا کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس گاؤں میں طاعون، کالرا اور چیچک کا نام و نشان تک نہیں ہوگا۔

تاریخی اور سماجی پس منظر :

صفائی ستھرائی کا نتیجہ لازمی طور سے عوام کی اچھی صحت اور ان کے بہتر معیار زندگی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ۲۰۰۰ء تک "سب کے لیے صحت" کا نصب العین حاصل کرنے کے سلسلے میں ملک کے عزم مصمم کے لیے یہ ایک لازمی جز ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گذشتہ برسوں میں صفائی ستھرائی کے معاملے کو ہمارے ملک میں، خاص طور سے دیہی علاقوں میں عام تناظر میں کم ترجیح دی گئی ہے۔

آزادی سے پہلے کے دنوں میں، گاؤں میں صفائی ستھرائی کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے بہت ہی کم کوششیں کی گئیں۔ سالوں میں کہ اس صدی کے وسط تک، دیہی علاقوں میں کھلی جگہیں

اور عام زمینیں آسانی سے دستیاب تھیں اور غلاظتوں سے لوگوں کے معیار زندگی کو شدید قسم کا خطرہ لاحق نہیں تھا۔ سماجی طور طریقے، رسم و رواج اور ضابطۂ اخلاق اس بات کے متقاضی تھے کہ انسانی غلاظتوں کو بستیوں سے دور ڈالا جانا چاہیے تاکہ کسی بھی شکل میں آلودگی اور گندگی نہ پھیلنے پائے۔

آبادی میں زبردست اضافے، صنعتوں، عمارتوں، زراعت وغیرہ کے لیے زمین کے وسیع پیمانے پر استعمال کے نتیجے میں زمین کی کمی اور سماجی و اقتصادی حالات کی وجہ سے پرانے نظام کو محفوظ طریقے سے مزید استعمال کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

آزادی کے بعد، حکومت نے بلدیہ، کھلے گڑھوں، پانی کے نظام وغیرہ کے ذریعہ انسانی غلاظتوں کے سلسلے میں کوششیں کی ہیں۔ آج اس میں فلش والے بیت الخلاؤں، نجی، دیگر گھریلو زندگی میں حفظان صحت کے طریقے، گندے پانی کی نکاسی وغیرہ شامل ہے۔ بھارت میں چھٹے منصوبے تک بھی دیہی علاقوں میں صفائی ستھرائی کی صورت حال کو بہتر بنانے کی کوششوں کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی، جتنی کہ انہیں دی جانی چاہیے تھی۔ ۱۹۵۴ء میں صفائی ستھرائی کا پروگرام حکومت ہند کے تحت پروگرام حصے کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ بعد میں اس پروگرام کو صحت کی وزارت سے منتقل کر کے تعمیرات اور مکانات کی وزارت کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ایک ایسے طویل پروگرام ۱۹۸۱ء میں شروع کیا گیا تھا اور ۱۹۸۵ء میں گاؤں میں صفائی ستھرائی کے پروگرام کو شہری ترقیات کی وزارت سے منتقل کر کے دیہی ترقیات کی وزارت کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۶ء سے پیش رفت :

گاؤں میں صفائی ستھرائی کا مرکزی پروگرام ۱۹۸۶ء میں شروع کیا گیا تھا۔ دیہی صفائی ستھرائی کا معاملہ این آر ای پی، آر ایل ای جی پی اور اندرا آواس یوجنا کا بھی حصہ ہے حکومت کے اسپانسر شدہ پروگراموں کے علاوہ، بڑی تعداد میں سینیٹری بیت الخلاؤں

غیر سرکاری اقدامات سے بنائے گئے تھے۔ قومی نمونہ جاتی سروے نے سروے کے اپنے ۴۴ دور (۸۹ - ۱۹۸۸ء) میں بتایا ہے کہ ۹۶ء۱۰ فیصد دیہی کنبوں کو سینیٹری کی سہولیات تک رسائی حاصل تھی۔

گاؤں میں صفائی ستھرائی کے مرکزی طور سے اسپانسر شدہ پروگرام سے متعلق رہنما خطوط کی نظرثانی مارچ ۱۹۹۳ء میں کی گئی تھی نئے رہنما خطوط کے تحت، غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے لیے ہر گھر میں بیت الخلا کے علاوہ خواتین کے لیے گاؤں میں خصوصی سینیٹری کمپلکس اور سینیٹری کے سازوسامان کی پرچون دکانیں بنانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ خشک بیت الخلا کو کم لاگتی سینیٹری بیت الخلا میں تبدیل کرنے کے کام کو پروگرام کے تحت اعلیٰ ترجیح دی جا رہی ہے۔ آٹھویں منصوبے کی مدت کے دوران، گاؤں میں صفائی ستھرائی کے سلسلے میں دیہی ترقیات کی وزارت کے پروگرام کے لیے ۲۳ر[illegible] کروڑ کی رقم مخصوص کی گئی ہے، جس میں سے ۳۸۰ کروڑ روپے کی رقم گاؤں میں صفائی ستھرائی کے مرکزی طور سے اسپانسر شدہ پروگرام کے لیے اور ۲۹۴ر۲۳ کروڑ روپے کی رقم ریاستی شعبے کے کم سے کم ضروریات کے پروگرام کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ اور ۹۴-۱۹۹۳ کے دوران غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے تقریباً ۴۲ر۸ لاکھ لوگوں کو مستفید کیا گیا ہے اور ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران مزید ۸۲ء۱۹ لاکھ لوگوں کو اس پروگرام سے کیے جانے کی توقع ہے۔ ۹۶-۱۹۹۵ اور ۹۷-۱۹۹۶ء میں مستفید کیے جانے والے لوگوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہوگی کیونکہ مرکزی اور ریاستی شعبے کے اخراجات میں کافی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جیسے آر وائی، آئی سی جے آر وائی کے تحت پروگرام، خاص طور سے یونیسیف، عالمی بینک کی امداد سے دو طرفہ اور مختلف طرفہ امداد شدہ پروجیکٹ، ریاستی شعبے کی دیگر اسکیمیں اور غیر سرکاری اقدامات مرکزی اور ریاستی پروگراموں کے معاون ہوں گے۔

آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران پیش رفت میں تیزی لانے کی حکمت عملی، ترجیحات اور مقاصد حسب ذیل ہیں۔

منصوبے کے مقاصد

گاؤں میں خاص طور سے غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو سستے بیت الخلاء مہیا کئے جانے کے کام میں تیزی لانا اور پانی کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے واقعات میں کمی لانا۔

- بیداری پیدا کر کے اور صحت کے بارے میں تعلیم دے کر صفائی ستھرائی کی ضرورت محسوس کرانا۔
- دیہی علاقوں میں تمام موجودہ بیت الخلاؤں کو سینیٹری بیت الخلاؤں میں تبدیل کر کے ہاتھ سے غلاظت اٹھانے کے کام کا خاتمہ کرنا۔
- مذکورہ مقاصد کے حصول میں مدد بہم پہنچانے کے لیے کم اخراجات اور مناسب ٹیکنولوجی کی حوصلہ افزائی کرنا۔

ترجیحات:

خشک بیت الخلاؤں کو سینیٹری بیت الخلاؤں میں تبدیل کرنا

- غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے لیے ہر گھر میں بیت الخلاء کی سہولت فراہم کرنا۔
- جہاں کہیں ضروری ہے، خاص طور سے خواتین کے لیے سینیٹری کمپلکس بنانا۔
- نالوں، گلیوں، کوڑا کرکٹ کے گڑھوں وغیرہ جیسی صفائی ستھرائی کی دیگر سہولیات کا اہتمام کرنا۔
- سینیٹری کے سازو سامان کے لیے پرچون کی دکانیں بنانا۔

حکمت عملیات:

صرف غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے لئے مالی امداد کا اہتمام

• سینیٹری کے ساز و سامان کی پرچون دکانوں سے ساز و سامان خرید نے کے سلسلے میں کنبوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

• خواتین کو تربیت دینا

• علاقہ کے لحاظ سے مخصوص نمونوں کے لیے تحقیق و ترقیاتی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

• غیر سرکاری تنظیموں اور رضا کار تنظیموں کو زیادہ سے زیادہ شامل کرنا۔

نئی جہت دینے کی ضرورت :

گاؤں میں صفائی ستھرائی کے پروگرام کو نئی جہت دینے کی ضرورت ہے۔ اس پروگرام کو مکمل خواندگی کی مہم کی طرح ایک عوامی پروگرام بنایا جانا چاہیئے۔ مالی امداد میں بتدریج کمی لائی جانی چاہیئے نیز ترغیب عمل، بیداری کی مہم، حفظان صحت کے بارے میں تعلیم پر زور دیا جانا چاہیئے۔ اسی وجہ سے، نئی حکمت عملی کے تحت ۸۰ فیصد تک مالی امداد غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے لیے محدود کر دی گئی ہے۔

حکومت نے ماہرین کی دو کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ ایک کمیٹی گھریلو بیت الخلاؤں کے سلسلے میں ٹیکنولوجی اختیار کرنے کی غرض سے رہنما خطوط وضع کرنے کے لیے اور دوسری کمیٹی غیر سرکاری تنظیموں اور رضا کار تنظیموں کو زیادہ سے زیادہ شامل کرنے رضا کارانہ عمل کے ذریعے خود پیسہ لگانے کی اسکیم (سیلف فائننسنگ اسکیم) پر عمل در آمد کے سلسلے میں رہنما خطوط وضع کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ توقع ہے کہ یہ کمیٹیاں جلد ہی اپنی رپورٹیں پیش کر دیں گے۔

رضا کار تنظیموں کو فروغ دینے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے سلسلے میں ریاستوں کی واضح حکمت عملی ہونی چاہیئے۔ تکنیکی اساتذہ کے تربیتی اداروں اور پالی ٹیکنیکوں سمیت ابتدائی اسکولوں سے لے کر ثانوی اسکولوں اور کالجوں تک کے نصاب تعلیم اور نصابی کتابوں میں گاؤں میں صفائی ستھرائی کے نظریہ کو شامل کیا جانا چاہیئے۔ حکومت دیہی علاقوں کے تمام اسکولوں میں سینیٹری بیت الخلاؤں کی سہولت فراہم کرنے کے پروگرام کو بھی ترجیح دے گی تاکہ طلباء

اور اساتذہ میں صفائی ستھرائی کی عادتیں پیدا کی جائیں۔ پنچایتی راج کے اداروں کو ا
پروگرام میں مکمل طور سے شامل کیا جائے گا تاکہ اپنے عظیم رہنما پنڈت جواہر لعل نہرو کے ن
کو حاصل کیا جاسکے، جنہوں نے کہا تھا۔

"جس دن ہمارے ملک کے ہر ایک مرد اور عورت کو بیت الخلاء کی سہولت م
اس دن میں سمجھوں گا کہ ہمارا ملک ترقی کی انتہا تک پہنچ گیا ہے۔"

ہمارے موجودہ وزیر اعظم شری پی۔ وی نرسمہا راؤ نے بھی آٹھویں منصوبے
جاتی اخراجات میں اضافہ کرکے اس پروگرام کو اعلیٰ ترجیح دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ا
کوششوں سے، موجودہ منصوبے اختتام تک ۲۵ فی صد دیہی آبادی کو مستفید کرنے کی غ
صفائی ستھرائی کی سہولیات میں اضافہ کیا جائے گا۔

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

جلد [۱۲] شمارہ [۳]

قیمت : ۶ روپے

زرتعاون

ہندوستان	سالانہ	۶۵ روپے	۲ سال	۱۲۰ روپے	تاحیات	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	"	۲۰۰ "	"	۳۶۰ "	"	۳۷۰۰
امریکہ	"	۴۰ ڈالر	"	۷۰ ڈالر	"	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	"	۲۵ پونڈ	"	۴۵ پونڈ	"	۴۰۰ پو
پاکستان	"	۱۷۵ پاکستانی روپے	"	۳۰۰ روپے	"	۳۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب ۱۲۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد-۱

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس پیکے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار سے چھپوا کر دفتر شاداب ۱۲۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

فارم ۴ —— صفحہ ۴۶ پر

رہنما اصول بھی بعد کی دین ہیں۔ اس سفر میں آج بھی محسوس ہوتا ہے جیسے مولوی
روشن مشعل لے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں
بظاہر لگتا ہے کہ مولوی عبدالحق کی اُردو لغت لگانے کا جو ارادہ کام پاک
مرتب صورت میں نمایاں ہوا اگر واقعہ یہ ہے کہ یہ کام دراصل 1930ء میں حیدرآباد
دوران شروع ہو چکا تھا۔ مولوی عبدالحق 1930ء میں جب اورنگ آباد کالج سے
ہوئے تو حکومت حیدرآباد نے انہیں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کا صدر مقرر کیا اور
لے بارہ ہزار روپئے سکہ عثمانیہ سالانہ کی ایک خطیر رقم بھی اس کام کے لیے مختص کر
زبان کی ایک جدید اور جامع لغت مرتب کی جا سکے۔ پھر ایک خاص منصوبے کے
ہوا۔ مولوی احتشام الحق دہلوی ان کے مددگار مقرر ہوئے۔ ان کا کام صرف
کے تلاش کردہ الفاظ کو ترتیب سے جانا اور ضرورت ہو تو صاف اور سلیس انداز
توضیح اور ان کے معنی تحریر کرنا تھا۔ نظر ثانی خود مولوی عبدالحق اور ماہرین
کرتی تھی جس میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جناب پنڈت دتاتریہ کیفی۔ اور
زید آبادی جیسے ماہرین علم و زبان شامل تھے الفاظ کی اصل اور سرگذشت
کے لیے سنسکرت اور ہندی زبانوں کے بعض ماہرین جیسے پنڈت ونشی دھر و
تھے۔ اس مجوزہ لغت کا ایک حصہ حیدرآباد کے سرکاری پریس میں چھپا ہی تھا کہ
اور بظاہر اس جامع اسکیم کا شیرازہ بکھر گیا۔ مگر محسن اردو مولوی عبدالحق
مجاہد آہنی عزم و استقلال کے سپاہی اور دھن کے پکے خادم اُردو تھے جنہوں
کاز کے لیے نہایت خلوص اور انہماک سے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی
مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے تو وہاں بھی انہوں نے انجمن ترقی اردو کی ابتدا
جامع لغت کے منصوبے کو دوبارہ عملی شکل دینی شروع کی۔ بڑی حد تک موافق
وجہ سے یہ پودا پروان چڑھ کر جلد ہی ایک شجر سایہ دار بن گیا۔ انجمن کے

...ن شدہ لغت کے حصے بالاقساط شائع کئے گئے پھر اسے باقاعدہ لغت کی صورت
...کا پروگرام بنایا گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۷۷ء میں اسکی پہلی جلد منظر عام پر آئی جس میں
...کے آگے تک کے الفاظ شامل ہیں۔

اس لغت کی پہلی جلد کے شروع میں بابائے اردو کا طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔ جو اس
...سالہ اردو میں بھی شائع ہوا تھا اور جو ان کی لغت نویسی کے رہنما اصولوں پر مبنی ہے
...ن میں مولوی عبدالحق نے مروجہ اردو لغات کی جن خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے
...رف منتخب سرمایہ لسانی کی شمولیت، محاورات کی ستیاناس طول طویلی۔ تلفظ کی
...سند روایت اور لغت کی قاموس بنا دینے کی کوششوں سے اجتناب برتنے کی
...ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اندھا دھند نقل لغت کے نقص سے بھی دامن بچانے کی
...ہے، اس سلسلہ میں صحیح لغت نویسی کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی کے طریقہ کا بھی ذکر
...ے لغات کو جدید علم زبان کی روشنی میں مرتب کرنے کی مثال قائم کی ہے۔
لغت نویسی کی بنیادی شرط الفاظ و تراکیب وغیرہ کا صحیح علم اور پھر ان کی معنی کی
...و تفہیم میں بھی مناسب الفاظ کا انتخاب ہے تاکہ اندراجات کی صحت اور ان کی
...ائیاں اور وسعتیں واضح ہوں۔ مولوی عبدالحق کو نہ صرف اسکا پورا پورا احساس
...تھا بلکہ انھوں نے لغت نویسی کی اس اہم ذمہ داری کو بطریق احسن نبھایا۔ اس بارے میں
...لغت نویسوں اور لغت نگاروں کی کوتاہیوں کی طرف توجہ کو منعطف کرتے ہوئے وہ
... پر لکھتے ہیں۔

"ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیال کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں
...ہے معلوم ہوتی ہے کہ جس خیال کو ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے شاید وہ
...اصل ہیں کھل ہے۔ شاید مستقل ہے۔ کہیں سے پیتا ہوا چلا آرہا ہے۔ ہمارے دل پر
...ر نقش نہیں ہے اس لئے ہمارے دل میں گھر نہیں کیا ورنہ ممکن نہ تھا کہ ادا نہ ہوتا۔

ہو ان کو قوسین میں ارکان تہجی کے ٹکڑے کر کے یا الگ الگ حروف و اعراب کے ساتھ لکھ دیا جائے۔

ہر نوع مولوی عبد الحق کی یہ مثالی لغت جواب بڑی حد تک مکمل ہو چکی ہے ابتدا ہی سے معنوی وضاحت کے لحاظ سے بھی قحط سابقہ لغات میں ایک واضح انقلابی بہتری کا عمدہ نمونہ رہی ہے۔ معانی کو ممکن حد تک صحت اور وضاحت کے ساتھ سائنٹفک انداز میں درج کیا گیا ہے اسکے علاوہ قریب المعنی اور ہم معنی الفاظ کو بطور مترادف دینے کے ضمن میں بھی کافی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔

اس لغت کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں معرب مفرس اور منفرد الفاظ کی اصل کی نشاندہی کرتے وقت محض استعمال اور تصرف کو بنیاد بنا کر روایتی لغات کے غیر معنی ادغام کے برعکس اصل زبان کی طرف اشارہ کرکے لسانی ماخذ اور اس کے لسانی سفر کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ اور کہیں تبدیلی محسوس کی گئی ہے تو اس کی بھی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ اگرچہ بابائے اردو نے دوسری لغات کے ساتھ خواجہ عبد المجید کی مدون کردہ جامع اللغات میں پائی جانے والی اس خامی کی طرف بھی فرہنگ نویسوں کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ جامع اللغات جدید علم لغت اور فرہنگ نگاری کے سائنسی اصولوں کی روشنی میں اردو زبان کی لغت نہیں بلکہ اردو ہندی، سنسکرت، عربی اور فارسی سب زبانوں کا ملغوبہ ہے۔ علاوہ الفاظ و محاورات کے بول چال کے فقرے اور کہاوتیں بھی لکھ دی گئی ہیں۔ مگر ماہرین کا خیال ہے کہ یہ عیب کسی حد تک خود مولوی عبد الحق کے لغت میں بھی در آیا ہے۔ اس کے علاوہ علمی حلقوں میں تاثر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ لغت کبیر میں اندراجات کو خالصتاً ہجائی ترتیب سے رکھا گیا ہے اسی طرح مفردات کے دوش بدوش مرکبات اور محاورات کو بھی ہجائی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں الفاظ کی تلاش میں کچھ دشواری بھی پیش آسکتی ہے

ممتاز ماہر لسانیات اور میرے استاد محترم پروفیسر مسعود حسین خاں کی رواست مجھے

ـ لسانی اردو لغت نویسی کی تاریخ میں ہکاری یا نفسی آوازوں کو جداگانہ حروف
ماں کر اسی انداز سے لغت مرتب کرنے کی تجویز کا سہرا بھی اردو لغت بورڈ کراچی
ستان کی بجائے خود مولوی عبدالحق کے سر جاتا ہے۔ انہیں کی روایت کے مطابق ۱۹۳۰ء
ب تجویز کو بروئے کار لایا جا چکا تھا کہ (ب) کے بعد (بھ) کا حرف آئے گا۔ چنانچہ
ستان پہنچنے کے بعد بھی اس لغت کی تمام جلدوں کی تدوین میں بھی یہی ترتیب رکھی
ہے۔

اردو میں مروجہ ہکاری یا نفسی آوازوں جیسے (بھ) (پھ) (تھ) (دھ) (ڈھ) وغیرہ
اقاعدہ صوتیے (phonemes) کی شکل میں جداگانہ حرف کی حیثیت دینے کا
ئلہ کافی اختلافی رہا ہے۔ اگرچہ اردو کے پہلے باقاعدہ لغت نویس انشاء اللہ
انشاء مصنف "دریائے لطافت" اور جدید قواعد نگار مولوی عبدالحق مصنف قواعد
نے ہکاری آوازوں کو باقاعدہ جداگانہ صوتیوں کی حیثیت دی ہے اور پروفیسر
مسعود حسین خاں نے بھی انہیں علاحدہ صوتیے اور جداگانہ حرف تسلیم کیا ہے۔
بعض ماہرین کو اس سے اتفاق نہیں ہے شمس الرحمن فاروقی نے بھی اوپر کی آرا سے
ل طور پر اختلاف کیا ہے۔ مجھے اپنے مبلغ علم کا پورا پورا احساس ہے پھر بھی کہوں گا
جدید لسانی شعور کے نام پر ایک غلط اور ناعاقبت اندیش فیصلہ ہے۔ جس سے
کے حروف تہجی کی تعلیم اور تدریس میں غیر ضروری دشواریاں آسکتی ہیں۔ بہرحال
والا وقت ہی اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ یہ فیصلہ کس حد تک صحیح یا غلط ہے
آخر میں ماحصل کلام کے طور پر یہ کہنا چاہوں گا کہ مولوی عبدالحق اردو کے وہ پہلے
لغت نویس ہیں اور ان کی لغت کبیر اردو کی وہ پہلی لغت ہے جس میں جدید لسانی
اور نئے علم قواعد کی روشنی میں کئی جامع رہنما اصول وضع کیے گئے ہیں جو اپنی
سائنٹفک اساس کی وجہ سے بہت اہم ہیں۔ مولوی عبدالحق کو چونکہ انگریزی

یسی کا بھی پورا ادراک تھا اور وہ خود بھی اُردو انگریزی اور انگریزی اُردو لغت
ین میں ذاتی طور پر بھی برسوں مصروف رہ چکے تھے۔ اس کے لغت نویسی کے جدید اور
ے اصولوں اور طریقہ کار پر انکی گہری نظر تھی۔ اس لیے وہ انگریزی کی نئی اور بڑی
ی تیاری میں احتیاط کر وہ علمی طریقہ کار اور اصولوں کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لے
۔اس کے مولوی عبدالحق نے ایک ایسا جامع منصوبہ اور کچھ ایسے علمی اصول و ضوابط
ایسے مرتب کر سکے۔ جن سے وہ بنیادیں استوار ہی نہیں ہوئیں بلکہ مستحکم بھی
۔جن پر اردو زبان و ادب کی سب سے بڑی تاریخی لغت کی قطب مینار سے بلند اور
سے زیادہ مضبوط اور شاندار عمارت کھڑی ہو سکی۔ بابائے اُردو کا یہ بھی ایک
کارنامہ ہے جسے اُردو زبان و ادب سلام کرتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے بعد
۔ ڈاکٹر عبداللیث صدیقی، نسیم امروہوی، شوکت سبزواری، شاہ الحق حقی اور اب
زبان فتح پوری جیسے ماہرین علم و ادب اس عظیم منصوبے کے ساتھ منسلک ہونے
بیش قدر خدمات انجام دیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر نئی دہلی کی توسیع تعمیر اور
ڑے سے بڑے پیمانے پر اور نہایت پر وقار انداز میں جاری رہ سکتی ہے لیکن شاہ جہاں آباد
میں و تعمیر کے سنہرے سہرے کو شاہ جہاں کے سر سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل اسی
بابائے اردو کی یہ اساس اور آفاقی خدمت کو دائماً ہمیشہ یادگار رہے گی، اور اسے
اردو دنیا میں ہمیشہ تعظیم و توقیر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہے گا۔

امیر احمد صدیقی

ہندوستان کی قد آور شخصیت

رفیع احمد قدوائی مرحوم

تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے ملک میں ایک سے بڑھ کر ایک قد آور اور محب وطن شخصیتوں نے جنم لیا ہے جن میں ایک عظیم المرتبت شخصیت رفیع احمد قدوائی کی تھی جو ہماری جنگ آزادی کے ایک جانباز سپہ سالار ہی نہ تھے بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کے دست راست سیکولرزم کے علمبردار اور بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے حامل تھے جن کی حب الوطنی اعلا ظرفی اور انسانی دوستی پر اہل وطن کو ناز ہے۔ جنگ آزادی سے قبل اور حصول آزادی کے بعد رفیع احمد قدوائی نے جو نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ ہماری ہندوستانی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔ ملک و قوم کی انہیں زریں خدمات کے سبب رفیع صاحب کا شمار ملک کے صف اول کے رہنماؤں میں ہمیشہ کیا جائے گا ایثار و قربانی کا یہ پیکر اور غریبوں اور دبے کچلے طبقوں کا یہ مسیحا ضلع بارہ بنکی کے ایک قصبہ مسولی میں ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۸ فروری ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوا تھا۔ ان کے والد امتیاز علی مرحوم ایک نیک، دل اور فرشتہ صفت انسان تھے ان ہی یہی خوبیاں رفیع صاحب کو وراثت میں ملی تھیں۔ ۱۹۱۳ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے اعلا تعلیم حاصل کرنے

کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں داخلہ لیا۔ لیکن اسی درمیان میں وہ جنگ آزادی میں کود پڑے۔ علی گڈھ یونیورسٹی میں ان کا شمار ایک با ناز محب وطن کی حیثیت سے کیا جانے لگا تھا اور یونیورسٹی کے ذمہ داران نے ان کا نام ملک کے باغیوں کی فہرست میں لکھ رکھا تھا۔ وہاں سے بی۔اے کرنے کے بعد وہ قانون پڑھنا چاہتے تھے لیکن اسی عرصے میں وہ مولانا محمد علی کی خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے جس کی پاداش میں ان کو ایک سال کی سزا ملی۔ ۱۹۱۷ء میں کانگریس کے ایک سرگرم کارکن بن چکے تھے جیل سے رہائی کے بعد انہوں نے کسانوں کو زمینداروں کے ظلم و استبداد سے بچانے کے لئے بارہ بنکی میں اتنی زبردست تحریک چلائی جس سے کانگریس کے بڑے بڑے رہنما ان کی تنظیمی صلاحیت کے گرویدہ ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں پنڈت موتی لال نہرو نے رفیع صاحب کو اپنا سکریٹری بنا لیا۔ اب وہ الٰہ آباد میں مستقل طور سے رہنے لگے تھے اور اسی کے بعد سے ان کا رشتہ نہرو خاندان سے اتنا گہرا ہو گیا جو مرتے دم تک قائم رہا۔

۱۹۲۵ء میں رفیع احمد قدوائی یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۶ء میں کانگریس کے لکھنؤ سیشن میں پنڈت نہرو نے اپنے صدارتی خطبے میں سوشلزم کی پرزور وکالت کی تھی جس پر کانگریس کے کچھ رہنماؤں نے نہرو جی کی سخت مخالفت کی تھی اس وقت رفیع مرحوم نے اپنے ایک بیان میں ان رہنماؤں کو "انڈین کونسل آف فناکشنسٹ" کہہ کر ان کی سخت مذمت کی تھی۔ رفیع صاحب شروع سے ہی نہرو اور ان کے خاندان کے سچے ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب ریاست اتر پردیش میں کانگریس دوبارہ برسر اقتدار آئی تب وزارت میں رفیع صاحب کو مال اور جیل کے محکمے دیئے گئے۔ رفیع صاحب نے خاتمہ زمینداری قانون بنوانے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا اسی سال جب پنڈت نہرو کل ہند کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے اس کی ورکنگ کمیٹی میں قدوائی صاحب کو بھی شامل کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور پنڈت نہرو وزیر اعظم بنائے گئے۔ نہرو جی اپنی کابینہ

ع صاحب کو سب سے پہلے محکمہ مواصلات دیا جس میں انہوں نے چند ایسے انقلابی اقدامات
ج بھی یاد کئے جاتے ہیں ۔ لیکن رفیع صاحب بام شہرت پر اس وقت پہنچے ان کو
ت اور غذا کا اہم محکمہ سپرد کیا گیا۔ اس وقت ملک کی غذائی صورت حال بہت ابتر تھی
یم اتنا ناقص تھا کہ ملک کے عوام چیخ اٹھے تھے اور غریب آدمی کو دو وقت کی روٹی بھی
وتی تھی۔ اس وقت رفیع صاحب نے اپنی خدا داد انتظامی صلاحیت اور سوجھ بوجھ سے
ستان کے غذائی مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا کہ ملک کے بڑے بڑے لیڈر بھی دنگ رہ گئے۔
ہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ملک کی جمہوریت اور سالمیت کو بچانے کے لئے رفیع صاحب
نے محمد عبداللہ کو راتوں رات گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا تھا ۔ اس وقت کشمیر ملکی
ملکی سازشوں کا اڈا بنا ہوا تھا ۔ رفیع صاحب کو پورا یقین تھا کہ نہ صرف کشمیریوں کے
ر ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد میں ہے کہ کشمیر بھارت کا ایک اٹوٹ حصہ بنا رہے۔ رفیع صاحب
یصلہ کرتے تھے بہت سوچ سمجھ کر عین وقت پر کرتے تھے۔

رفیع صاحب اپنے وقت کے حاتم طائی تھے ان کے در پر جو بھی ضرورت مند پہنچا کبھی
ا بس نہیں آتا تھا۔ ان کے فیض اور بخشش کے بہت سے قصے مشہور ہیں وہ آدمی
نتا جانتے تھے لیکن اکثر انسانی کمزوریوں کو درگذر کر دیتے تھے۔ ایک دن ایک صاحب
ہ یہاں تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ ان کی لڑکی کی شادی ہے لیکن ان کے
کے پاس روپئے نہیں ہیں۔ رفیع صاحب نے کچھ اپنی جانب سے اور کچھ دوستوں کی جانب سے
سکے ۸۰۰ روپئے کی رقم ان صاحب کو پیش کر دی۔ کچھ عرصے کے بعد رفیع صاحب کو ان کے
، دوست نے بتایا کہ ان صاحب کی تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی ہے
لیکن رفیع صاحب یہ سن کر مشتعل نہیں ہوئے بلکہ یہ کہا کہ میرا بھی یہی خیال تھا
اس کا بھی کوئی شک نہیں کہ پیسوں کی اسے سخت ضرورت تھی - ایسے رحدل تھے
.محمد قدوائی مرحوم۔

نومسلم خاتون کے تاثرات

"ڈیلی میل" لندن کے چند مشہور روزناموں میں سے ایک ہے۔ اس نے اپنی حالیہ اشا[عت]
میں تین تعلیم یافتہ برطانوی نژاد خواتین کی داستان اسلام شائع کی ہے۔ اخبار نے اس تبد[یلی]
کو حیرت انگیز تبدیلی بتایا ہے کہ باوجود مغرب کے پروپگنڈے اور تاثر ہے کہ اسلام میں
کوئی آزادی نہیں ہے۔ پچھلے سالوں میں بیس ہزار سے زیادہ مرد اور خواتین مسلمان ہو چکے [ہیں]
اور ایک اطلاع کے مطابق ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے صرف ا[یک]
شہر گلاسکو میں ہر مہینہ کم از کم ایک محنت فرد دائرہ اسلام میں داخل ہوتی ہے۔ ہم اخب[ار]
"ڈیلی میل" کے شکریہ کے ساتھ ان میں سے ایک نومسلمہ بہن کا تاثر آپ کی خدمت میں پ[یش]
کر رہے ہیں۔

نام ہدیٰ خطاب عمر ۲۸ سال اسلام لانے سے قبل نام سمانتھا بلیک پول (یوکے) میں [پ]
بڑھیں۔ نیوکلیئر پلانٹ کے سپروائزر تھے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ہدیٰ [نے]
اسلام قبول کیا اور شام کے نامر صاحب سے شادی کر لی۔ اب ہدیٰ پارٹ ٹائم کرتی ہیں
باقی وقت اسلام کے بارے میں کتابیں لکھنے میں صرف کرتی ہیں۔

بڑی کہتی ہیں

ہمارا خاندان کوئی زیادہ مذہبی نہ تھا۔ لیکن میں اور میرے بھائی اتوار کو گرجا میں بچپن ہی سے جایا کرتے تھے۔ ہماری تربیت ایک انگریزی ماحول میں ہوئی جس طرح کہ عام انگریزی معزز گھرانوں میں ہوتی ہے۔ جب میں بارہ سال کی ہوئی تو میرے والدین نے آپس میں طلاق حاصل کر لی۔ جو کہ میرے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ حالانکہ میں اپنی کلاس میں [illegible]۔ لیکن میں خوش نہیں تھی جسمانی لحاظ سے کچھ موٹی تھی اور مجھے لوگ چھیڑا کرتے تھے۔ [illegible] میرے دوست بھی کم تھے۔ پارٹیوں وغیرہ میں جانے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ اور نہ ہی مجھے تمباکو نوشی شراب نوشی اور منشیات سے لگاؤ تھا۔

شراب البتہ میں نے ضرور چکھی میری سوشل لائف چرچ کا یوتھ کلب تھا۔ جہاں میری دوست صرف لڑکیاں تھیں میں شرمیلی نہیں تھی لیکن شروع سے ہی میرا نظریہ تھا کہ ایک عورت کی شادی ہونے تک اپنے آپ کو برائے فرینڈ وغیرہ سے بچا کر رکھنا چاہیئے۔

چار اے لیول حاصل کرنے کے بعد میں نے لندن میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹیڈیز میں داخلہ لیا تاکہ میں عربی پڑھ سکوں۔ اسلام کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں۔ لیکن جوں جوں میں عربی پڑھتی گئی میرا شوق اسلام کے بارے میں بڑھتا گیا میں نے ایک استاد کے ذریعہ مسلمان لوگوں سے ملنا ملانا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان خاندان کے لوگ چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہوں آپس میں اس قدر قریبی تعلقات رکھتے ہیں کہ مجھے ان کا اس طرح رہنا اور بھی اچھا معلوم ہوا۔ کیوں کہ میرے والدین علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔ دوسرا اہم پہلو اسلام کے وہ اصول اور احکامات تھے جن کو اسلام نے بڑی سختی سے نافذ کیا ہے۔ خاص کر شادی سے پہلے جنسی اختلاط کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ جس نے میرے اپنے اس نظریہ کی تائید کی جو کہ بچپن ہی سے میرے ساتھ تھا لیکن جس چیز نے مجھے اپنی طرف کھینچا وہ تھا پردہ جو کہ مسلمان عورتیں پہنتی ہیں۔

عورتوں کا اسلامی لباس دوسرے لوگوں کی نظر میں عورت کے جسم سے ہٹا دیتا ہے۔ اور مجھے یہ نظریہ بہت پسند آیا کیونکہ میں بچپن میں اپنے موٹے ہونے کی وجہ سے لوگوں کے مسخرانہ چھیڑ چھاڑ کا شکار بھی رہ چکی تھی مغربی کلچر عورتوں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ بن سنور کر پھریں اور اپنے جسم کی نمائش کریں لیکن اس کے برخلاف عورتوں پر بھی الزام عائد ہے کہ مردوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔ حجاب سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ اپنے جسم کی نمائش کرتی پھریں۔

یونیورسٹی کے پہلے سال میں ایسٹر کی چھٹیوں تک میرا علم اسلام کے بارے میں کافی بڑھ چکا تھا۔ اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے اسلام میں داخل ہو جانا چاہیئے۔ لندن کی ریجنٹس پارک مسجد میں میری ملاقات کیٹ اسٹیونز سے ہوئی جو کہ اسلام لانے سے پہلے ایک بہت ہی مشہور گانے والے تھے۔ اور اب یوسف اسلام کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ایک امریکن نو مسلم خاتون بھی وہاں موجود تھیں۔ ان خاتون سے میری دوستی کافی عرصے سے تھی۔ دو مہینوں کے بعد میں نے بہت سی خواتین کے سامنے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد چند خواتین مجھے اپنے گھر لے گئیں۔ اور یہاں پر میرے اعزاز میں ایک پارٹی کا انتظام اسی وقت کر ڈالا۔ اور مجھے خوش آمدید کہا گیا۔ شروع میں تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ مجھے جہاں پہنچنا تھا وہاں پہنچ گئی ہوں۔ چند دنوں کے بعد میں ایک مسلم عورتوں کے ہاسٹل میں منتقل ہو گئی۔ جہاں پر میں نے سیکھا کہ مسلمان عورت کو کس طرح رہنا چاہیئے۔

میں نے اپنا نام ہدیٰ میں تبدیل کر لیا جس کا مطلب ہے ہدایت۔ میری فیملی مجھے ابھی تک میرے پرانے نام سے پکارتی ہے ابتداً میں تو میری فیملی بڑی مایوس اور شاک ہوئی میرے والد نے کہا کہ اسلام تم کو ہم سے دور کر دے گا۔ وہ یہ ہی امید کرتے رہے کہ یہ ابھی ایک دور ہے جو کہ گزر جائے گا۔ لیکن اب وہ آہستہ آہستہ میرے مسلمان ہونے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ سابقہ طور پر میری کچھ انگریز دوست کافی حیرت زدہ ہوئیں چند نے تو

کوئی پرواہ نہ کی اور کچھ میری دوست ابھی تک ہیں۔ مجھے اسلام کے بعض اصول بہت آ[illegible]
آئے۔ پانچ وقت نماز میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن حجاب کو اپنانے میں تھوڑا وقت
پیش آیا۔ چھ مہینے میں میں اس کی عادی ہو گئی۔ اور اب میرے تمام کپڑے اسلا[illegible]
سلے ہوتے ہیں اور اب نقاب کو پہننا قدرتی امر معلوم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے [illegible]
میری شادی ہو گئی۔ میری خواہش تھی کہ میری شادی اسلامی طریقے سے ہو چنانچہ [illegible]
سہیلی کو اعتماد میں لیا۔ اور اس کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ میرے لئے ایک مناسب
کا انتخاب کرے سہیلی نے میری ملاقات ناصر صاحب سے کروائی جو کہ سیول انجینئر
جب میری ملاقات ناصر صاحب سے ہوئی۔ جو دوستوں کی موجودگی میں ہوئی تو میں کا[illegible]
تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسلامی دائرہ میں رہ کر اپنے آپ کو پیش کر سکوں۔
ایسے آدمی کی تلاش تھی جو صحیح معنوں میں مسلمان ہو اور شوہر ہونے کے ساتھ سا[illegible]
دوست بھی ہو۔ پہلی ملاقات کے بعد جب مجھے سوچنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ
میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو کہ میں تلاش کر رہی تھی۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ ناصر بھی [illegible]
کرتے ہیں ہم اس کے بعد کئی دفعہ ایک دوسرے سے اپنے دوستوں کی موجودگی میں
دنوں کے بعد ہم نے منگنی کر لی اور چھ مہینے بعد ہماری شادی ہو گئی۔ میں نے دیکھا ہے کہ
سوسائٹی میں عورت شادی سے پہلے اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ جنسی اختلاط کا
شادی سے پہلے میں کافی زور میں تھی۔ شادی کے بعد جیسا کہ عام ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ
بات کی عادت ڈالنی پڑتی ہے کہ اب ایک سے دو ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ایک
اور ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ حالانکہ خاوند ہونے سے زیادہ میری نظر میں
ناصر نے مجھے شادی سے پہلے بغیر حجاب کے نہیں دیکھا تھا اور مجھے یہ ڈر تھا کہ
بغیر حجاب کے ناصر مجھے پسند کریں گے یا نہیں خوش قسمتی سے ہم دونوں شروع سے ہی
[illegible]

ساس کہ میرے ساتھ اب کوئی اور بھی ہے جو کہ میرا خاوند ہے۔ اور ہم نے اسلامی زندگی
مطابق اپنی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ ناصر فل ٹائم کام کرتے ہیں اور میں پارٹ ٹائم
کا انتظام کرتی ہوں۔ میری یہ خواہش ہے کہ ناصر کبھی بچوں کے کپڑے تبدیل کر دیا کریں۔
ے میرا انگریز شادی شدہ بھائی بھی ناصر جیسا ہی ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ عورتیں مردوں کی اطاعت کریں جس کو کہ مغربی سوسائٹی کی عورتیں
ا برا سمجھتی ہیں لیکن اسلام نے عورتوں کی ذمہ داری اور اس کے قوانین صاف لفظوں میں
ن کر دیئے ہیں۔ اس بات سے کوئی فائدہ نہیں کہ عورتیں مردوں کے برابر بننے کی کوشش کریں۔

اسلام نے عورتوں کا کام عورتوں ہی کے ذمہ رکھا ہے۔ اور مردوں کا کام مردوں کے ذمہ

اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ایک دوسرے پر رحم کرو۔ اور ایک دوسرے کی زندگی کو
سان بنانے کی کوشش کرو۔

(منصف ۲۳/۱ ۹۵ سے شکریہ کے ساتھ)

محمد منظور احمد منظور
نزد جلیل منزل
نور خاں بازار حیدرآباد

قصور اپنا نکل آیا

جب سے ہم نے ہوش سنبھالا، یہی سنتے آئے کہ سب کے ساتھ مل جل کر رہو، دوستی اور محبت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دو "زبانِ شیریں، ملک گیری" لوگ پھولوں سے اپنا دامن بھرتے ہیں، تمہیں کانٹوں کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ پھولوں ہی طرف سب کی نگاہیں اٹھیں گی تو کانٹوں کا پرسانِ حال کون ہوگا۔ آخر ان کا بھی تو حق ہے زندگی پر، بھلا ہم کون ہوتے ہیں ان کا بھی حق چھیننے والے۔ جگر مرادآبادی نے کیا خوب کہا ہے ؎

گلشن پرست ہوں، مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

یہی تو کمالِ انسانیت ہے۔ لہٰذا کانٹوں کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کیوں کہ

پھول میں گر آن ہے، کانٹے میں بھی اک شان ہے

بچپن ہی سے ماں باپ، عزیز و اقارب، اساتذہ اور بزرگوں کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کانوں میں رس گھول رہے تھے کہ زندگی کا صحیح اور سچا لطف اٹھانا ہو تو پھر جس طرح بن پڑے کانٹوں میں بسر کرنے کی خو اپنے آپ میں پیدا کر لینا چاہیئے۔ کانٹے تو پھولوں کے ساتھ ہی لگے رہتے ہیں "جلیسِ ہم نشیں" کا ان پر بھی ایک نہ ایک دن اثر ضرور ہو سکتا ہے۔

پھر جب دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھنے کا موقع ملا تو یہ منظر بھی دیکھا کہ واقعی کچھ لوگ شعرا کے

اس قسم کے نصیحت آمیز اشعار اور جہاں دیدہ بزرگوں کے گرہ میں باندھ کر رکھے جانے کے قابل اقوال کی سوغات تو تقریباً بھولتے ہیں۔ یہ لوگ میدان زندگی میں ایسے آگے بڑھ رہے ہیں جیسے واقعی انہیں گلستانِ جہاں میں خار کا کھٹکا ہی نہیں ہے۔

اب ہمارے دل پر بھی بات نقش سا ہو گئی کہ اچھا آدمی تو وہ ہے جو بڑوں کے ساتھ نہایت عمدگی سے زندگی بھر نباہ کرے۔ ماں باپ کی تربیت و تعلیم کا بچپن سے ہی ذہن و دماغ پر اثر پڑتا رہا۔ سوچا تو گھر کی چار دیواری میں اور بچپن کے ساتھیوں کے ساتھ بیتے ہوئے چند لمحات اور کچھ ایسے واقعات یاد آئے جو غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر پیش آگئے تھے اور جو شاید اسی تعلیم کا نتیجہ تھے۔ ایک واقعہ تو اس وقت ذہن کے پردے پر نمایاں طور پر ابھر رہا تھا اور وہ یہ کہ — گھر میں ہم بچوں کی نگاہوں سے چھپا کر کہیں کسی جگہ مٹھائی کی ٹوکری رکھی گئی تھی۔ مگر مٹھائی کی سوندھی سوندھی خوشبو، مشک کی بو کی طرح کبھی روکے سے بھی رک نہیں سکتی۔ وہ خود اعلان کرتی ہے کہ "میں یہاں ہوں"۔ ہم سب بھائیوں نے کی طرح اس کا گھیراؤ کیا۔ ہمارے کندھوں پر کھڑے ہو کر بہت اونچی الماری کی چھت پر سے، ہمارے بڑے بھائی صاحب نے مٹھائی سے بھرپور ٹوکری نیچے اتاری۔ پھر چوری مال غنیمت تقسیم کرنے کا وقت آیا تو ہم مارے ڈر کے ہچکچاتے اور سوچتے ہی رہ گئے اور دوسرے ہمارا حصہ بھی صاف چٹ کر گئے لیکن جب گھر میں اس چوری کی بات پھیلی اور اندیشہ یہ پیدا ہوا کہ عمر کا لحاظ کرتے بڑوں کو زیادہ سزا ملے تو ہمارے دل نے سوچا کہ ہمیں اس میں شک نہیں کہ زبردستی مار پیٹ کر "آلۂ کار" بنایا گیا تھا، پھر بھی چونکہ بھائی آخر بھائی ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کے آڑے وقت میں کام آنا چاہیے اور پھر ہم "آلۂ کار" سہی "شریک کار" تو ضرور رہے ہیں، جب ہم نے اس انداز سے سوچنا شروع کیا تو اپنے آپ کو برابر کا "قصور وار" سمجھا۔ بس پھر کیا تھا آگے بڑھ کر والدین کے حضور میں ہم سراپا ندامت بنے پیش کئے گئے اور قربانی کا بکرا بنے۔ ہم نے داستان کچھ اس طرح بیان کی کہ سارا گناہ "اپنی ناتواں گردن پر" غالباً اسی واقعہ کا اثر ہے کہ سب بھائی ہماری دل سے قدر کرنے لگے تھے۔ آج ہم سوچتے ہیں تو یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ

آزمائش کی اس کٹھن اور سخت گھڑی میں، ہم نے کیے، پٹنے کے خطرے کو مول لینے کی ہمت کی تھی، غالباً سب کے ساتھ مل جل کر رہتے اور بڑوں کے ساتھ بخوشی نباہ کرنے کا غیر شعوری جذبہ ہی تھا جس کی قوت نے یہ کرشمہ دکھایا تھا۔

طالب علمی کے زمانے میں بھی بعض ایسے واقعے بلکہ "حادثے" گزرے جن میں ساتھیوں کے آڑے وقتوں میں ہمیں اپنی "پُرخلوص" اور رضاکارانہ خدمات پیش کرنی پڑیں تاکہ آئی بلا کو ٹالا جا سکے۔ کبھی ہم نے اپنی کتاب کسی ایسے بے فکر لا ابالی اور بدشوق طالب علم کو دے دی جو افلاس کی وجہ سے نہیں بلکہ محض لاپرواہی کے سبب جماعت میں کبھی "صاحب کتاب" نظر نہ آیا۔ کسی کے ہوم ورک کا کام خود کر دیا۔ کبھی ریاضی کے مشکل سوالات چشم زدن میں حل کر کے دے دیئے۔ جماعت میں کسی مدرس کے خلاف کبھی سازش ہوئی "ڈسٹر" چھپایا گیا۔ چاک کے ٹکڑے اڑا لیے گئے۔ استاد کی کرسی سر بسجود حالت میں رکھ دی گئی یا اُسے میز پر رکھ دیا گیا۔ ایسی حرکتوں سے بعض ساتھیوں کے مصیبت کے بھنور میں پھنسنے کا اندیشہ پیدا ہوا۔ ہم پہلے ہی سے قائم کیے ہوئے اپنے اچھے Impreation کے زیر اثر گواہی اور بیانات کے سلسلے میں یاد کیے گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو کبھی اپنے ساتھیوں سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھا بلکہ ایسے "نازک" موقعوں پر اپنے آپ کو بھی شریک کار گر
صدر مدرس صاحب کے سامنے ہم نے کچھ اس طرح سے بیان دیا کہ بڑوں کو اپنی بڑائی کا احساس بھی ہو جائے اور وہ پٹنے سے بھی بچ جائیں پھر ان طلبا کی دلشکنی بھی نہ ہو تاکہ آئندہ ان میں جینے کا حوصلہ اور زندگی گزارنے کی امنگ باقی رہے۔ اس کے علاوہ، اسکول کی فضا بھی خوشگوار رہے اور زندگی کی گاڑی پست و بلند راستوں پر اپنی ایک خاص رفتار سے چلتی رہے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ہمارے بہت ساتھی کبھی ہمیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور ہم اُن میں کبھی ہر دلعزیز نہ ہوتے۔ اُن کے بگڑے کام عمداً بنانے کی وجہ سے ہی، ہو سکتا ہے کہ اُن کے دل میں اپنی زندگی کی صحیح ڈھنگ سے تعمیر کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور انہیں اپنی کمزوریوں کے دور کرنے کا احساس ہوا۔ آج وہ اچھے اور کامیاب شہری کی طرح زندگی گزار رہے ہیں اور یقین ہے کہ وہ ہمارے حق میں دعائے خیر بھی کر دیتے ہوں گے۔

طالب علمی کے دور میں ایسے تمام کام اُن کی اہمیت کا احساس کیے بغیر ظاہر ہے کہ غیر شعوری طور پر خود بخود کرتے تھے۔

روزمرہ زندگی کے ایسے کتنے ہی معمولی معمولی واقعات ہیں جنہیں نظرانداز کرنے یا خواہ مخواہ اچھالنے سے تعلقات بن یا بگڑ سکتے ہیں۔ مثلاً کسی محفل میں اور لوگوں کے ساتھ، ہم بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب، دیر سے تشریف لاتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ لوگوں کو پھلانگتے پھلانگتے، نمایاں جگہ پر بیٹھنے کی خواہش کے ساتھ، سیلاب کی طرح تیزی سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے چلتے ہوئے ہماری پیٹھ پر بھی ایک لات جمائی۔ ہم ردعمل کے طور پر پلٹ کر دیکھتے ہیں اور بے ساختہ ہماری زبان سے "معاف کیجیے" کے الفاظ نکل پڑتے ہیں۔ وہ بیچارے اپنی اس بدتمیزی کے احساس کے ساتھ کھسیانے ہو کر ٹھہر جاتے ہیں اور ہمارے ہی قریب دبو اور بے بس، چپ چاپ جگہ نکالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کچھ لوگ باتیں کرتے ہیں تو ایسے جیسے فوارے چھوٹ رہے ہوں اور پھر ایسے حضرات پان چبانے کے شغل کے عادی ہوں تو وہ ہر جا بیت سرخ سرخ چھینٹیں اڑانے لگتے ہیں۔ گفتگو کرنے والے ایسے حضرات سے ہم بہت احتیاط کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں کہ جب کبھی انھیں دیکھتے ہیں فوراً اپنی بُری عادت کو محسوس کر لیتے ہیں۔ دونوں طرف احتیاط کے اس التزام اور اہتمام کے ساتھ ساتھ دلوں کے درمیان فاصلے کبھی پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہر مرتبہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پہلے سے کہیں زیادہ قریب آگئے ہیں کیونکہ ہم نے ان کی کمزوری کو ہمیشہ اپنی کمزوری کے سبب میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ پان کھانے کی عادت نہ چھوٹنے پر بہت ہی ملال اور شرمندگی کا اظہار کیا جس کا ہمارے ان سے تعلق پر ہمیشہ اچھا ہی اثر ہوا۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے نا

عداوت سے سب مارنا جانتے ہیں
مجھے تو کسی کی عداوت نے مارا

تو بھی زندگی کے بعض معاملات میں، اگر ہم بڑوں کو بُرا نہ سمجھتے ہوئے، ان کی بُرائی کو دور کرنے کی

کبھی اجازت کے ساتھ اور زیادہ تر بغیر اجازت امرود توڑے جاتے ہیں۔ بچوں کی یہ شرارتیں کبھی کبھی ان کے بڑوں کے دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات میں بدمزگی کا سبب بھی بنتی ہیں لیکن ہمارے پڑوسی ہما (خدا انہیں اچھا رکھے) بڑے صاحب دل قسم کے آدمی واقع ہوتے ہیں۔ کئی برس تک ہی مصیبت کرتے رہے۔ پھر اس گزبڑ ہنگامے اور آئے دن کے نت نئے جھگڑوں کی روک تھام کے بارے میں وہ سنجیدگی سے سوچتے رہے۔ بالآخر ایک روز صبح اٹھکر ہم نے دیکھا کہ چند مزدور امرود کے اس درخت کو گرانے کے کام میں مصروف ہیں' شام ہوتے ہوتے' پورا درخت' بیخ و بن سے نکال کر پھینک دیا گیا۔ پوچھنے پر اس "نیک" یعنی ہمارے خوش اخلاق پڑوسی نے بڑے ہی اطمینان سے جواب دیا کہ میں اچھے تعلقات کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہو چلا تھا کہ اس درخت کی خاطر کہیں دوستی کا پودا نہ مرجھا جائے۔ اب تک جو بھی نے منٹے جھگڑے ہوتے' اس کا باعث میں اور صرف میں ہی تھا فتنہ کی جڑ تو میرے گھر میں تھی۔ آج میں نے یہ جڑ ہی کاٹ دی۔

جڑ کٹ گئی کل شور و شر کی

دوستوں سے بے تکلفی بھی بعض اوقات وبال جان ہو جاتی ہے "الفرض مقراض المحبت" سنتے آئے تھے اس کے معنوں سے بھی ہم کچھ کچھ واقف ہو چکے تھے۔ لیکن جناب! وہ آدمی پیدا کیا جس سے غلطی سرزد نہ ہو۔ ہم نے اپنی خوش اخلاقی سے جلد ہی دوستوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر لیا جن میں سے بعض تو خلوص اور محبت کے مارے' ہمارے راستہ میں' بس بچھے جاتے تھے اب چند دوستوں کی طرف سے آہستہ آہستہ معاملہ اور قرض حسنہ کے مطالبوں کی وجہ سے ہماری ذہنی الجھن میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا جب پانی سر سے اونچا ہونا شروع ہوا۔ یعنی ہماری سخاوت حد سے بڑھ گئی اور ایسے آثار ظاہر ہونے لگے کہ اگر ہم "وضعداری" کے ساتھ اس روش پر قائم رہے تو پھر غالب کی طرح فقیروں کا بھیس بنا کر نہیں بلکہ سچ مچ کے فقیر بن کر ہمیں بھی "تماشائے اہل کرم" دیکھنا پڑے گا تو ہم چونکے۔ حالی کا شعر یاد آیا۔

باقی صفحہ ۲۶

کتاب کا نام : تابدار (شعری مجموعہ)
شاعر کا نام : جناب اسحاق ملک
قیمت : تیس روپے (Rs 30/=)
تبصرہ نگار : مومن خاں شوق

شاہ اسحاق ملک کا سلسلۂ نسب حضرت سید شاہ محمد ملتانی قادری بیدر شریف ضلع کرناٹک سے جا ملتا ہے۔ والد محترم کا نام سید شاہ محمد ابراہیم قادری (مرحوم) تھا۔ اسحاق ملک اپنے قلمی نام سے ہی جانے پہچانے جاتے ہیں، اصل نام شاہ محمد اسحاق قادری الملتانی ہے۔ شاعری ورثے میں ملی ہے۔ آپ حیدرآباد کے ممتاز استاد سخن جناب حمید رونق کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔

اسحاق ملک کا پہلا شعری مجموعہ " نو شگفتہ " ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ دوسرا مجموعہ کلام " تابدار " ہے۔ " تابدار " میں حضرت عمادؔ بارہ بنکوی نے ان کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ موصوف میں ایک اچھے غزل گو شاعر کی پوری صلاحیتیں ہیں۔ اسی لیے ان کی لگن، خلوص اور محنت پر مجھے یقین ہے کہ شاعری میں اپنے نام کو ہمیشہ اونچا رکھیں گے۔ ڈاکٹر راہی قریشی لکھتے ہیں کہ " جناب اسحاق ملک کی شاعری ان کی سادگیٔ طبع کی آئینہ دار اور ان کی سخت کوشی کی ترجمان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا عزم و استقلال ان کے کلام کو مزید تنوع بخشے گا۔" اور ڈاکٹر راہی بہادر گڑ صاحب کا کہنا ہے کہ " اسحاق ملک کی شاعری سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ وہ ایک طرف روایت کی پابندیوں کا شکار نہیں ہے اور دوسری طرف اس پر زندگی بھرپور طاقت سے یلغار کرتی ہے۔"

میرے خیال میں شاعری انسان کے داخلی اور خارجی جذبہ کا عکاس ہے۔ ہر زبان کے ادب بالخصوص شاعری اور اس کے جاننے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے جد اور ہم عصر دوسری زبانوں کے تخلیقی ارتقا

روشناس ہوں تاکہ انہیں یہ معلوم ہو کہ اپنے ملک کی دوسری رائج زبانوں میں تخلیقی عمل کی نوعیت کیا ہے۔

" تابلار " کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسحاق ملک غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی لیکن بنیادی طور سے غزل گو شاعر ہیں ۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ان کا اپنا مخصوص لب و لہجہ بہت واضح ہے۔ ان کے یہاں مسائل کا ادراک محرومی کا درد اور مصائب کا ذکر سب کچھ ہے لیکن مایوسی نہیں وہ ہمیشہ پُرامید نظر آتے ہیں ۔ اپنے جذبات کا اظہار سادگی کے ساتھ اور موثر انداز میں کرتے ہیں بحیثیت مجموعی " تابلار " ایک اچھی کاوش ہے ۔ کتابت و طباعت ٹھیک ہے ۔ اچھوتے موضوعات سادگی اور پُرکاری کا امتزاج دیکھنا ہو تو " تابلار " کا مطالعہ ضرور کیجئے گا ۔ نمونے کے طور پر اشعار ملاحظہ کریں ۔

غم سارے تسلیم الٰہی !
غم سہنے کی طاقت دینا

اللہ گر ملک مجھے توفیق نیک دے
ٹوٹے دلوں کا آسرا بن کر دکھاؤں گا

آپ کے در پہ کوئی آکے کھڑا ہے کب سے
دیکھئے یہ کوئی محتاج نظر لگتا ہے

بس یہی اک وقت کا فرمان ہونا چاہیئے
جو کسی مذہب کا ، پر انسان ہونا چاہیئے

ہر دور میں ، ہر حال ترے ساتھ رہا ہوں
پہچان مجھے زندگی میں کون ہوں کیا ہوں

وہ مرے سامنے آجائیں پشیماں ہو کر
[illegible]

دولت اک شئے ہے ملک نزاکت بدلنے والی
اس سے اپنا بھی پرایا ہے خدا خیر کرے

لوگ لکھے عام جو تعریف کے پل باندھو گے
سستے داموں مری پہچان کا سودا ہو گا

ظلمتوں میں گھرا ہوا ہاتھوں میں
آؤ پھر نے کے روشنی آؤ

مسکرا کر آپ نے دیکھا مجھے
آج کچھ جینے کی صورت ہو گئی

دشمنی ہو تو احتیاط اچھی
دوستی ہو تو فاصلہ رکھئے

نظموں میں "نغمہ زندہ ہے"، "شاید"، "احساس"، "ہمسفر کے نام" "نیا سال" مزدور اور "میرا ہندوستان" پُر اثر ہیں۔

اُمید ہے ادبی حلقوں میں "تابدار" کی قدر و منزلت ہو گی۔

ملاحظہ ہو ۲۳

پھر اوروں کے تکتے پھرو گے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

سہاگ یہاں بھی واقعی قصہ اپنا ہی نکل آیا۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ نہ ہم اس طرح تعمیل سامنے کو رنے اور نہ تعمیل ہر ملاقاتی کو مجسم سوال سمجھ کر خواہ اس سے "بھکاری" ہوتے کرو نہ ہو یہ کچھ نہ کچھ مانگنے ہی کے لیے آیا ہو گا۔

(ملاحظہ ہو انتخاب ۲۶/۱۰/۶۶ سے ماخوذ)

پروفیسر اے۔ آر۔ ظفر
سابق صدر شعبہ بوٹانی (عثمانیہ یونیورسٹی)

○

ٹکنالوجی ترقی کا ماحول پر اثر

میلان میں گذشتہ ہفتہ ماحولیات پر عالمی کانگریس منعقد ہوئی جس میں یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ زمین گرم ہو رہی ہے اور ماحولیات کا توازن بدل رہا ہے۔ ٹکنالوجی کی ترقی نے ماحولیاتی تحفظ کو بدل دیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں پروفیسر ظفر صاحب نے زمین اور اپنی زمین کے تعلق سے ہمیں اپنی انفرادی ذمہ داریاں بتلائی ہیں۔ (ادارہ سیاست)

کرہ ارض کے ماحولی تحفظ پر بلائی گئی ایک عالمی بین الاقوامی کانفرنس کے اختتامی خطبہ میں اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری بطرس غالی نے ایک نہایت پرمعنی بات کہی تھی کہ " اپنے ہمسائے سے محبت کرو کے انجیلی اصول کی طرح ہمیں اپنی زمین سے محبت کرو کا اصول اپنانا ہے" اس موقع پر مجھے ماحولیات کی کلاس میں پوچھے گئے ایک سوال کی یاد تازہ ہو گئی۔ لیکچر کرہ ارض کے وسائل پر تھا اور اس موضوع کے بحث کے دوران میں اکثر کہتا رہا تھا کہ معاشی ترقی کے لیے ٹکنالوجی ضروری ہے لیکن ہر ٹکنالوجی ترقی ماحولیاتی مسائل کا باعث بنتی ہے جنہیں ہم حل کرنے کے لیے نئی ٹکنالوجی وضع کرلیتے ہیں یہ نئی ٹکنالوجی بھی نت نئے ماحولیاتی مسائل کو جنم دیتی ہے۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ٹکنالوجی سے پیدا کردہ ماحولیاتی [illegible] ٹکنالوجی ہی کے ذریعے حل نہیں کیے جا سکتے۔ انسان کو معاشی ترقی

اور معیار زندگی کے حدود متعین کرنے ہوں گے جن پر پہنچ کر قناعت پسندی کا سہارا
لینا ہوگا اور قناعت پسندی کا سبق سائنس اور ٹکنالوجی نہیں سکھاتے مذہب سکھا
ہیں اس منطق کی گہرائی کو پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے ایک طالب علم نے کہا تھا "سائنس
سائنس ہے اور مذہب مذہب، خدا کو سائنس اور ٹکنالوجی میں الجھانا مناسب نہیں ہے"
اس وقت میں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں بہت کچھ کہا تھا نہیں معلوم وہ طالب علم
قائل ہوا یا نہیں لیکن میرے ذہن میں یہ سوال گاہے بگاہے ابھرتا ہی رہا کہ کرہ ارض
کی ماحولیات کو سنوارنے میں مذہب اور مذہبی رہنما کیا رول ادا کرسکتے ہیں؟ ہم کلام
اور ارشاد نبوی سے اس ضمن میں کیا رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں؟ بادی النظر میں تو الہام
ہوتا ہے کہ انسان کے خمیر میں تخریب سے زیادہ تعمیر کی صلاحیت پوشیدہ ہے۔ جس کا اظہار
اس آیت کریمہ سے ہوتا ہے۔

واذقال ربك للملكة انی جاعل فی الارض خليفة ، قالو
اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدما ونحن نسبح بحمدك
ونقدس لك، قال انی اعلم مالا تعلمون ٥ (البقرہ آیت نمبر ۳۰)

مطلب و معانی :۔ مالک کائنات نے جب انسان کو زمین پر اپنا نائب (خلیفہ) بنانے کا
ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے یہ خدشہ محسوس کیا کہ انسان زمینی نظام کو بگاڑنے اور تخریب
کرنے کا باعث ہوگا۔ اس خدشہ کے ازالہ کے لیے کہا گیا کہ تم نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں
کیا اس ایقان الٰہی میں یہ مضمر نہیں ہے کہ انسان کے خمیر میں زمینی نظام کو بگاڑنے سے
سنوارنے کی صلاحیت ودیعت کردی گئی ہے؟ اس پس منظر میں زمین کو سنوارنا ہمارا فرض
بن جاتا ہے۔ اور دیگر فرائض کی ادائیگی کے رہنمایانہ اصولوں کی طرح اس عظیم فرض کی ادائیگی
کے اصول بھی ہمیں کلام پاک اور حیات نبوی میں ہی تلاش کرنے ہوں گے۔ غور کیجیے سورہ الحجر
آیت نمبر ۲۱

وان من شئی الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم ۔
مطلب ومعانی ۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جسکے خزانے اللہ کے پاس نہ ہوں۔ لیکن جس چیز کو بھی وہ نازل کرتا ہے۔ ایک مقررہ مقدار ہی میں نازل کرتا ہے۔
اور الانعام کی آخری آیت (نمبر ۱۶۵) کا پہلا جز۔
وھوالذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجٰت لیبلوکم فی ما اٰتٰکم ۔
مطلب ومعانی اللہ ہی ہے جس نے تمام انسانوں کو (کسی ایک فرد یا قوم کو نہیں) زمین کا خلیفہ (مالک نہیں) بنایا اور اسی ملوکات میں سے بہت سی چیزوں کے تصرف کا ان کی اپنی اہلیت کے لیے لحاظ اختیار بھی دیا۔ اس میں انسان کی آزمائش ہے۔
ان دونوں آیات کریمہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کو عطاکردہ قدرتی خزانے (زیر زمینی اور بر زمینی وسائل مثلاً مٹی، پانی، ہوا، معدنیات معدنی تیل، جنگلات وغیرہ وغیرہ) محدود ہیں ۔ان کے تصرف کا انسان کو اختیار بھی دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ اس کی عقل سلیم، ذہانت اور دور اندیشی کا امتحان بھی ہے بلاشبہ انسان نے اس وسائل کی کھوج میں اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کے استعمال میں اس سے بے اعتدالیاں سرزد ہوتی ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ حال حال تک ان وسائل کو لا محدود سمجھتا تھا۔ لیکن تحقیق کی روشنی میں وہ اب جان چکا ہے کہ صنعتی پیدا اور وسائل کا استعمال اگر یونہی بے دریغ ہوتا رہا تو نہ صرف موجودہ تہذیب بلکہ خود انسان کی بقا کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ انسان آج ان خزانوں کے کفایتی استعمال اور حفاظت کی راہیں تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔ یہ آگہی خود انسان کی سوجھ بوجھ اور اس کی تعمیری سوچ کا ثبوت ہے۔

[illegible]

"لبیک" جو حج کے دوران بارہا بآواز بلند دہرایا جانے والا کلمہ ہے۔ لبیک کا آخری جز ملاحظہ فرمائیں۔

ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک ہ

مطلب و معنی۔ بے شک ساری تعریفیں اور نعمتیں تیرے (اللہ) ہی کے لیے ہیں۔ تیرا (اللہ کا) کوئی شریک نہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ آخر یہ کلمہ صرف حج کے لیے ہی مخصوص کیوں ہے؟ اور پھر یہ بآواز بلند کیوں دہرایا جاتا ہے؟ بین السطور میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انفرادی اور اجتماعی (بین الاقوامی) دونوں ہی سطحوں پر ایک اعلان اور عہد نامہ ہے جو وسائل کو خدا کی نعمتیں قرار دے کر انکے دانائی سے استعمال کی ترغیب دیتا ہے

رسول کریم نے تمام احکام خداوندی کو روزمرہ کی زندگی میں برت کر دکھایا ہے۔ اور وسائل کے استعمال میں احتیاط کرنا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ آپ نے سعد بن ابی وقاص کو وضو میں زیادہ پانی استعمال کرتے دیکھ کر ایسا کرنے سے منع فرمایا اور یہ بھی وضاحت کر دی کہ پانی کی وافر مقدار موجود ہونے کے باوجود غیر ضروری پانی بہانا اسراف ہے۔ (مسند احمد سنن ابن ماجہ۔ اختصار کی خاطر الفاظ تبدیلی کے ساتھ) سطحی طور پر سوچنے والا اس احتیاط کی وجہ ریگزار عرب میں پانی کی کمی پر قیاس کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہر خطہ زمین پر میٹھے پانی کی کمی ہی ہے۔ اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ روئے زمین پر موجود پانی کے ذخیرہ کا کم و بیش ۹۸ فیصد سمندروں میں ہے۔ جو معدودے چند استثنائی صورتوں کے قابل استعمال نہیں ہے باقی ماندہ دو فیصد پانی کا زائد از نصف حصہ قطبین اور پہاڑی علاقوں میں برف کی شکل میں منجمد ہے۔ نتیجتاً ایک فیصد سے بھی کم پانی بنی نوع انسان کو میسر ہے جس سے اس کی روزمرہ کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ ان ضروریات میں زراعت بھی شامل ہے اور صنعت و حرفت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین ماحولیات میٹھے پانی کو نہایت قیمتی اور کم یاب اثاثہ تصور کرتے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ انسان نے اپنی ذہانت

قدرت میں پائے جانے والی کئی اشیا کا نعم البدل دریافت کر لیا ہے لیکن پانی کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں رسول اکرم کی سعد بن ابی وقاص کو کی ہوئی تاکید کا اطلاق ہر خطۂ زمین پر ہو جاتا ہے۔

ماحول کو صاف ستھرا بنائے رکھنے میں پودوں کی افادیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ سائنسی تحقیق جوں جوں آگے بڑھے گی ماحول نباتات اور ان کے باہمی رشتوں کا تانا بانا زیادہ اُجاگر ہوتا جائے گا لیکن اس تانے بانے میں ایک اور کڑی بھی ہے جو سائنس کے دائرہ تحقیق سے باہر ہے اور وہ ہے انسان کا پودوں سے روحانی رشتہ جو ہمارے مذہبی رہنماؤں اور محققین کی توجہ سے ہی پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ غور کریں خود جنت کو جس کی نعمتوں کی نوعیت ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے ایسے باغ سے مشابہت دی گئی ہے جس میں درخت اپنی سرسبزی و شادابی سے زمین کو ڈھک دیں۔ (مولانا نعمانی۔ لغات القرآن جلد دوم) اور وہ پہاڑی جس پر سیدنا موسیٰ کو پیمبری ملی۔ جس پر انہیں تجلی خداوندی سے نوازا گیا اور جس پر انہیں احکامات توریت کی تختیاں عطا ہوئیں کوئی خشک و ویران پہاڑی نہیں تھی بلکہ نہایت سرسبز و شاداب پہاڑی تھی جس میں انجیر، زیتون اور چرنجی کے درخت لہلہاتے تھے۔ نیز اس کلیم کا مبدا جس کی وجہ موسیٰ علیہ السلام "کلیم اللہ" کہلائے ایک درخت یا درختوں کا جھنڈ ہی تھا۔ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید درخت نہ کاٹنے کو اور گھاس نہ اکھاڑنے کو شعائر اللہ یعنی دینی ذرائع اور نشانات میں شمار کرتے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں درخت لگانا اور ان کی سرسبزی و شادابی بنائے رکھنا ہمارا دینی فرض بن جاتا ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے مسجد سے زیادہ موزوں مقام اور کون سا ہو سکتا ہے۔ جو ہماری مسجدیں بلا شبہ پاک و صاف ہوتی ہیں لیکن ان میں مناسب انداز سے لگے ہوئے ہرے بھرے پودے ان کی نفاست اور پاکیزگی کو دو بالا کر سکتے ہیں۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں جگہ کا مسئلہ ضرور پیدا ہوگا۔ کیونکہ شہروں کی اکثر و بیشتر مساجد بفضل خدا نمازیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر

اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ آج درون خانہ (Indoor) پودوں کی بیسیوں قسمیں دستیاب ہیں جو مسجدوں کی زینت بن سکتی ہیں۔ مساجد کے صحنوں میں کم جگہ گھیرنے والے لیکن دراز قامت پیڑ مثلاً Thuja، Ashoka، Araucaria اور Euclyptus لگائے جا سکتے ہیں۔ آج کل گھروں کے باہر احاطہ کی دیواروں سے متصل دو تین فٹ چوڑی پٹی پر خوبرو پودوں کے لگانے کا چلن عام ہو گیا ہے۔ اس سے نہ صرف گھر کی بلکہ راستہ کی رونق بھی بڑھ جاتی ہے اسے کارپوریشن اعتراض بھی نہیں کرتا اگر ہم مسجدوں کے باہر بھی اس طرح کی سبز پٹیاں اگانے کو اپنا شعار بنا لیں تو یہ ہماری روحانی اور ماحولیاتی دونوں ہی ضرورتوں کی تکمیل کا باعث ہوگا۔

ہرا بھرا بنائے رکھنے کی ضرورت ہمارے قبرستانوں کو بھی ہے۔ نہ معلوم ہم اس حدیث نبوی کی گہرائی کو پوری طرح پہنچ پاتے بھی یا نہیں جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے رسول کریم نے صاحب قبر پر عذاب کی شدت کو محسوس کیا تو اس پر ایک سبز ٹہنی لگا دی اور کہا کہ ٹہنی سوکھنے تک وہ عذاب قبر سے محفوظ رہے گا۔ ایک اور حدیث نبوی ہے کہ کسی شخص کو قبر سے ٹیک لگاتا دیکھ کر آپ نے کہا مردے کو عذاب نہ دے۔ ان احادیث کی روشنی میں قبرستانوں کا احترام اور انہیں سرسبز بنائے رکھنا عبادت کے حدود کو چھو لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے اکثر وبیشتر قبرستان احاطہ بند نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو انسانی دست درازی سے محفوظ ہیں نہ ہی جانوروں کی دسترس سے باہر۔ جب بھی یہ مسائل اٹھائے جاتے ہیں بات اوقاف کی لاپرواہی اور پیسے کی کمی میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ اگر قبرستانوں کی احاطہ بندی مناسب پیڑوں اور جھاڑیوں سے کر دی جائے تو یہ کم خرچ بالا نشین کے مصداق ہوگا۔ ساتھ ہی قبروں کی ایک گونا گوں ترتیب سے قبرستانوں کی سدابہار سایہ دار پودوں سے تزئین ماحولیاتی ضرورت کو بھی پورا کرے گی اور روحانی آسودگی کا بھی باعث ہوگی۔ اس پروجیکٹ میں محکمہ جنگلات اور [illegible] کی تحریکوں سے بھی تعاون مل سکتا ہے۔

(روزنامہ سیاست کے شکریہ کے ساتھ)

کشن ناتھ

متوازن ترقی اور ماحولیاتی مسائل

انسانی مصروفیات کے اس دور میں صنعتی میدان بالخصوص ماحولیات کے لیے سنگین خطرہ بننے کا باعث ہو رہا ہے کیونکہ خام اشیا اور توانائی جو کہ مختلف وسائل سے حاصل کی جاتی ہیں ان کو یکجا کر کے پیداوار میں تبدیل کیا جاتا ہے اس طریقہ عمل کے پس پشت ناکارہ چیزوں کی ایک بڑی مقدار ٹھوس، مائع اور گیس کی شکل میں رونما ہوتی ہے اسطرح صنعتوں کی بدولت خارجی اشیا قریب و جوار میں رہتے بسنے والے لوگوں کی صحت کیلئے خطرہ بن جاتی ہیں۔ عالمی سطح پر "اوزون" فضائی پرت کی حرارت میں اضافہ ترشی بارش، خارجی مائعات کا بہاؤ اپنے فوری اثر کے تحت قرب و جوار کے زیر زمین پانی کے علاوہ دریائی پانی کو سیکڑوں میل دور تک آلودہ کرنے کا باعث بنتے ہیں نیز ٹھوس کی شکل میں پائی گئی ناکارہ اشیا بھی سڑ گل کر فضائی آلودگی کے خطرات سے مختلف مسائل وجود میں لانے کا باعث ہوتی ہیں۔

ماحولیاتی مہم :

ماحولیاتی مہم میں سب سے پہلے مرحلہ کے طور پر ماحولیاتی آلودگی کو دور کرنے کے اقدامات کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابتداً ناکارہ اشیا کے خاتمہ کو ضروری تصور کیا گیا لیکن وقت کے بدلتے ہوئے حالات میں ناکارہ اشیا کو صرف

ناکارہ سمجھنے کی بجائے اشیا کو ناکارہ ہونے سے بچائے جانے کی ترغیب ہوتی۔
چنانچہ ساری دنیا میں صفائی کی ٹکنالوجی کے استعمال کو فروغ دیکر ناکارہ اشیا پیدا
نہ ہونے کے طریقہ عمل کو اپنا یا گیا۔ بہرحال ناکارہ اشیا کے وجود میں آنے کو کم کرنے کی ترکیبوں
اور صفائی کی ٹکنالوجیوں کے استعمال کی بدولت ہم ناکارہ اشیا کو ختم کرنے کے قابل ہوسکے۔
ناکارہ اشیا کو ختم کرنے کے سلسلہ میں ناکارہ اشیا کو مکرر استعمال میں لاکر ان سے
افادہ حاصل کیا گیا۔ ماہرین ماحولیات کے جدید نظریات کے تحت ناکارہ اشیا کو مکرر
استعمال میں لانے کی ہیئت ترکیبی کے تحت انہیں انواع و اقسام کی اکائیوں سے مربوط کیا گیا
جس کے نتیجہ میں ایک یونٹ کی ناکارہ اشیا کو دوسرے یونٹ کیلئے قابل استعمال بنانے
کی وجہ سے ناکارہ اشیاء میں کمی ممکن ہوسکتی ہے۔ پچھلے لاکھوں سال کے دوران ناکارہ
اشیا جہاں قدرتی طور پر ایکدوسرے کی ضرورتوں کو پورا کرکے ختم ہوا کرتی تھیں وہاں
انسان نے مصنوعی طریقوں کو اپنا کر ناکارہ اشیا کو قابل افادہ اور قابل استفادہ بنا دیا
دنیا کے تمام جانداروں کے مابین غذائی وابستگی کا تسلسل قدرتاً پایا جاتا ہے انسان
نے اس وابستگی کے دائرہ کار کو مصنوعی طریقوں میں بھی اپنانے کا کام انجام دیا ہے چنانچہ
ترقی یافتہ ممالک کے صنعتی میدانوں میں بڑے پیمانے پر اسی طریقہ کار کو روبہ عمل لایا جارہا ہے

ترقیاتی تسلسل :-

جہاں تک ترقیاتی تسلسل کا تعلق ہے ہندوستان اور دیگر ممالک میں ماحولیات
اور ترقیات کے تقابلی میدان میں مسائل کا حل تلاش کرنے کی جانب توجہ مرکوز کیگئی ہے
اور یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ماحول اور ترقی دونوں کا قریبی تعلق ہے اور دونوں چیزیں ایک
دوسرے کیلئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسطرح سے ایک جمہوری ملک میں غریب تر
عوام کے دلوں میں بہتر زندگی گزارنے کی خواہش اور جذبات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا
بالکلیہ اسی انداز میں ملک کی ترقی کے نام پر ماحولیاتی کیفیت کو برباد نہیں کیا جاسکتا

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ترقیاتی ضرورت اور ماحولیاتی کیفیت کے مابین ایک متوازن آمیزش عمل میں لائی جائے۔ عصر جدید کی آزادانہ معاشی حکمت عملی نے کئی چیلنجوں کو کھڑا کر دیا ہے۔ نئے کاروباری افراد نئی چیزیں بنانے کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں اور نئی چیزیں بنانے کی رغبت پہلے سے ہی موجود صنعتی مراکز کے لئے پرکشش بنی ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں ان مراکز پر دباؤ میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ اسی لیے ہماری حکومت نے ہر نئے پراجکٹ کے لیے ماحولیات کو صاف رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس سے ملک میں صنعتی منصوبہ بندی کا خاطر دوستانہ ماحولیاتی کیفیت سے استفادہ کے مواقع حاصل ہوسکیں گے۔ لہٰذا ہم اس بات پر زور دینگے کہ ہر پراجیکٹ کی تیاری و تعمیر سے قبل ماحولیاتی حالات کی اثر اندازی کا تجزیہ عمل میں لایا جائے کیونکہ نئے صنعتی میدان کے پھیلاؤ کے تحت ملک میں ماحولیات کو بربادی سے محفوظ رکھنا ہی ہمارا بہت بڑا کارنامہ متصور ہوگا۔ ماحولیاتی اثر اندازی میں وسائل کے تحفظ کو بہت بڑا دخل ہے۔ کیونکہ ہمارا ملک ہندوستان نباتاتی حالات کی روشنی میں دنیا کے دولت مند ترین ممالک میں سے ایک ہے لیکن ہم جنگلات کی بربادی، صنعتی دباؤ، اور آبادی میں اضافہ کی وجہ سے اس اہم اور قیمتی دولت سے محروم ہو رہے ہیں اسلئے ہماری حکومت نے قدرتی نباتاتی دولت کو مبدّل ہونے سے محفوظ رکھنے کیلئے وسیع پیمانے پر اقدامات کئے ہیں جس کے نتیجہ میں جنگلاتی علاقوں کا تحفظ ہماری کامیابی ہے اور حکومت کا فقید المثال کارنامہ ہے۔

پریس انفارمیشن بیورو۔

سیلولر مواصلاتی نظام

ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں بھی مواصلاتی نظام کا آغاز ہوا۔ قومی ٹیلی کام پالیسی ۱۹۹۴ء کے اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان کا ٹیلی کام شعبہ ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ حکومت نے اس اہم انفراسٹرکچر کو ترقی دینے کے لیے سب سے زیادہ ترجیح دی ہے اور ملک بھر میں سیلولر موبائیل اور ریڈیو پیجنگ سروس کو ۱۹۹۵ء کے ختم تک شروع کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس طرح ہندوستان سیلولر ٹیکنالوجی کے ایک نئے دور میں داخل ہو جائے گا۔

سیلولر موبائیل سروس کو چلانے کے لیے ہندوستانی رجسٹرڈ کمپنیوں کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ پہلے مرحلے میں آٹھ رجسٹرڈ کمپنیوں کو اس سروس کو چار بڑے شہروں بمبئی، دہلی، کلکتہ اور مدراس میں رائج کرنے کے لیے لائسنس جاری کیے گئے۔ دوسرے مرحلے میں ملک کے بقیہ حصوں میں سیلولر موبائیل سروس کے لیے حکومت نے کمپنیوں کے انتخاب کے لیے ٹینڈر جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

سارے ملک میں سیلولر سروس چلانے کے لئے اُمید ہے کہ ٹینڈر جنوری ۱۹۹۵ء کے دوسرے ہفتہ تک جاری کیا جائے گا۔ نیشنل ٹیلی کام پالیسی ملکی ٹکنالوجی کی ہمت افزائی کرنے اور اندرون ملک تحقیق و ترقی کی ... اک ...

پریس انفارمیشن بیورو۔

غذائی اشیا تیار کرنے کی صنعت

زراعت اور زرعی پیداوار سے غذائی اشیا تیار کرنے والے شعبے انواع واقسام اور تجارتی امور کے ذریعہ دیہی حیثیت کو فروغ دینے کیلئے اہم ثابت ہوتے ہیں۔ ضرورت، حالات کی روشنی میں حکومت ایک غذائی تیاری کا مرکز قائم کر رہی ہے تاکہ نئی پیداواروں کے حصول، نئے طریقوں، نئی مشینری کو ترقی دی جائے۔ جس کے نتیجہ میں غذائی اشیا کی تیاری کو موثر اور معیاری بنایا جاسکے۔ اس مرکز میں مرکزی غذائی ٹکنالوجی تحقیقاتی ادارہ میسور میں ابتدائی سرگرمی شروع کیگئی ہے اور کام کی انجام دہی اچھے انداز میں کیا جانے والا ہے۔ حکومت مختلف قسم کی پیداواروں کی تیاری بشمول رواجی غذائی پیداوار، سویابین پر مشتمل پیداوار، فصل حاصل کرنے کے بعد کے کام، پھلوں اور ترکاریوں کی پیداوار اور پیکیجنگ کے آر اینڈ ڈی کی کوششوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کر رہی ہے۔ چنانچہ ان صنعتوں سے وابستہ کاروباری افراد کو ٹکنالوجی کے استعمال، مارکٹنگ کے مواقع، گہرے سمندر میں ماہی گیری کے وسائل سے استفادہ کرنے کیلئے بھی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ رواجی پیشہ ور ماہی گیروں کے مفادات کے تحفظ اور ساتھ ساتھ ماحولیات کی حفاظت کے پیش نظر حکومت نے اپنی حکمت عملی کی نظرثانی کرتے ہوئے گہرے سمندر میں ماہی گیری کیلئے موٹر نصب شدہ کشتیوں، استعمال کرنے کی اجازت دے کر کافی حوصلہ افزائی کی ہے۔ دیہی کاروباری افراد بشمول

ایتم، درج فہرست طبقات و قبائل کو غذائی اشیا کی تیاری میں مدد دینے کے لیے
ائی اشیا کی تیاری کے تربیتی مراکز قائم کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ آٹھویں منصوبے کی
بتدا کے بعد سے دوسو پچاس تربیتی مراکز کے نشانے کے مقابلے میں ۱۲۷ تربیتی مراکز کا
یام عمل میں لایا گیا ہے پچھلے تین سال کی مدت کے دوران ایسے اقدامات کا ردعمل
اتی رہا ہے۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۹۲ء تک داخل کردہ ۲۸۷۲ صنعتی میمورنڈا کی رو سے گھریلو
سرمایہ کاروں نے ۴۷ر۳۶۲۲ کروڑ روپیوں کی سرمایہ کاری کی ہے جن کی عمل آوری پر
۰ر۵ لاکھ افراد کو راست طور پر روزگار کے مواقع پیدا ہونگے۔ ان میں سے ۱۴۳۴
میمورنڈا اس غیر شہری علاقوں سے متعلق ہیں اور ۱۵۱۳۵ کروڑ سرمایہ کی مشغولیت
۵۶ لاکھ افراد کو راست روزگار فراہم ہوسکیگا چنانچہ ۳۷۱ تحریکات پر مشتمل تخمیناً
۶۴ر۳ کروڑ کی سرمایہ کاری پر منطبق جملہ ۵۶۳۴۸ لوگوں کو روزگار فراہم کیا گیا ہے۔
ہندوستان میں بیرونی سرمایہ کاروں نے اس شعبہ میں کافی دلچسپی لی ہے۔ اور نومبر
۱۹۹۲ء تک ۵۷۷ تحریکات پر مشتمل چھ سو بیس کروڑ روپیہ کی سرمایہ کاری سے ۲ر۱
لاکھ افراد کو روزگار منظور کیا گیا ہے اور اس شعبے میں بھی غیر شہری علاقوں میں صنعتوں کے
قیام کی پانچ سو سات تحریکات سے وابستہ چھ ہزار سات سو پچاس کروڑ روپیوں
کی سرمایہ کاری ہوئی ہے جس میں دو ہزار پانچ سو پندرہ کروڑ روپیہ راست بیرونی
سرمایہ کاری ہے جو ملک کی منظورہ بیرونی سرمایہ کاری کا گیارہ فی صد حصہ ہے ان میں
۵ تحریکات پر عمل آوری کے ذریعہ تقریباً ۷۴ر۰ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کیا گیا ہے۔
شرمپ پیداوار اور اس کے مختلف مراحل پر نمش کے قیام کے لیے حکومت نے حوصلہ افزائی کی
ہے اور شرمپ پیداوار برآمد کرنے والے مختلف یونٹس کی تحریکات کی روشنی میں ۱۳ر۱ لاکھ
شرمپس کی کاشت اور متعلقہ مراحل کی منظوری دی گئی ہے جن میں سے چند پیداوار حاصل کر چکے
ہیں اور بعض دیگر عمل آوری کی جانب رواں دواں ہیں۔

ای۔ ایکس۔ آئی۔ یو کی آزادانہ حکمت عملی اختیار کرنے کے بعد ۴۳ء۱ ای۔ او۔ یو۔ ایس ذیلی
شعبوں کو ۳۵۷۱ کروڑ روپیوں کی سرمایہ کاری منظور کی گئی ہے اور کل آمدنی کے
ابتدائی پانچ سال کے دوران ان یونٹوں کا برآمداتی نشانہ ۳۱۵۶۸ کروڑ روپیہ ہوگا۔

پچھلے تین سال کے دوران غذائی اشیا تیار کرنے کی صنعت نے مستقل ترقی کی ہے
دھوپ میں سکھائی گئی اور تیل میں تلی گئی اشیا کے علاوہ پھلوں اور ترکاریوں پر
مشتمل تیار غذائی اشیا کی گنجائش جو کہ دسمبر ۱۹۹۱ء میں ۸٫۹۴ لاکھ ٹن ترقی کرکے
دسمبر ۱۹۹۳ء میں ۱۳٫۶ لاکھ ٹن ہو گئی پھلوں اور ترکاریوں کی پیداوار جو ۱۹۹۱ء میں
۲٫۸ لاکھ ٹن تھی دسمبر ۱۹۹۳ء میں ترقی کرکے سات لاکھ ٹن ہو گئی اور پچھلے تین سال
کے دور میں دودھ سے بنائی گئی اشیا کی پیداوار میں سالانہ ۷٪ فیصد کی شرح سے
اضافہ ہوا ہے۔ اسی نوعیت کی ترقی گوشت، پولٹری اور مچھلی سے تیار شدہ غذائی اشیا
طاقتور غذائیں، سویا سے تیار شدہ چیزوں، بیکری کی پیداوار، ہلکی مشروبات اور ہلکی
غذاؤں کی تیاری میں بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ چائے، کافی، مسالوں، پھل، شکر
خوردنی تیل، سمندری پیداوار کے علاوہ دیگر تیار شدہ غذائی اشیا کی برآمدات میں پچھلے تین
سال کے دوران اوسطاً بیس ۲۰٪ کا اضافہ عمل میں آیا ہے چنانچہ ان کی مجموعی برآمدات
جو ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۲۱۲۵ کروڑ روپیوں پر مشتمل تھے ترقی کرکے ۹۲-۱۹۹۳ء میں ۴۰۰۸ کروڑ
روپیوں تک پہنچ گئے۔ یہ رفتار جاریہ سال کے دوران بھی پائی جاتی ہے۔ ان حکمت عملیوں
کی کوشش سے غذائی اشیا تیار کرنے والا شعبہ نہ صرف گھریلو مارکٹ، قیمتی معیاری پیداوار پیش کرےگا
بلکہ مسابقتی، معیاری، غذائی اشیا کی برآمدات کے ذریعہ مستقبل قریب میں ملک کا ایک
عظیم ترین شعبہ بن جائیگا۔

...، آئی بی۔ حیدرآباد

گیاٹ معاہدہ

ہندوستان میں زراعت پر کوئی رکاوٹ نہیں

گیاٹ معاہدہ ایک ایسا ہمہ رخی بین الاقوامی تجارتی معاہدہ ہے جس کی رو سے
...تی ممالک کی جانب سے زرعی پیداوار کی بڑی مقدار میں برآمدات میں حائل رکاوٹوں کو
...سبسیڈی امداد کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ملک کی سطح پر گھریلو امداد کے روپ
...، برآمدات کی خاطر جو سبسیڈی دی جاتی ہے اس کی روشنی میں مقداری اعتبار سے حائل
...وٹوں کو منقلب کیا جاتا ہے۔

...ریلو امداد :۔

تقریباً تمام ممالک زرعی شعبہ کو سبسیڈی کے روپ میں مختلف قسم کی امداد
...کرتے ہیں تاکہ پیداواری لاگت میں کمی ہوسکے۔ اس طرح فراہم کردہ امداد زرعی شعبہ
...لیے گھریلو امداد کہلاتی ہے جس کا شمار یا تخمینہ اوسط پیمانے کی امداد پر کیا جاتا ہے جس
...، دونوں قسم کی پیداواریں شامل ہوتی ہیں جو بازاری قیمت سے وابستہ اور غیر وابستہ
...، بازاری قیمت سے غیر وابستہ پیداوار میں پانی، برقی، کھادیں اور تخم کے علاوہ قرض
...سبسیڈی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ ساری دنیا کے کاشتکاروں کو یکساں زیست کی سہولتیں
...پیمانے کی روشنی میں گیاٹ معاہدہ کے تحت ہندوستانی صنعتوں کے مسائل کو حل

امداد میں کمی کر دی گئی ہے چنانچہ مندرجہ ذیل پروگراموں کو اے۔ ایم۔ ایس میں شامل کرنے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

(۱) عام خدمات مثلاً تحقیقاتی پروگرامس، جراثیم و بیماریوں پر قابو، تربیت، توسیعی و ہدایاتی خدمات، معائنہ، مارکٹنگ اور ترقیاتی خدمات، خام اشیاء کی فراہمی خدمات، اور ماحولیاتی پروگراموں سے وابستہ ڈھانچے،

(۲) تحفظ اغذیہ کی خاطر عوامی سطح پر کیا گیا ذخیرہ۔

(۳) گھریلو غذائی امداد

(۴) پیداوار حاصل کرنے والوں کے لیے مخصوص حالات کے تحت راست امداد

(۵) آمدنی کے بیمہ میں حکومت کی جانب سے مالیاتی اشتراک

(۶) تحفظ آمدنی کے پروگرامس

(۷) قدرتی تباہ کاریوں کی صورت میں امداد کے طور پر دی جانے والی خدمات مذکورہ بالا استثنیات کے علاوہ ترقی پذیر ممالک کے لئے مزید تین استثنائی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں جو اس طرح سے ہیں۔

(۱) سبسیڈی کی سرمایہ کاری۔ جو کاشتکاروں کو دستیاب ہو گی

(۲) زرعی پیداوار کی سبسیڈی جو عام طور پر کم آمدنی والوں یا کم وسائل سے پیداوار حاصل کرتے ہوں۔

(۳) کاشتکاروں کی توجہ غیر قانونی منشیات آور فصلوں سے ہٹاکر دیگر فصلوں کی طرف مبذول کرنے کے لئے گھریلو امداد۔

مندرجہ بالا استثنیات کے علاوہ زرعی پیداوار حاصل کرنے والوں کو دی جانے والی گھریلو امداد میں چھ سال میں ۲۰ فیصد کی کمی کی جائیگی۔ ترقی پذیر ممالک میں اس قسم کی کمی کا عمل عام کمی کے مقابلہ میں دس سال کی مدت میں دو تہائی ہو گی۔ گھریلو

اد میں کمی اس صورت میں کی جائیگی جبکہ کاشتکاروں کو دی جانے والی اے یم ایس
رعی امداد ملک کی جملہ زرعی پیداوار کی مالیت بالترتیب ترقی یافتہ اور ترقی پذیر
لک میں پانچ اور دس فیصد سے تجاوز کر جائے۔ اس قسم کی کمی کو محسوب کرنے کے لئے
یادی مدت ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء ہو گی۔

ہندوستانی طریقہ عمل :-

ہندوستان میں بازاری قیمت پر امداد کے علاوہ دوسری قسم کی
یداواری امداد مہیا نہیں کی جاتی۔ جملہ پیداوار کی مخصوص اے یم ایس امداد سال
۱۹۸۶ء سے سال ۱۹۸۹ء کی بنیاد پر ۲۴۴۲۴ کروڑ منفی رہی۔ اس طرح منفی اعداد وشمار
کی اصل وجہ یہ تھی کہ مذکورہ بنیادی مدت کے دوران تمباکو اور گنے شکر کے سوا باقی تمام
پیداواروں کی بین الاقوامی قیمتیں گھریلو قیمتوں کے مقابلہ میں زیادہ تھیں۔ غیر پیداواری
ص سبسیڈی جو کھادوں، پانی، برقی، تخم اور قرض کے لیے اس بنیادی مدت کے دوران
ی گئی۔ اے یم ایس ۸۱۵۴ کروڑ ہوئی۔ دونوں قسم کی مخصوص پیداواری و غیر پیداواری
اے یم ایس شمار کرنے پر ہمارے ملک میں اے یم ایس ۱۹۸۶ء کروڑ روپے منفی رہی جو کہ
ملہ زرعی پیداواری مالیت میں تخمیناً ۱۸ فیصد منفی تھی۔ اسی لئے ہندوستان گیاٹ معاہدہ
کی روشنی میں زرعی سبسیڈی میں کمی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان
ملک کی مجموعی زرعی پیداوار کی مالیت پر دس فیصد اضافہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

برآمدات پر سبسیڈی :

گیاٹ معاہدہ کے ذریعہ برآمدات پر سبسیڈی میں کمی کرنے کی علامات
اندراج کیا گیا وہ اس طرح ہیں
(۱)۔ برآمدات کی کارکردگی پر راست پابند موازنہ سبسیڈی۔
(۲) سرکاری غیر تجارتی ذخائر کی برآمدات گھریلو مارکٹ میں خریداری کی قیمت سے کمتر قیمت
کی صورت میں۔

(۳) زرعی پیداوار کی برآمدات کے لیے سرکاری طور پر مالیہ کی فراہمی کی صورت میں

(۴) زرعی پیداوار کی مارکٹنگ برآمدات کے لئے سبسیڈی جو پیداوار کے استعمال، معیار کی بلندی اور مختلف ضروری مراحل کے اخراجات کے علاوہ بین الاقوامی ٹرانسپورٹ اور اخراجات باربرداری سے متعلق ہوگی۔

(۵) برآمدات کے لئے اندرون ملک ٹرانسپورٹ و باربرداری اخراجات کے علاوہ جہاز پر لادنے کے لئے ملکی اخراجات کے مقابلہ میں زائد ہونے کی صورت میں

۶۔ برآمداتی پیداوار میں زرعی پیداوار سے متعلق اتفاقی اور غیر یقینی اخراجات پر سبسیڈی کی کمی کرنے کا طریقہ بجٹ کی رقم اور مقداروں پر منحصر ہوگا۔ چنانچہ عمل آوری کی مدت کے دوران بجٹ اور مقداروں میں کمی کی شرح بالترتیب ۳۶ فیصد اور ۲۱ فیصد ہوگی۔ برآمدات سے متعلق غیر مذکورہ سبسیڈی کا مطالبہ نہیں کیا جانا چاہیئے، جبکہ سبسیڈی کے حالات پر اثر انداز ہوتے ہوں مزید برآں ترقی پذیر ممالک کے لئے برآمداتی سبسیڈی مندرجہ بالا ۴ اور ۵ کی صورتوں میں عمل پیرائی کی مدت میں ذمہ داری لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ہندوستان کا رول :

جہاں تک سبسیڈی کے معاملہ میں ہندوستان کا تعلق ہے [illegible] کسی قسم کی سبسیڈی ہندوستان کی جانب سے فراہم نہیں کی جارہی ہے البتہ انکم ٹیکس کی دفعہ ۸۰ ایچ - ایچ - سی کے تحت برآمدات کے منافع کے استثناء کے طور پر صرف ایک برآمداتی سبسیڈی دی جاتی ہے جو کہ مندرجہ بالا سبسیڈی مراعات میں شامل نہیں ہے علاوہ ازیں ہندوستانی زرعی برآمدات کو استثنائی صورت سے استفادہ کرنے کی اس صورت سے فائدہ اٹھانے کی سہولت دی گئی ہے جبکہ ترقی پذیر ملک کو زرعی پیداوار کی مارکٹنگ برآمدات اور بین الاقوامی قیمتوں نیز اندرون ملک ٹرانسپورٹ اور باربرداری

کے ساتھ جہاز میں لادنے کے اخراجات کے لیے سبسڈی کی فراہمی لاحق ہوتی ہے۔

مارکٹ کے مواقع :- گیاٹ معاہدہ کی روشنی میں تمام زرعی پیداواری اشیا کی محافظت کی خاطر مارکٹنگ کے سلسلہ میں سبسڈی درکار ہوتی ہے۔ سردست زرعی پیداواروں کے لیے معمولی شرح پر کسٹمس ڈیوٹی عائد کرنے کی خاطر چھ سال کی مدت کے دوران ۱۵ تا ۳۶ فیصد کمی کی جاتی ہے۔ زرعی پیداوار کی لازمی طور پر محافظت کی صورت میں غیر زمرہ بندی تحدیدات کو زمرہ بندی میں تبدیل کرکے عمل آوری کی مدت کے دوران ۳۶ فیصد اوسطاً کمی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان جیسے ممالک جو تقاضاجات کی ادائی کے سلسلہ میں مقداری تحدیدات سے وابستہ ہوں انہیں زمرہ بندی کی تبدیلی کرنی ضروری نہیں ہے۔ ترقی پذیر ممالک جنہیں ۲۴ فیصد کمی کے استفادہ کی سہولت دی جائے وہ دس سال کے عرصہ میں حاصل کرسکتے ہیں اس قسم کی سہولت کسی ملک کو صرف اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جبکہ درآمدات کو زمرہ بندی کے ذریعہ قابو میں لایا جائے۔

ہندوستانی عمل درآمد :

پیداوار کی مارکٹنگ اور زمرہ بندی کے لئے کمی کا اطلاق صرف ایسی ہی صورتوں میں ہوسکتا ہے جبکہ کوئی ملک مقداری تحدیدات کو زمرہ بندی میں محول کرے۔ ہندوستان میں چونکہ ایسے مواقع حاصل نہیں ہیں اس لیے مارکٹنگ میں کمی کرنے کا پابند نہیں ہے ترقی پذیر ممالک کو پیداواری زمرہ بندی کے اطلاق کی صورتوں میں زرعی پیداوار کی انتہائی حد کو ٹھکرار بنانے کی سہولت دی گئی ہے۔ ہمارے ملک میں ابتدائی پیداوار کو ۱۰۰ فیصد زمرہ بندی کا پابند بنایا گیا ہے اور ۱۵۰ پیداوار سے تیار کردہ اشیا پر اور ۳۰۰ فیصد خوردنی تیل پر زمرہ بندی لازمی قرار دی گئی ہے اس طریقہ عمل سے ہماری زراعت کی محافظت کافی طور پر جی ۔ او ۔ پی مسئلہ کے انعقام کے بعد بھی کی جاسکتی ہے۔

قطعیت :

یوراگوئے راؤنڈ معاہدہ کے تحت ہندوستان زرعی معاملات میں کسی پابندی اختیار نہیں کیا ہے مذکورہ معاہدہ ہماری زرعی ترقیاتی حکمت عملی میں پابندی یا جبر کا اطلاق نہیں کرسکتا۔ متعلق ممالک اپنی سبسیڈی میں کمی کر مارکٹنگ میں اضافہ کرسکتے ہیں جس کی رو سے عالمی مارکٹ میں زرعی پیدا قیمتوں میں اضافہ کا باعث ہوگا اور ہماری برآمدات کو مسابقتی میدان کی سہ حاصل ہو گی۔

فارم نمبر ۴ تحت ضابطہ نمبر ۸

تختہ بابتہ ملکیت وغیرہ برائے ماہنامہ شاداب حیدرآباد، اے پی

مقام اشاعت : دفتر شاداب مکان نمبر ۱۴۷ - ۵ - ۱۱ ریڈہلز حیدرآباد، اے

اوقات اشاعت۔ ماہنامہ

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر اور مالک **محمد قمرالدین صا**

نام، پتہ اور قومیت : 5.147 - ۱۱ ریڈہلز حیدرآباد

میں محمد قمرالدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم واطلاع کی بالکل درست ہیں

محمد قمرالدین صابری یکم مارچ ۹۴

فاطمہ تاج

غزل

پہلو غمِ اُلفت میں ایسے بھی نکلتے ہیں
کچھ تم بھی بدلتے ہو کچھ ہم بھی بدلتے ہیں

اک رشتۂ باہم ہے ہم دونوں میں مدّت سے
تم روز سلگتے ہو ہم روز پگھلتے ہیں

رکھنا ہے اُجالوں کو محفوظ بہ ہر صورت
تنکے تو نشیمن کے ہر شام ہی جلتے ہیں

رفتار پہ ہوتا ہے لغزش کا گماں اکثر
جب نقشِ قدم تیرے ہم دیکھ کے چلتے ہیں

کرتے ہیں تبسم سے ہر حال پذیرائی
کچھ اشکِ الم پھر بھی آنکھوں میں مچلتے ہیں

اعزاز، تغزل کا تم کو ہی نہیں حاصل
الفاظ ہمارے بھی احساس میں ڈھلتے ہیں

معیار ہے یہ اپنا دورانِ سفر اب بھی
ہم تاج وہ راہی ہیں، گرتے، نہ سنبھلتے ہیں۔

کویتا کرن

راہ میں چاند ستاروں کو سجا رکھا ہے
میں نے ہر ذرہ کو پُر نور بنا رکھا ہے

کیا خبر اجنبی وہ شخص یہیں سے گذرے
احتراماً یہاں سر اپنا جھکا رکھا ہے

آسمانوں کی طرف کون کہاں تک دیکھے
اپنا گھر ہم نے زمیں پر ہی بسا رکھا ہے

آپ کے شہر میں رسوائی سے بچنے کے لئے
آپ کے درد کو سینے میں چھپا رکھا ہے

جس کو خود رہ گذر کارواں معلوم نہیں
رہنما اس کو یہاں ہم نے بنا رکھا ہے

ختم جب ہو گیا شبنم کا سفر میں نے کرن
بھیگی پلکوں ہی سے دامن کو سجا رکھا ہے

ماہنامہ **شاداب** حیدرآباد

جلد : (۱۲)

قیمت : ۶ روپے   شمارہ : (۵)

مئی : ۱۹۹۵ء

زر تعاون

ہندوستان	سالانہ	۶۵ روپے	۲ سال	۱۲۰ روپے	تاحیات	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	"	۲۰۰ "	"	۲۶۰ "	"	۳۷۰۰ "
امریکہ	"	۴۰ ڈالر	"	۷۰ ڈالر	"	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	"	۲۵ پونڈ	"	۴۵ پونڈ	"	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	"	۱۷۵ پاکستانی روپے		۳۰۰ روپے	"	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ :-

" ماہنامہ "شاداب" ۱۲۷-۵-۱۰، ریڈ ہلز، حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس [illegible] چھتہ بازار میں چھپواکر دفتر "شاداب" ۱۲۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد ۴ اے۔پی سے شائع کیا۔

فہرست

محمد قمرالدین صابری
مدیر شاداب

گیارہ آیتیں

سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی گیارہ آیتوں میں ایمان والوں کے لئے ایک جامع و مانع لائحۂ عمل بتادیا گیا ہے جس پر عمل کرکے ایمان والے کامیاب و کامران ہو کر دنیا و آخرت میں اپنی مراد کو پہنچ سکتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم تہجد کے لئے اٹھتے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر سورہ آل عمران کے آخری رکوع کی یہ آیتیں اِنّ فی خلق السمٰوٰت والارض سے ختم سورہ تک تلاوت فرماتے تھے۔

رکوع کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ عقل والے وہی ہیں جو زمین آسمان کے بنانے اور رات دن کے آنے جانے پر غور کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اللہ خالق و قادر مطلق نے یہ تمام کارخانہ اور اس کا نظم و ضبط بیکار نہیں پیدا کیا۔ چنانچہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، آخرت میں بخشش کی دعا مانگتے ہیں اور عمل کی توفیق مانگتے ہیں۔ پس یہ بتا دیا گیا ہے کہ عمل کے ثواب میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ مرد و عورت ایک آدم سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی نوع انسانی کے افراد ہیں۔ نیز یہ واضح کیا گیا کہ دنیا میں کافروں کی خوشحالی سے وہ بد دل نہ ہوں، آخرت کی کامیابی و کامرانی ایمان والوں کا حصہ ہے۔ اس کامیابی میں وہ کتاب والے بھی شریک ہیں جنھوں نے قرآن کو مانا کہ توراۃ انجیل

قرآن کی بشارت دیتی ہیں اور قرآن کے مطابق عمل کیا۔ اور آخر میں ایمان والا
ایک نہایت جامع و مانع نصیحت فرما دی کہ اس پر عمل آج کے اس پر آشوب دور
کامیابی کی ضمانت ذیل میں ان آیتوں کا ترجمہ اور مختصر تشریح پیش ہے۔

اللہ کا ذکر اور اللہ کی نشانیوں پر غور و فکر | اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (۳/ ۱۹۰) بے شک
اور زمین کا بنانا اور رات اور دن کا آنا جانا اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں
یعنی عقلمند آدمی جب آسمان و زمین کی پیدائش اور ان کے عجیب و غریب
و روابط اور دن رات کے مضبوط اور محکم نظام میں غور کرتا ہے تو اس کو یقین کرنا
کہ یہ سارا مرتب و منظم سلسلہ ضرور کسی ایک مختار کل اور قادر مطلق فرمانروا کے
ہے۔ جس نے اپنی عظیم قدرت و اختیار سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حد بندی کر
کسی چیز کی مجال نہیں کہ اپنے محدود وجود اور دائرہ عمل سے باہر قدم نکال سکے۔
عظیم الشان مشین کا ایک پرزہ یا اس کارخانہ کا ایک مزدور بھی مالک علی الاطلاق
قدرت و اختیار سے باہر ہوتا تو مجموعہ عالم کا یہ مکمل و محکم نظام ہرگز قائم نہ رہ سکتا
الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْ
فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰ
فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/ ۱۹۱) وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے
کروٹ پر لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں کہتے ہیں
ہمارے تم نے یہ عبث نہیں بنایا۔ تو پاک ہے سب عیبوں سے سو ہم کو بچا دوزخ
یعنی کسی حال خدا سے غافل نہیں ہوتے۔ اس کی یاد ہر وقت ان کے
اور زبان پر جاری رہتی ہے نماز بھی خدا کی بہت بڑی یاد ہے اسی لیے آپ نے
جو کھڑا ہو کر نہ پڑھ سکے بیٹھ کر اور جو بیٹھ نہ سکے لیٹ کر پڑھ لے۔ یعنی ر

ہے کہ جس رات میں یہ آیات نازل ہوئیں، نبی کریم صلعم کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہر حالت میں
کو یاد کرکے روتے رہے

ذکر اور فکر کے بعد کہتے ہیں کہ خداوندا! یہ عظیم الشان کارخانہ آپ نے بیکار
نہیں کیا، جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ یقیناً ان عجیب و غریب حکیمانہ انتظامات کا سلسلہ کسی
و جلیل نتیجہ پر ہونا چاہیئے۔ گویا یہاں سے ان کا ذہن تصور آخرت کی طرف
ل ہوگیا، جو فی الحقیقت دنیا کی موجودہ زندگی کا آخری نتیجہ ہے۔ اسی لیے آگے
رخ کے عذاب سے محفوظ رہنے کی دعا کی اور درمیان میں خدائے تعالیٰ کی تسبیح و تنزیہ
ن کرنے اشارہ کر دیا کہ جو احمق قدرت کے ایسے صاف و صریح نشان دیکھتے ہوئے
کو نہ پہچانیں یا تیری شان کو گھٹائیں یا کارخانۂ عالم کو محض عبث اور لعب سمجھیں،
ی بارگاہ ان سب کی ہزلیات و خرابات سے پاک ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ
سمان و زمین اور دیگر مصنوعات الٰہیہ میں غور و فکر کرنا وہ ہی محمود ہو سکتا ہے جس کا
خدا کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ ہو۔ باقی جو مادہ پرست ان مصنوعات کے
ں میں الجھ کر رہ جائیں اور صانع کی صحیح معرفت تک نہ پہنچ سکیں، خواہ دنیا
یں بڑا محقق اور سائنسداں کہا کرے، مگر قرآن کی زبان میں وہ اولی الالباب
عقل والے نہیں ہو سکتے، بلکہ پرلے درجے کے جاہل اور احمق ہیں۔

رَبَّنَا ! اے ہمارے رب ! رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ
أَخْزَيْتَهُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۳/۱۹۲)

اے رب ہمارے جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا سو اس کو رسوا کر دیا۔ (گو دائمی رسوائی
ت کفار کے لئے ہے، اس لئے جو شخص جتنی دیر دوزخ میں رہیگا، اسی قدر اس کی ہوائی ہے۔)
مد نہیں کوئی گنہگاروں کا مددگار۔ یعنی جس کو خدا دوزخ میں ڈالنا چاہے کوئی حمایت
کے بچا نہیں سکتا، ہاں جن کو ابتدا میں یا آخر میں [illegible] معاف کر دینا منظور ہوگا،

ان کے لیے شفعا کو اجازت دی جائیگی کہ سفارش کر کے بخشوا لیں۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (۳/

اے رب ہمارے ہم نے سنا کہ ایک پکارنے والا پکارتا ہے ایمان لانے کو کہ ایمان لانے کو کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر (یعنی نبی کریم صلعم نے اونچی آواز سے دنیا کو پکا قرآن کریم جس کی آواز گھر گھر پہنچ گئی) سو ہم ایمان لے آئے (یہ ایمان سمعی ہوا جب ایمان بالرسول اور ایمان بالقرآن بھی شامل ہو گیا) اے رب ہمارے! اب بخش گناہ ہمارے اور دور کر دے ہم سے برائیاں ہماری اور موت دے ہم کو نیک لوگوں ساتھ (یعنی ہمارے بڑے گناہ بخش دے، چھوٹی موٹی برائیوں پر پردہ ڈال، اور جب اٹھانا ہو، نیک بندوں کے زمرے میں شامل کر کے دنیا سے اٹھا لے

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳/۱۹۴)

اے رب ہمارے اور دے ہم کو جو وعدہ کیا تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے سے اور رسوا نہ کر ہم کو قیامت کے دن، بے شک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا پیغمبروں کی زبانی، ان کی تصدیق کرنے پر جو وعدے آپ نے کئے ہیں مثلاً د آخر کار اعداء اللہ پر غالب و منصور کرنا اور آخرت میں جنت و رضوان سے م فرمانا۔ ان سے ہم کو اس طرح بہرہ اندوز کیجئے کہ قیامت کے دن ہماری کسی قسم کی نہ ہو۔ آپ وعدہ خلاف نہیں۔ آپکے ہاں وعدہ خلافی کا سوال ہی نہیں البتہ ہم میں ا ہے کہ مبادا ایسی غلطی کر بیٹھیں کہ آپ کے وعدوں سے مستفید نہ ہو سکیں۔ اس لیے ہے کہ ہم کو ان اعمال پر قائم رہنے کی توفیق دیجئے جن کی آپ کے وعدوں سے متمتع کے لیے ضرورت ہے۔

عمل کے ثواب میں مرد و عورت برابر | فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (۳/۱۹۵)

پھر قبول کی ان دعا ان کے رب نے کہ میں ضائع نہیں کرتا محنت کسی محنت کرنے والے کی تم میں سے مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک ہو۔ (یعنی مرد ہو یا عورت ہمارے ہاں کسی کی محنت ضائع نہیں جاتی، جو کام کریگا اس کا پھل پائیگا۔ یہاں عمل شرط ہے، نیک عمل کر کے ایک عورت بھی اپنی استعداد کے مطابق آخرت کے وہ درجات حاصل کر سکتی ہے جو مرد حاصل کر سکتے ہیں۔ جب تم مرد و عورت ایک نوع انسانی کے افراد ہو، ایک آدم سے پیدا ہوئے ہو، ایک رشتۂ اسلامی میں منسلک ہوئے، تو ایک اجتماعی زندگی اور امور معاشرت میں شریک رہتے ہو۔ تو اعمال اور ان کے ثمرات میں بھی اپنے کو ایک ہی سمجھو۔ روایات میں ہے کہ ام سلمہؓ نے عرض کیا تھا، یا رسول اللہ! قرآن میں کہیں ہم عورتوں کی ہجرت وغیرہ اعمال حسنہ کا بالتخصیص ذکر نہیں آیا۔ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا۔) پھر وہ لوگ کہ ہجرت کی انہوں نے اور نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے، ضرور دور کرونگا میں ان سے برائیاں ان کی اور داخل کرونگا ان کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں (یعنی جب کسی عمل کرنے والے کا چھوٹا موٹا عمل بھی ضائع نہیں ہوتا پھر ان مردان خدا کا تو پوچھنا ہی کیا ہے جنہوں نے کفر و عصیان چھوڑنے کے ساتھ دارالکفر بھی چھوڑ دیا، وطن، خویش و اقارب اہل و عیال اور مال و منال سب کو خیرباد کہہ کر دارالاسلام کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ کفار نے ان پر وہ ظلم و ستم توڑے کہ گھروں میں ٹھہرنا محال ہو گیا، وطن چھوڑنے اور گھر بار

ترک کرنے پر بھی دشمنوں نے چین نہ لینے دیا، طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے رہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ میرا نام لیتے تھے اور میرا کلمہ پڑھتے تھے۔ آخر وہ میرے راستے میں لڑے اور لڑ کر جان دے دی، یہ وہ بندے ہیں جن کی تمام تقصیریں معاف کر دی گئیں اور جنت ان کا انتظار کر رہی ہے) یہ بدلہ ہے اللہ کے ہاں سے اور اللہ کے ہاں ہے اچھا بدلہ (یعنی اچھا بدلہ تو خدا ہی کے پاس ہے اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ یا حسنُ الثواب کا یہ مطلب ہو کہ اس سے بھی اچھا بدلہ خدا کے پاس ہے یعنی اس کا دیدار۔

کافروں کا حشر لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ (۳/۱۹۶) مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۳/۱۹۷) تجھ کو دھوکہ نہ دے چلنا پھرنا کافروں کا شہروں میں، یہ فائدہ ہے تھوڑا سا۔ پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے (یعنی کفار جو ادھر اُدھر تجارت وغیرہ کر کے دولت کماتے اور اکڑتے پھرتے ہیں، مسلمان کو چاہیئے کہ ان سے دھوکا نہ کھائے، یہ محض چند روزہ کی بہار ہے، اگر ایک شخص کو چار من پلاؤ قورمے کھلانے کے بعد پھانسی یا حبس دوام کی سزا دی جائے تو اسے کیا خوشی ملی۔ خوشی تو اس کے حصہ میں ہے جو تھوڑی سی محنت اور تکلیف اُٹھا کر ہمیشہ کے لیے اعلیٰ درجہ کی راحت و آسائش کا سامان مہیا کر لے۔)

اللہ کے مہمان لٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ (۳/۱۹۸)

لیکن جو لوگ ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں (مطلب یہ ہے کہ ایمان والوں کے اس عیش و کامیابی کا اس چند روزہ بہار سے مقابلہ کیا جائے جو کافروں کو دنیا میں میسر ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہتر ہے۔) مہمانی ہے اللہ کے ہاں سے (مہمان اس لئے کہا کہ مہمان کو اپنے کھانے پینے کی کچھ فکر کرنی نہیں پڑتی، عزت و آرام سے بیٹھے بٹھائے ہر چیز تیار ملتی ہے۔) اور جو اللہ کے ہاں

بہتر ہے نیک بختوں کے واسطے۔

اہلِ کتاب میں متقیوں کا بیان

وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ خٰشِعِیْنَ لِلّٰہِ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۳/۱۹۹)

اور کتاب والوں میں بعضے وہ بھی ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر، اور جو اترا تمہاری طرف اور جو اترا ان کی طرف، عاجزی کرتے ہیں اللہ کے آگے، نہیں خریدتے اللہ کی آیتوں پر مول تھوڑا، یہی ہیں جن کے لیے مزدوری ہے ان کے رب کے ہاں (یعنی جو اہلِ کتاب اللہ پر ٹھیک ٹھیک ایمان لائے، قرآن کو مانا اور چونکہ خود قرآن تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے ان کو بھی مانا، مگر اس طرح نہیں جیسے دنیا پرست احبار مانتے تھے کہ تھوڑے سے دنیوی فائدہ کی خاطر آیات اللہ کو چھپالیا یا بدل ڈالا۔ بلکہ خدا کے آگے عاجزی اور اخلاص سے گرے اور جس طرح اس نے کتابیں اتاری تھیں ٹھیک ٹھیک اسی اصلی رنگ میں ان کو تسلیم کیا۔ نہ بشارات کو چھپایا نہ احکام کو بدلا، ایسے پاکباز، حق پرست اہلِ کتاب کے لیے اللہ کے ہاں مخصوص اجر ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث کی تصریحات سے ثابت ہے کہ ایسے اہلِ کتاب کو دوہرا اجر ملیگا۔) بے شک اللہ جلد لیتا ہے حساب (یعنی حساب کا دن کچھ دور نہیں۔ جلد آنیوالا ہے اور جب حساب شروع ہوگا تمام دنیا کا پائی پائی حساب بہت جلد بے باق کر دیا جائیگا۔)

ایمان والوں کو جامع نصیحت

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳/۲۰۰)

اے ایمان والو صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو (یعنی اگر کامیاب ہونا اور دنیا و آخرت میں مراد کو پہنچنا چاہتے ہو تو سختیاں اٹھا کر بھی طاعت پر جمے رہو، معصیت سے رکو، دشمن سے مقابلہ میں مضبوطی

باقی صفحہ ۱۸

الحاج سید غلام محمد کیفی شاہ نظامی
۴۵۲/۱ اسپیشل بی کلاس ۔ نزد چار قندیل
جدید آغا پورہ ۔ حیدرآباد

حقیقتِ تصوّف
یعنی
عِلم لدُنّی یا طریقت

صوفی اعظم حضرت جلال الدین رومیؒ نے اپنی مثنوی میں یوں گہر افشانی فرمائی

قیمت ہر چیز میدانی کہ کیست　　　قیمت خود را ندانی احمقیست

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ خود شناسی ہی خدا شناسی کا ذریعہ ہے تصوف کا مقصد یہ ہے کہ انسان دنیوی ہر جہتی ترقی، اخلاقی و مذہبی کے ساتھ ساتھ روحانی مدارج و عروج طے کرے۔ اصول اسلام کی پابندی کے ذریعہ خداشناسی و خدا ترسی کے مدارج پر فائز ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیشہ سے علم ظاہر کے ساتھ علم باطن، شریعت کے ساتھ طریقت کی تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ جس سے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تجلیۂ روح و تخلیۂ سر کے مواقع حاصل رہتے ہیں۔ اور حضور و شہود بیت العزت کے درجات سے عالم اسلام سرفراز ہوتا ہے اس تعلیم کو علم لدنی، طریقت و تصوف سے موسوم کیا!

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ شریعت کے جملہ علوم ظاہر

تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، معانی و بیان مقدمات طریقت و مبادی تصوف ہیں۔ تصوف بہترین نتائج رشد و ہدایت برکات نبوت و فیضان رسالت کا نام ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث لکھی ہے۔

الشَّرِیعة کالسفینَة والطریقة کالبحرِ

یعنی شریعت کشتی کی طرح ہے اور طریقت سمندر کے مانند ہے صوفیائے کرام عام طور پر اس علم کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں۔

التصوف تصحیح الخیَالِ وَالاَعمَالِ

یعنی دراصل تصوف عقیدہ و عمل کی درستی کا نام ہے۔ جس کی بدولت انسان پر مطابق صلاحیت، روحانی کیفیات وارد ہوتے ہیں۔ چنانچہ سب سے بڑے سلطان العارفین مراد المشتاقین، حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم ہی ہیں اور آپ ہی کی ذات بابرکات ان تعلیمات کی سرچشمہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم نے دنیا کو جو پیغام خدائی پہنچایا۔ اور کلام ربانی سنایا اور اس کی جو تصریحات اپنے قول، فعل اور حال سے ظاہر فرمائی وہی اس علم کی اساس ہیں قرآن مجید ناطق ہے۔

واسبغ علیکم نعمة ظاهرةً وَباطنَةً (لقمٰن ۳ ع ۱۲)

یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ساری نعمتوں کے ظاہری و باطنی محاسن کی کافی وضاحت فرمادی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے۔

وَلَا رَطبٍ وَلَا یَابسٍ اِلّا فِی کِتَابٍ مُّبِین (الانعام ۶ ع ۱۳)

کوئی تر و خشک شئے ایسی نہیں جس کو اس کھلے پیام آسمانی میں ظاہر نہ کیا گیا ہو۔

تذکرہ خضر علیہ السلام کے سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکہف ۱۸ پ ۱۵)

کہ ہم نے ان کو علم لدنی کی تعلیم دی تھی
اس علم میں شان تنزیہہ و تشبیہہ کی تحقیق ہوتی ہے۔ جس سے توحید ربانی کا نام مقصود ہے۔
انسان خلیفۃ اللہ ہے۔ اس لیے وہ مامور ہے کہ پہلے خودی کو جانے پھر خدا کو پہچانے چنانچہ قرآن مجید ناطق ہے۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات پ ۱۸)

اگر تم اپنے اندر نگاہ کرو تو "وحدت ربانی" کی بیشمار نشانیاں دیکھیں گے۔ ملک میں آثار سے موثر کا پتہ لگیگا۔ ملکوت میں افعال سے فعال لما یرید نظر میں آئے گا، جبروت میں صفات سے لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى کا مشاہدہ ہوگا۔ اور لاہوت میں ذات سے هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ کا معائنہ ہوگا۔ الغرض۔

جملہ کن راہی گذاری در نظر
در نظر و در نظر و در نظر (مولانا روم)

جیسا کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب تک ان مراتب سے نہ گذریں گے کمال عروج حاصل نہ ہوگا۔ ہر مرتبہ عروج میں نیا نشان اور نئی شان نمایاں ہوگی۔

ہماری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ وہ جو ہر حال ہمارے ساتھ ساتھ موجود ہے جہاں کہیں ہم ہوں

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید پ ۲۷)

اس کا علم و عرفان اس درجہ حاصل ہو کہ اس کو اپنی رگ جان سے بھی قریب تر دیکھیں۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (قٓ پ ۲۶)

صوفیائے کرام کا ارشاد ہے کہ حقیقت، سلوک وسیلہ ہے جس کی تحقیق میں فرماتے ہیں کہ حجاب

باری نے "روح قدسی" پر محبت کا دارومدار رکھا۔ جو روح اعظم روح محمدی ہے" کیونکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ کی محبوب اول یہی ہے اور محبت اول یہی ہیں۔ آپ کی ذات والاصفات منتہائے تخلیق کائنات ہے۔ مطلب یہ کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ کے عاشق حقیقی و محبت تحقیقی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ دائرہ عشق میں آپ کی روش پر عاشقانہ انداز میں مطابقت ومطابعت لازم ہے۔ تاکہ نفس پر غفلت دور ہو۔ قلب بیدار ہو اور ایک فیض باطنی سے معیت جناب باری عزاسمہ کا شرف حاصل ہو۔

حضرت غوث صمدانی قطب ربانی سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تصوف کے آٹھ خصائل ہیں۔ جن میں ایک ایک خصلت ایک ایک پیغمبر کے ساتھ مختص ہے تصوف ان (۸) خصائل پر مبنی ہے۔

(۱) ابراہیم علیہ السلام کی سخاوت (۲) اسحٰق علیہ السلام کی رضا
(۳) ایوب علیہ السلام کا صبر (۴) زکریا علیہ السلام کی مناجات
(۵) یحییٰ علیہ السلام کی غربت (۶) موسیٰ علیہ السلام کی خرقہ پوشی
(۷) عیسیٰ علیہ السلام کی سیر وسیاحت (۸) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فقری

اسی سلسلہ میں یہ بھی جاننا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ ہائے طریقت متعدد ہیں۔ جملہ سلاسل کی تعلیم خالص سنت نبوی پر منحصر ہے۔ ہر ایک صوفی اپنے طریقہ سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ جس سے انہیں فیضان الٰہی میسر آتا ہے۔ بہرحال جملہ سلاسل کا سرچشمہ فیض رحمۃ للعالمین ہی ہیں۔ جن کے برکات سے اقصائے عالم میں تصوف کی بیشمار نہریں جاری ہوئیں۔ البتہ مشہور سلاسل طریقت قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ ہیں۔ انہیں سلاسل کے شیوخ کے طفیل سے چار دانگ عالم میں ایمان وعرفان کی نشر واشاعت ہوتی آئی ہے۔ انہیں کے اثر ونفوذ، روحانیت و للّٰہیت کی بدولت وہ آبادیاں جہاں کو دالہاد پرورش پاتا رہا۔ ضیائے توحید سے جگمگا اٹھیں۔ اور کرہ ارض کے گوشہ گوشہ میں اسلام عاپان

سا اچھا ہو گیا۔ رحمہم اللہ اجمعین

عالم اثر است ذات یکتائی را
روزے کہ دروں آفتاب است کہ دید

ترجمہ:۔ سارا جہاں اسی ذات یکتائی کی نشانی ہے۔ ورنہ دن ہو اور آفتاب نہ ہو یہ کس نے دیکھا؟

سالکین حق کا دستور عمل (عشرۂ تصوّف)

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین (الانعام)

کہہ دیجئے کہ بلا شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لیے ہے جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے)

سالکین کا دستور العمل مذکورہ آیت کا مظہر ہونا چاہیئے کہ ایک سالک کی عبادت معاملات اس کی حیات وممات سب اللہ ہی کی رضا وخوشنودی کے لیے ہوتی ہے، کا دستور العمل "عشرۂ تصوف" کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہوئے ہیں۔ اس لیے ایک سالک کو ان پر کاربند ہونا ضروری ہے تاکہ مقصود تصوف قرب "رضائے حق" اور ابدی مسرت نصیب ہو۔

ذیل میں عشرۂ تصوف (یعنی دس ارکان تصوف) کو اجمالاً پیش کیا گیا ہے البتہ ان کی تفصیل بہ تصریح قرآن، حدیث اور تصوف کی روشنی میں الگ الگ عنوانات کے تحت ان شاء اللہ بیان کر دی گئی ہے

عشرۂ تصوّف

(۱) ایمان:۔ جس نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور اسلام کو اپنا دین اور محمد ﷺ کو اپنا

رسولؐ مان لیا اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا۔ (مسلم)

ف۔ (اسلام و صحیح عقیدہ و عمل کے) سالک اللہ ہی کو معبود و مستعان، خالق و رازق، مالک و حاکم، حاضر و ناظر، نافع و ضار اور مانع و معطی سمجھتا ہے نیز زندگی کے ہر پہلو میں اللہ و رسول کی اطاعت کرتا ہے

موانعات۔ سالک موانعات ایمان، کفر، شرک، نفاق، بدعات اور ارتداد سے سخت پرہیز کرے۔

(۲) **عمل صالح**: اگر کسی کو کسی پر فضیلت ہے تو صرف دینداری اور عمل صالح کی بدولت ہے (احمد)

ف: عمل صالح کا خلاصہ عبادت و استعانت ہے۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین (فاتحہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے استعانت (مدد) چاہتے ہیں۔

اصلی عبادت تو یہ ہے کہ زندگی میں ہر وقت ہر حال میں خدا کے قانون پر چلیں اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اب رہا نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ تو ان کا مقصد آپ کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرنا ہے جو آپ کو زندگی ہر وقت ہر حال میں ادا کرنی ہوگی۔ استعانت کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام میں اللہ ہی سے مدد چاہیں اور اسی پر بھروسہ رکھیں۔ کیونکہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے اور اسی سے مدد چاہتا ہے۔

عمل صالح کی تعریف عمل سنت کے مطابق ہو اور اس میں ریا نہ ہو۔

موانعات: سالک ہمیشہ اعمال سیئہ سے بچتا ہے

(۳) توبہ: ہر تائب کے لئے جنت ہے۔ (دیلمی)

ف: توبہ ہر مومن پر واجب ہے۔ تائب کے لیے مغفرت اور جنت کی بشارت ہے اور وہ اللہ کا محبوب ہے۔ توبہ کے لیے زبان سے استغفار اور دل سے ندامت اور پھر گناہ نہ کرنے کی نیت ضروری ہے۔ ایک سالک کے لئے توبہ میں عجلت کرنا اور توبہ کے

آداب و شرائط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

موانعات :۔ ترک توبہ اور گناہوں سے پرہیز کرے۔

(۴) تزکیہ نفس :۔ تین چیزوں انسان کو ہلاک کرنے والی ہیں (۱) بخل کی پ (۲) ہوائے نفس کا اتباع (۳) آدمی کا خوش ہونا اپنے نفس سے (خود بینی) ا خصلت ان سب سے بری ہے (مشکوٰۃ)

ف ، سالک اپنے نفس کو اخلاق رذیلہ (جھوٹ، غیبت، تکبر، ریا، کینہ، غ خواہشات وغیرہ) سے پاک رکھے۔ ان کے بجائے اخلاق حمیدہ (زہد، توکل، ص تسلیم و رضا، خوف و رجا اور حسن خلق وغیرہ) اختیار کرتا ہے۔ یہی تزکیہ نفس ہے

موانعات : سالک اخلاق رذیلہ اور خواہشات نفس سے احتراز کرتا ہے۔ تاکہ نفس کی پاکیزگی حاصل ہو۔

(۵) ذکر : اللہ کا ذکر دلوں کے لیے شفا ہے (جامع صغیر)

ف :۔ سالک کے قلبی (باطنی) امراض کا علاج ذکر سے کیا جاتا ہے کیونکہ قلب کے لیے کتاب و سنت نے ذکر ہی کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ ذکر الہٰی کے سبب سے تقوٰ تصفیہ قلب اور تسکین قلب حاصل ہوتا ہے۔ ذکر تین ہیں (۱) نماز (۲) قرآ ذکر مطلق۔ سالک نماز با جماعت کا خشوع و خضوع کے ساتھ اہتمام کرتا ہے۔ تلا غور و فکر کے ساتھ کرنے کے علاوہ اس پر عمل بھی کرتا ہے نیز اٹھتے بیٹھتے چلتے غرض کہ ہر وقت ہر حال میں ذکر الہٰی کرتا رہتا ہے۔ تاکہ ترک لایعنی (غیر مفید ترک کرنا) کی عادت ہو جائے ذکر کا اصل مقصد یہ کہ ہر حال میں اللہ کو کیجائے۔

موانعات : سالک کے لیے غفلت سے بچنا اور ترک لایعنی اختیار کرنا ہ

(۶) فکر :۔ فکر ایک ساعت کی ستر برس کی عبادت سے بہتر ہے

ب : فکر (مراقبہ) غیرِ خدا کے خطرہ سے دل کی حفاظت کرنے کو کہتے ہیں۔ اس فکر میں
الک اپنے تعلقات اور تمام پسندیدہ چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور اپنے اخلاق اور خواہشات
باز آتا ہے۔ مراقبہ صفات و عظمت و حکمت الٰہی محاسبہ و اعمال اور مراقبہ موت ایک سالک
یلیے ضروری ہے۔ کیونکہ یہ افکار محرک عمل ہیں۔ فکر چراغِ قلب ہے۔ جس کی روشنی سے
ے اور برے کا امتیاز ہوتا ہے۔

نعات : سالک اللہ کی ذات میں فکر نہ کرے نیز دنیاوی تفکرات سے بیگانہ رہے
) **صحبت** : نہ ساتھ رہے مگر مومن کے اور نہ کھائے تمہارا کھانا مگر متقی (ترمذی)
ف : قرآنی اصطلاح میں مومن متقی کو اولیاء اللہ کہا گیا ہے۔ اس لئے اس حدیث میں
لک کو مومن متقی کی صحبت اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔
بت کے لیے صالحین اور کاملین کی اطاعت ضروری ہے۔ ورنہ گمراہی کا اندیشہ ہے۔ روحانی
لح و رہنمائی کے لئے کسی شیخ جامع شریعت و طریقت کے حوالہ کر دینا بیعت کہلاتا ہے۔ بیعت
حقیقت مرید کی طرف اتباع کا التزام اور شیخ کی طرف سے تعلیم کا اہتمام ہے۔ بیعت صحابہ
ے اصلاح اعمال و ترکِ گناہ احادیث سے منصوص ہے۔

انعات : سالک صحبتِ بد سے اس طرح پرہیز کرتا ہے۔ جس طرح بیمار پانی سے پرہیز کرتا ہے

۸) **حقوق** :۔ دین خیر خواہی کا نام ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔
بہ نے عرض کیا کس کی خیر خواہی؟ ارشاد ہوا (۱) خدا کی (۲) اس کے رسول کی (۳) اس
س کے کتاب کی (۴) مسلمانوں کے امیر کی (۵) اور عام مسلمانوں کی۔ (مسلم)
ف : سالک حقوق اللہ (ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، تبلیغ اور اوامر و نواہی
ل پابندی وغیرہ) کی پابندی کے ساتھ ساتھ حقوق العباد (اطاعت امیر والدین، زن و شوہر
اولاد، رشتہ دار، پڑوسی، یتیم، مساکین اور عام مسلمانوں کے حقوق کا بھی اہتمام
کرتا ہے۔ کیونکہ اہلِ سلوک کا قول ہے۔ "طریقت بجز خدمت خلق نیست۔")

موافقات :۔ سالک حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق النفس کو تلف نہ کرے

(۹) تبلیغ : آدمی کی ہر بات اس کے لئے وبال ہے سوائے تین باتوں کے
(۱) امر بالمعروف (نیکی کا حکم)، (۲) نھی عن المنکر (برائی کی ممانعت)
(۳) ذکر الٰہی۔ (ترمذی)

ف :۔ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ دوسروں کی اصلاح کی بھی کوشش کرتا ہے اس لئے صوفیائے کرام مجالس وعظ کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ سالک جس قدر ممکن ہوا شریعت لوگوں تک عملاً و عملاً پہنچاتا رہے۔ اور بیعت کا منشا بھی یہی ہے کہ شرط سے تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔

موانعات :۔ سالک جب لوگوں میں برائی دیکھے تو اس کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کرے۔ اور جس بات کی نصیحت کرتا ہے خود بھی اس پر عمل کرے۔

(۱۰) **فضل الٰہی** :۔ تم میں سے کوئی شخص اور نہ میں محض اپنے اپنے عمل کی وجہ جنت میں جائیں گے۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ڈھانک لے (بخاری)

ف :۔ سالک یہ سب کچھ کرنے کے بعد نظر اپنے عمل پر نہیں رکھتا بلکہ ہمیشہ اپنے فضل و کرم کا محتاج اور رحمت کا امیدوار ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا اس کے عدل سے کئی گنا زیادہ ہے۔

موانعات : سالک اپنے زہد و تقویٰ پر زعم نہ کرے بلکہ ان کی ادائی کے ساتھ اللہ کے فضل

سنہری صفحہ
(۱) ثابت قدمی دکھلاؤ، اسلام اور حدود اسلام کی حفاظت میں لگے رہو، جہاد ان کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو وہاں آہنی دیوار کی طرح سینہ سپر ہو کر ڈٹ جاؤ ہر وقت ہر کام میں خدا سے ڈرتے رہو۔ یہ کریں تو سمجھو کہ مراد کو پہنچ گئے۔
یہ وہ نسخہ کیمیا ہے۔ کہ آج کے اس بے سرو سامان کے پر معنا تب بھی اس پر عمل کامیابی و کامرانی کی ضمانت ہے۔

حسن جامی
ل کالونی - مہدی پٹنم - حیدرآباد ۲۸

خدوخال

جناب صادق نوید کے مجموعۂ کلام کا تنقیدی جائزہ

(شاداب میں "نقد و نظر" کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، اس عنوان کے تحت اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے اور ان پر معیاری اظہار خیال کے لئے شاداب کے صفحات حاضر ہیں)

ہمارے ایک شاعر نقاد دوست ڈاکٹر حسن احمد جلیلی کے قول کے مطابق شاعری انسانوں میں شعورِ ذات پیدا کرتی ہے اور شعورِ ذات ہی انکشاف کی راہیں کھولتا ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے شاعر دوست صادق نوید (اب یہ بات الگ ہے انہیں اس مضمون کی روشنی میں کہاں تک شاعر مانا جاسکتا ہے) پر صادق نہیں آتی کیوں کہ آگے چل کر حضرت علی جلیلی نے صادق نوید کی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے فراق گورکھپوری کا یہ قول دہرایا ہے "غزل کی شاعری ایک جذب رچی ہوئی بیکاری ہے لیکن شاید ایسی بیکاری جو فلسفہ و تمدن کی روحِ رواں بن سکتی ہے" لیکن خود صادق نوید کا اس سلسلے میں اعتقاد حسب ذیل شعر ہے

کوئی ناداں ہو تو کہتا ہے یہی
شاعری ہے مشغلہ بیکار سا

(یہ بات الگ ہے کہ "بیکار" کہنے کے بعد "سا" کی گنجائش کہاں تک ہے)

خیر اب فراق کی بات کو سچ مانا جائے یا صادق نوید کی بات کو۔ صادق نوید کے بارے میں حضرت علی جلیلی فرماتے ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ یہ بھی انکشاف کرتا ہے کہ

صادق نوید کسی ادبی میلان سے وابستہ نہیں ہیں (حالانکہ شاعر و ادیب کسی نہ کسی ادبی میلان سے یقیناً وابستہ ہوتا ہے) اس دور میں شاعری اور فنکار کا جو ربط ٹوٹ گیا ہے وہ ایک بڑا المیہ ہے۔ موجودہ نسل میں جو سہل پسند ہے یہ رجحان عام ہو رہا ہے۔ دور رس سہل پسندی کا شکار صادق نوید بھی ہیں۔ صادق نوید کے بارے میں "خدوخال" میں شامل مضمون میں ہمارے ایک اور دوست صلاح الدین نیر نے ایک بڑے سیے کی بات کہی ہے جو صدفی صد سچائی پر مبنی ہے "ان کے (صادق نوید کے) مزاج میں جہاں متانت سنجیدگی اور بردباری ہے وہیں کچھ عجلت پسندی بھی ہے" اور اسی عجلت پسندی کا نتیجہ ان کی اغلاط و اسقام سے پُر کتاب "خدوخال" ہے۔ کاش ہمارے دوست صادق نوید اسکی اشاعت سے پہلے اچھی طرح نظر ثانی کر لیتے (اگر نظر ثانی کر چکے تھے تو نظر ثالث نظر رابع، نظر خامس، نظر سادس، نظر سابع، نظر ثامن، نظر تاسع اور نظر عاشر بھی ڈال لیتے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ جانتے ہی نہیں کہ جو غلطیاں ان کے کلام میں موجود ہیں وہ واقعی فنی اسقام کہلاتی ہیں۔ اگر چھپوانے سے پہلے مستند اساتذہ میں سے کسی کو دکھا لیتے تو اسطرح رسوا ہونے سے بچ جاتے اور ان پر تساہل پسندی اور نا اہلی کا دھبہ تو نہ لگتا۔

آیئے ذرا صادق نوید کے مجموعۂ کلام خدوخال کا اجمالی جائزہ لیں (کیوں کہ یہاں تفصیلی جائزے کی گنجائش نہیں ہے۔) سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس کتاب کا نام ہی نامکمل ہے۔ نام ہے خدوخال۔ یہ آخر کس کے خدوخال ہیں شاعر کے یا اسکی شاعری کے یا اسکی مجوبہ کے۔ پورا مجموعہ پڑھ جانے کے بعد بھی خدوخال واضح نہیں ہو سکے۔ بہت پہلی غلطی جو شروعات ہی میں یعنی "حمد" ہی میں واقع ہو گئی ہے گویا بسم اللہ ہی غلط ہو گئی مطلع کا پہلا مصرع

ع " خالقِ بحر و بر خالق دو جہاں "

"خالقِ دو جہاں" کہتا ہے تو پھر الگ سے "خالقِ بحر و بر" کہنے کا کیا محل ہے جبکہ "دو جہاں میں "بحر و بر" لفظ خود سمایا ہوا ہے۔ ایسے بھرتی کے الفاظ سے شاعر کو بچنا چاہیئے۔

پہلی نعت کے چھٹے شعر کا پہلا مصرع۔

"دربار میں صف بستہ کھڑے شاہ و گدا ہیں"

جبکہ ترتیب فعل کا اقتضاد ہے۔ شاہ و گدا کھڑے ہیں۔ مذکورہ مصرع میں سقم یہ ہے کہ دو افعال کے درمیان اسما آگئے ہیں یعنی "کھڑے" اور "ہیں" کے درمیان "شاہ و گدا"۔
اسی نعت کے مقطع کے مصرع اولیٰ میں فعل کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ مصرع ہے۔

ع "الفاظ نوید آپ کی توصیف سے قاصر"

جبکہ وہ کہنا چاہتے ہیں الفاظ نوید آپ کی توصیف سے قاصر ہیں۔ اسکے علاوہ دوسرا مصرع بھی صادق نوید کی بے مائگی، کمزوری اور عجز کا غمازہ خود ہی ہے۔

ع "رکِ نعت نہ ہو پائے گی شایانِ محمدؐ"

آگے بڑھئے صفحہ ۳۹ پر ایک منقبت ہے "نذرِ حسین" اسکے تیسرے شعر کے دوسرے مصرع میں ایک حشو در آیا ہے "وہ" مصرع یوں ہے۔

ع "کہ بزم و رزم کی بے شک وہ آبرو ہے حسین"

جسمیں "وہ" حشو ہے۔

چوتھے شعر میں "یزیدِ وقت" کی تشبیہ محل نظر ہے کیونکہ یہاں جس یزید کا ذکر ہے وہ حقیقی ہے اور حضرت حسین کا معاصر ہے جس سے حضرت حسین کا معرکہ رہا۔ آج کے کسی جابر و ظالم کا تذکرہ نہیں جسے یزیدِ وقت سے تشبیہ دیجائے۔

پانچواں شعر ہے ؎

"ہوائے نفس پہ جو بھی چلا یزید بنا!
یزیدیت کو مٹانے کو رو برو ہے حسین"

پہلے تو یہ شعر ہی بے محل بلکہ مہمل ہے جبکہ عنوان "نذرِ حسین" ہے۔ دوسرے یہ بھی غلط ہے کہ ہوائے نفس پہ چلنے والا یزید بنتا ہے۔" ہوائے نفس" الگ شئے اور یزیدیت اک الگ چیز۔ دراصل یزیدیت حق کے خلاف باطل کی قوت کا نام ہے ہوائے نفس کا نہیں۔

اسی منقبت کا آخری شعر ہے ؎

تمام عمر جو بس حالت نماز میں تھا!
خدا کی راہ میں سر دے کے سرخرو ہے حسین

اس شعر کا مطلب کیا ہوا بھلا تمام عمر کوئی آدمی حالتِ نماز میں کیسے رہ سکتا ہے دیگر فرائض منصبی اور مکروہاتِ زندگی بھی ساتھ لگے ہوئے ہیں بے شک عبادات و نمازوں کیلئے اوقات مقرر ہیں جس میں دیگر ضروریاتِ زندگی کیلئے وقفے ہیں البتہ فرشتوں کے بارے میں عبادات کے سلسلے میں یہ کہا گیا کہ اللہ نے بعض فرشتوں کو محض سجدہ کرنے کے لیے مقرر کیا بعض کو قیام کیلئے بعض کو رکوع کی حالت میں! فرشتوں کو فقط تسبیح میں مصروف رکھا ہے۔ لیکن حسین کے لیے ایسا کہنا کہ" تمام عمر جو بس حالتِ نماز میں تھا" کتنا غیر منطقی ہے

اسی منقبت کا مقطع ہے ؎

"وہ لڑ رہا تھا اندھیروں سے روشنی کیلئے
نویدِ صبحِ مسرت کی آرزو ہے حسین"

اس شعر میں شاعر تفریقِ زمانہ کا شکار ہو گیا ہے۔ پہلے مصرع میں "تھا" اور دوسرے مصرع میں "ہے"۔

عموماً ایسی غلطی مبتدیوں کے یہاں بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے لیکن تو کہنہ مشق شعراء کرتے ہیں

حیرت ہے کہ ایک ٹائٹل کا شعر ہے اور وہ بھی مہمل ۔ ملاحظہ ہو ؎

" ماضی پہ مسکرا کے مرا حال لے گئے ۔ !
وہ مجھ سے مل کے میرے خد و خال لے گئے "

ماضی پہ مسکرانے والا کون ہے اور کیوں خواہ مخواہ مسکرانے کی زحمت کر رہا ہے شعر سے کچھ پتہ نہیں چلتا بس بے وقوفوں کی طرح مسکرا رہا ہے ۔ علاوہ ازیں یہاں " وہ " سے کیا مراد ہے ۔ اگر کوئی زندہ وجود مان بھی لیا جائے تو " وہ " حال کو کہاں لے گئے اور کیا خد و خال بھی کوئی بھاجی ترکاری ہے جو پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئے ۔ حیرت ہے کہ مہمل گوئی کی اتنی شاندار مثال بھی صادق نوید کے پاس موجود ہے ۔ چہ بوالعجبیت !

صفحہ ۴۲ پر ایک مہمل شعر یوں ہے ؎

"جب غم کی کڑی دھوپ تھی سنگین تھے حالات
سایہ بھی مرا مجھ سے بہت دور کھڑا تھا "

جب سورج سوا نیزے پر ہوتا ہے تو کڑی دھوپ اسی وقت ہوتی ہے اور اس وقت سایہ دور نہیں کھڑا ہوتا بلکہ قدموں میں پڑا ہوتا ہے ۔

اسی غزل کا مقطع ہے ؎

اس طرح نوید اب کے بہار آئی گئی ہے
جیسے کسی صحرا میں کوئی پھول کھلا تھا !

پہلے تو صحرا میں (یعنی ریگستان میں) پھول کھلتا ہی نہیں چلو مان لیا کہ صحرا میں پھول کھلا بھی ہے ۔ تو آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے ۔ آخر یہ کس بہار کا تذکرہ ہے ۔ یہاں " اب کے " سے شاعر کی کیا مراد ہے ۔ بہر حال شعر مہمل ہے ۔

صفحہ ۴۳ پر مطلع ہے ؎ دل کی ویران گزرگاہ میں آتے رہیے
اک نہ اک غم کی نئی فصل اگاتے رہیے

فصل کھیت میں اگائی جاتی ہے گزرگاہ میں نہیں۔ جھل گوئی کی ایک اور مثال حسنِ مطلع ہے۔ بزمِ تخیل بہر طور سجاتے رہیے
کوئی تصویر ہو تصویر بناتے رہیے

شاعر کو خود پتہ نہیں ہے کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ بہر طور بزم تخیل کیوں سجاتے رہ
کوئی تصویر " آخر کیوں بناتے رہیے۔ یہاں کوئی کہہ کہ شاعر نے اپنے تفکر کے دیوالیہ
ثبوت دیا ہے۔

اسی غزل کا ایک شعر ہے

بھیگی بھیگی ہوئی پلکوں پہ تمنا کے چراغ
شام تا صبح اندھیروں میں جلاتے رہیے

پہلے مصرع میں ایک ہی " بھیگی " کافی تھا ہوئی کے ساتھ۔ یعنی بھیگی بھیگی
کہنا درست نہیں۔ اگر تکرار ہی کرنا تھا تو بھیگی بھیگی پلکوں " کہتے یا پھر صرف " بھیگی ہوئی
سے کام چل جاتا۔ اگر زبان پر دسترس ہوتی تو ایسی معمولی غلطی سرزد نہ ہوتی اگر
استاد کے آگے تصحیح کیلئے پیش ہوتا تو بھیگی بھیگی کا سقم اس طرح دور ہوتا

اپنی بھیگی ہوئی پلکوں پہ تمنا کے چراغ
شام تا صبح اندھیروں میں جلاتے رہیے

اسی غزل کا مقطع ہے۔

گل کی چاہت ہے تو کانٹوں پہ بھی چلنا ہے نوید
غیر تو غیر عدو سے بھی نبھاتے رہیے!

پہلے مصرع میں گل کی چاہت " مرکزِ فکر ہے۔ اسکی رو سے یہ مان لیتے ہیں گل
کیلئے کانٹوں پہ چلنا پڑے تو ضرور چلیں گے۔ بات یہاں ختم ہو گئی۔ دوسرے مصرع
ایک الگ ہی بات کہی گئی ہے کہ غیر تو غیر عدو سے بھی نبھاتے رہیے " اول تو یہ لفظ

نہیں بلکہ بنتا ہے۔ اگر غلط تلفظ کے باوجود اسے قافیہ کی مجبوری تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات کیسے تسلیم کر لی جائے کہ گل کی چاہت میں کانٹوں پہ چلنے کے علاوہ غیر توغیر عدو سے بھی کیوں اور کس لئے نباہتے رہتے۔ اس قسم کے اشعار عدم قدرتِ اظہار کے زمرے میں آتے ہیں۔

صفحہ ۴۴ پر ایک شعر ہے ؎

صرف تخلیق ہی کافی ہے تعارف کے لئے
کوئی گھر گھر نہیں جاتا کسی اخبار کے ساتھ

اس عجلِ اظہار کا بھی جواب نہیں ہے کاش صادق نوید کو تمیز ہوتی کہ اخبار کا تعلق خبروں سے ہے اور خبریں خبریں ہوتی ہیں۔ خبریں وقوعہ بھی ہو سکتی ہیں حادثہ بھی ہو سکتی ہیں اور خبریں واقعہ بھی ہو سکتی ہیں تخلیق نہیں ہو سکتیں۔ یہاں اگر تخلیق کی مناسبت سے رسالہ کہتے تو تخلیق کی آبرو رہ جاتی لیکن کیا کیا جائے صادق نوید کی حد اخبار تک ہی ہے اور روزانہ اخبار ہی میں ان کی تخلیقات چھپتی ہیں تو یہ محض اخبار ہی کو اپنی تخلیق کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اپنی اپنی فکر ہے اپنا اپنا معیار۔

ایک اور نے تکا شعر اسی غزل کا ملاحظہ فرمائیے ؎

آپ اپنے ہی پرستاروں سے الجھا نہ کریں
بات ہوتی ہے محبت کی خریدار کے ساتھ

ہم نے اس شعر کو سو طرح سمجھنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی سمجھ میں نہ آیا پہلے مصرع سے یہ اندازہ تو ہوا کہ آپ خواہ مخواہ اپنے پرستاروں سے الجھا کریں بات بھی پوری پوری سمجھ میں آ گئی تھی لیکن جب دوسرے مصرع کو پہلے سے ملانے کی کوشش کی تو بات پھر الجھ گئی دوسرے مصرع میں کہا گیا ہے کہ محبت کی بات تو خریدار سے ہوتی ہے۔ اور اگر محبت کی بات خریدار سے ہوتی ہے یہ مان لیا جائے تو شاعر کا بہ مشدہ پہلے مصرع میں

کہ " آپ اپنے پرستاروں سے الجھا نہ کریں " کیوں دیا ہے۔ آخر اس مشورہ کا مطلب کیا ہے۔ کیوں الجھا نہ کریں ابھی ہم اسی الجھن میں پڑے ہوئے اپنی عقل پر ماتم کر رہے کہ اگلے والے شعر پر نظر پڑی ؎

عقل کو دخل بہت کچھ ہے نئی دنیا میں
دل کے دیرینہ روابط ہیں سہی دلدار کے ساتھ

اب اس شعر کے مطلب کی تلاش میں عقل ہی خبط ہونے لگی پھر وہی دو لختگی پہلے مصرع کا مطلب الگ اور دوسرے مصرع کا مطلب الگ۔ اگر دونوں کو ملانے کی کوشش کی گئی تو دل کے دیرینہ روابط کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

ہم ابھی ان اشعار کا مطلب ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ ہمارے ایک شاعر دوست عزیز بھارتی نے ہم سے " غم خوار " کے معنیٰ پوچھ لیے تو ہم نے جواب دینے کی بجائے الٹا پوچھا کہ آخر اتنے آسان لفظ کے معنی کیوں پوچھ رہے ہو انہوں نے اصرار کیا کہ کچھ بات۔ آپ اس لفظ " غمخوار " کے معنیٰ تو بتائیے ؟ کہیں غمخوار کے معنیٰ " غم زدہ " نہیں ؟ میں نے کہا ارے نہیں بھائی غم خوار کے معنیٰ تو ہمدرد ، غم کھانے والا ، آپ کا شریک آپکے دکھ درد میں ساتھ دینے والا وغیرہ وغیرہ ۔ جیسے ہی ہم نے انہیں معنیٰ بتلائے تو انہو کہا تو پھر ذرا صادق نوید کے اس شعر کا مطلب سمجھائیے ہماری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

؎ دوستی کر کے نبھانا ہے کوئی کھیل نہیں !
دو قدم چل کے دکھاؤ کسی غم خوار کے ساتھ

" واقعی ہم نے اپنا سر پیٹ لیا کیونکہ صادق نوید کے اس شعر میں غمخوار کے " غم زدہ " کے طور پر ہمارا منہ چڑا رہے تھے۔ اب ہم کیا DEFENCE کرکے مجبوراً ہمیں عزیز بھارتی کی ہم نوائی کرنی ہی پڑی۔

ڈاکٹر خواجہ فریدالدین صادق
ایم اے (اردو عثمانیہ)

اردو صحافت کی تاریخ اور حیدرآباد کے روزنامے اور رسالے

دکنی میں اُردو زبان کی ترقی میں جہاں شاہوں۔ امیروں۔ آدیبوں اور شاعروں نے اہم رول ادا کیا ہے وہیں پر "صحافت" اُردو اخبارات اور رسالوں نے بھی غیر معمولی و اہم رول ادا کیا ہے۔ زبان کی ترقی اور ادب کی ترقی میں انکا بڑا حصہ رہا ہے حیدرآباد میں علمی ادبی اور فنی رسالوں کا آغاز ۱۸۵۵ء میں اور ہندوستان میں ۱۷۸۰ء میں ہوچکا تھا۔ یہاں پر ۱۷۸۰ء سے لیکر تاحال اُردو اخبارات رسایل پر مختصراً روشنی ڈالی جائے گی۔ تاکہ یہ مضمون طوالت نہ اختیار کرجائے ہندوستان میں صحافت کا آغاز "EAST INDIA CO" کے دور میں ابتداً انگریزی اخبار سے ہوا۔

پہلا اُردو اخبار "اخبار جہاں نما" ۱۸۲۲ء میں کلکتہ میں منظر عام پر آیا ۱۸۳۷ء میں مولانا محمد باقر نے دہلی سے "دہلی اردو اخبار" جاری کیا۔ اسطرح ہندوستان میں اردو اخبارات کی ابتدا ہوئی۔

حیدرآباد میں اردو صحافت کا آغاز ایک طبی رسالے سے ہوا ۱۸۰۰ء میں جسکا ایڈیٹر ایک انگریز تھا۔ تاہم ملک بجن لال نے جو پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ تھے: "Vistas Modern Indian History" میں آفتاب دکن کو حیدرآباد کا پہلا اخبار قرار دیا جو ۱۸۶۰ء

قاضی محمد قطب کی ادارت میں جاری ہوا۔ بعض محققین نے "آصف الاخبار" کو حیدرآباد کا پہلا قرار دیا جو نارائن راؤ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔
بعض نے پہلا ہفتہ نامہ "ہزار داستان" کو قرار دیا جو ۱۸۸۳ء میں سلطان عاقل کی ادارت میں جاری ہوا۔

۱۹۵۵ء تک مختلف اخبارات اور رسالے شائع ہوتے رہے ہم ایک بھرپور جائزہ ان اخبارات اور رسالات کا لینگے جو نہ صرف ۱۹۵۵ء تک بلکہ آج تک کے اخبارات اور ... پر مبنی ہوگا۔

اخبار کے معنی فیروز اللغات کے مطابق خبر کی جمع کے ہوتے ہیں یا پھر وہ کاغذ جس پر شائع ہوتی ہیں صحافت کے معنی اخبار نویسی کے ہوتے ہیں۔ صحافت آج کے دور میں ایک اہم ادا کرتی ہے۔ سماجی۔ سیاسی۔ ثقافتی ادبی معاشرتی ترقی کی بنیاد اچھی اور صحت مند صحافت پر مبنی ہوتی ہے۔ دراصل یہ ذرائع ابلاغ۔ Mass Media Commu-nication کی ایک کڑی ہوتی ہے۔ عموماً ذرائع ابلاغ حسب ذیل طریقوں پر مخصر

۱) ELECTRONIC MEDIA (الکٹرانک میڈیا)
۲) RRINT MEDIA (پرنٹ میڈیا)
۳) Audiox Vidi o. Media (ایڈیو اور ویڈیو میڈیا)
۴) FILMS (فلمیں) وغیرہ

صحافت پر غور کرنے سے پہلے ہمکو ان تمام امور پر غور کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا ہے۔ ہم ہر ایک نقطہ پر سرسری جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھینگے۔ -tronic Media: یہ Moss Media کی بہت ہی اہم شاخ ہے جس میں کسی بھی بات کو عوام تک میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ اس کے تحت حسب ذیل چیزیں آتی ہیں جنکے ذریعہ عوام تک ہر طرح کے پیغامات پہنچائے جاتے ہیں۔ ۱) ٹیلی ویژن TELIVISION ۲) ریڈیو io

7 اور ریڈیو کے ذریعہ سماجی سیاسی ۔ اقتصادی ۔ ملی ۔ اور عوامی مسائل کو عوام تک
جاتا ہے اور خبریں بھی بہت ہی موثر انداز میں عوام تک پہنچائی جاتی ہیں ۔
MEDIA PRINT ۔ یہ ذرائع ابلاغ کا ایک اور موثر ذریعہ ہے جیسے اخبارات
الے ۔ میگزینس ۔ ناولس ۔ وغیرہ آتے ہیں ۔ ہمارا مضمون ذرائع ابلاغ کے اس 'Media'
رد ہی گھومتا ہے ۔ ہندوستان کی تاریخ میں صحافت کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن
ا تک محققین نے اس پر کام کیا ہے اسکے مطابق ہمیں ۱۷۸۰ء سے ہی مواد ملتا ہے ۔
ال صحافت معاشرہ میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتی ہے ۔ اردو صحافت خاص طور سے کا
۔ کو اہمیت دی آئی ہے کہ سماج میں ایک منظم طریقہ سے اتحاد و اتفاق ملک میں برقرار رہے ۔
ملک ترقی کی راہ پر حیدرآباد دکن میں اردو کی ترقی کا دور ویسے تو عادل شاہی اور قطب شاہی
ں میں عروج پر آچکا تھا جبکہ عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں کی درباری زبان
ردو قرار دی گئی تھی ۔ اسکے بعد سلطنت آصفیہ نے بھی اپنی درباری زبان اردو کو ہی قرار دیا ۔
۱۸ء میں سلطنت آصفیہ نے اردو کو سرکاری زبان قرار دے کر ہی آئین کسر کو پورا کیا
طرح اردو کے ترقی کے تمام راستے ہموار کر دیے ۔ سونے پر سہاگہ "جامعہ عثمانیہ" ملک کی
سلی جامع تھی جہاں پر ذریعہ تعلیم اردو زبان قرار دی گئی تھی بس پھر کیا تھا حیدرآباد دکن
، اردو اپنے ترقی کے زینے کچھ اس طرح طے کیا کہ تمام دنیا حیرت میں رہ گئی اور آج یہی
سے اردو زبان دنیا کی تیسری بڑی زبان بن گئی ۔
بہرحال جس زبان کو حکومت کی سرپرستی مل جائے اور خود زبان میں مٹھاس ہو تو پھر
سکے ترقی کرنے میں دیر نہیں لگتی ۔

اس سنہرے دور میں جہاں شاعروں ۔ ادیبوں ۔ امیروں ۔ شاہوں اپنوں اور غیروں
اردو کی ترقی میں مدد کی ۔ پر اردو صحافت یعنی اخبارات و رسائل نے کوئی
ر باقی نہیں رکھی ۔ آئیے اب ہم اردو صحافت کے زیر عنوان سلسلہ وار تاریخ کی روشنی میں

چند مشہور زمانہ اخبارات اور رسایل کا تفصیلی جائزہ لینگے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کسی بھی زبان کی ترقی کا دارومدار زبان کے عام آدمی تک پہنچنے پر منحصر ہوتا ہے اور یہ کام بعض ناموں اور رسائل کے ذریعہ بہت آسان ہوتا ہے کیوں کہ روزنامے " اخبارات " ملک کے کونے کونے میں اور گھر گھر میں پہنچائے جاتے ہیں۔ قاری کو جب گھر بیٹھے دنیا بھر کی خبریں ملتی ہیں تو پر اسکی مادری زبان کو سمجھنے اور زمانے سے اپنا ایک رشتہ جوڑنے میں مدد دیتے ہیں۔

"اخبارات و رسالے"

ہندوستان میں اخباروں کا آغاز جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے انگریزی اخبار وغیرہ سے ہوا تھا۔ حیدرآباد میں بھی اخبار کا آغاز انگریزی اخبار " دکن ٹائمز " جو ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا تھا اسکے بعد چند اور انگریزی اخبارات بھی شائع ہوئے۔

اردو میں ہفتہ وار و روزناموں کی اشاعت"

حیدرآباد میں ۱۸۵۹ء میں حکومت آصفیہ کے میڈیکل کالج کے پرنسپل کی ادارت میں ایک طبی رسالہ شایع ہوتا تھا جس میں مختلف امراض اور مریضوں و دواؤں کے بارے تفصیلات درج ہوا کرتی تھیں۔ یہ سہ ماہی رسالہ تھا۔

رسالہ مخزن الفواید (مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) نے جماد الاول ۱۲۹۱ میں جسمیں علمی، اخلاقی مضامین کے علاوہ تاریخ فلسفہ۔ سائنس۔ اخلاقیات پر دلچسپ مضامین بھی شامل رہتے تھے۔ یہ سرکاری "مطبع دار الطبع" میں طبع ہوا کرتا تھا۔

ہفتہ وار اخبار حیدرآباد کا پہلا ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر جناب نارائن راؤ صاحب تھے اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اردو کی ترقی اور ترویج میں غیر مسلم بھائیوں نے شروع سے ہی عملی طور پر کام کیا ہے۔ اخبار کا نام تھا۔ " آصف الاخبار " جو ۱۸۷۸ء میں اجرا ہوا۔ اسکے علاوہ اس دور کے چند اہم ہفتہ وار اخبار درج ذیل میں دیئے گئے ہیں۔

نام اخبار	ایڈیٹر	سنہ اجرا
شفیق	سید حسن رضخانی	۱۸۸۰ء
ہزار داستان	محمد سلطان عاقل	۱۸۸۲ء
شوکت الاسلام	حاجی فرقان	۱۸۸۳ء
معلم شفیق	محب حسین	۱۸۸۴ء

اس دور کی خاص بات یہ تھی کہ دکن زبان کی جگہ دہلی اور لکھنؤ کا اسلوب بیان غالب آنے لگا۔ تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا جانے لگا۔ الفاظ کے استعمال میں بھی فرق آنے لگا۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریزی زبان سے کتابوں کا ترجمہ ہونے لگا۔ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ بھی ہونے لگا جو کہ ایک نہایت کامیاب کوشش تھی۔ اس دور میں علمی ادبی رسالوں ہفتہ دار اخباروں اور روزناموں کی اجرائی سے اردو زبان کی ترقی میں غیر معمولی تغیر آیا اور عام فہم اور سلیس زبان کی وجہ سے یہ کام اور بھی آسان ہو گیا تھا ابھی تک عام فہم زبان میں اضافے معمولی معلوماتی مضامین سے کر مشکل مضامین اور روزمرہ کی تازہ خبریں دینی معلومات و کھیل کود کی معلومات سیاسی پس منظر ملک کا سامنے آنے لگا لوگ اخبار پڑھنے عادی ہونے لگے پس زبان کی ترقی کا یہ ہی راز ہے کہ رسالے اور ہفتہ وار اور روزانہ اخبارات سے دیس بدیس پڑھکر حظ لیا۔

اردو کا سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان قرار پانا :۔

اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کر سلطنت آصفیہ نے ایک اہم اور نمایاں کارنامہ انجام دیا تھا جسکو اہل اردو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ ایک بہت بڑا احسان اردو زبان والوں پر ۱۸۸۴ء میں کیا گیا ایک سرکاری گشتی کے ذریعہ۔ بس پھر کیا تھا اردو کے ترقی کے وہ دروازے کھل گئے جو ایک زمانے سے بند تھے۔ دیکھتے دیکھتے اردو نہ صرف ریاست حیدرآباد بلکہ سارے ملک میں کسی بے قابو آندھی کی طرح پھیل گئی۔ جب کسی زبان کو سرکاری

پشت پناہی ملتی ہے تو پھر وہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کرنے لگتی ہے۔ اُردو اب
کاروبار اور گھر بار کی عام زبان ہو گئی اردو کی اہمیت جیسے جیسے بڑھتی گئی ویسے ویسے اخبار
اور رسائل و ماہناموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ حکومت آصفیہ نے ہندوستان
اردو زبان کے مشہور شعرا اور مصنفین کی اپنی سلطنت میں طلب کر کر انکی منہ مانگی رقم
اور منصب عطا کی جسکی وجہ سے اردو کی ترقی تصنیف و تالیف اور ترجمہ وغیرہ میں بہت
قابل ذکر شعرا میں حضرت مرزا داغ دہلوی ہیں جو دربار رام پور کو خیرباد کہہ کر میر
شاہ کی دعوت پر آکر یہاں کے متوطن ہو جاتے ہیں آپ کو اعلیٰ حضرت غفران مکاں
آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں کی استادی کی عزت حاصل ہوئی۔
بہرحال اسطرح اُردو کی ترقی میں شاہوں ادیبوں شاعروں کے ساتھ ساتھ اخباروں نے
اہم رول ادا کیا۔ آیئے اب ہم اس دور سے اور آگے بڑھتے ہوئے اُن اخبارات اور رسائل
(ماہواری و ہفتہ واری) پر ایک تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھینگے۔
جیسا کے آپ جانتے ہیں کسی بھی زبان کی ترقی میں جہاں اخبارات و رسائل ایک
اہم رول ادا کرتے ہیں پر انکی اجرائی کے لیے مطالعہ (Tinapless) میں
کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔
۱۲۵۰ھ میں پہلا مطبع قائم ہوا۔ اسکے بعد شمس الامراء نے اپنا مطبع قائم کیا۔ پھر رفتہ رفتہ
حیدرآباد میں مطبعوں کی تعداد زیادہ ہوتی گئی، برقی پریس بھی قائم ہونے لگے۔
نستعلیق ٹائپ انجمن ترقی اردو اور سرکار عالی کے دارالطبع میں ٹائپ رائٹر
Type Writer بھی تیار کیا گیا۔ سرکار عالی کا تیار کردہ نستعلیق ٹائپ پسندیدہ
اور اپنی تکنیکی خوبیوں کی وجہ سے روزمرہ کے استعمال میں کافی مفید ثابت ہوا۔ اسی
میں اُردو کے کرنسی کے نوٹ بھی جاری ہو گئے اسطرح اردو کا سکہ کاغذ پر بھی چلنے
یہ اُردو کی ترقی کا سنہرا دور تھا جس میں اخبارات اور رسالوں نے بھی بڑھ چڑھ کر

ویسے تو اس دور میں کافی اخبارات اور رسائل اجرا ہونے لگے تھے جو سب کے سب اُردو زبان کی کسی نہ کسی طرح خدمت میں لگے ہوئے تھے سب کا ذکر کرنا یہاں پر ممکن نہیں ہے اسلئے صرف چند مشہور اور اہم اخبارات اور رسائل کا ذکر کیا جائے گا تاکہ مضمون طوالت نہ اختیار کر جائے۔

روزنامے

اخبارات اور رسالے

گنتی، نام اخبار روزنامہ	نوعیت	ایڈیٹر کا نام	تبصرہ
۱) مشیر دکن	روزنامہ	کشن راؤ داس دیورائے	سب سے قدیم اخبار ۱۸۹۹ء میں اشاعت ہوئی۔
۲) صحیفہ	"	"	یہ بھی قدیم اخبار ہے
۳) رہبر دکن	"	سید احمد محی الدین	مقبول عام اخبار تھا
۴) صبح دکن	"	احمد عارف	
۵۔ منشور	"	عبدالرحمن صاحب ایس	
۶۔ پیام	"	قاضی عبدالغفار	
۷۔ نظام گزٹ	"	حبیب اللہ وقار احمد	
۸۔ سلطنت	"	سید احمد اللہ قادری	
۹۔ حیات دکن	"		یہ پہلا ہفتہ وار تھا پھر روزنامہ ہو گیا
۱۰) میزان	"	غلام احمد	
۱۱) محب وطن	"	لچھما ریڈی	سنہ اشاعت ۱۹۴۶ء
۱۲) تنظیم	"	علی اشرف	" ۱۹۴۶ء
۱۳) وقت	"	عبدالرحمن ایس	" ۱۹۴۷ء

شاداب

۱۴) پیسہ اخبار " سید احمد اللہ قادری "

۱۵) اکبر؟ " شعیب اللہ خاں "

۱۶) خورشید " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

۱۷) عوام " اختر حسین "

ان روز ناموں کے علاوہ چند ہفتہ واری - پندرہ روزہ اور ماہوار (رسائل) شائع ہوتے رہے جن میں سے ہم چند اہم رسائل کا یہاں پر تذکرہ کریں گے۔

رسائل

ادبی اخلاقی علمی رسائل (ہفتہ واری - ماہواری) و پندرہ روزہ

شمارہ	نام	نوعیت	ایڈیٹر کا نام	سنہ اجرائی	تبصرہ
۱	افادہ	-	مرزا نظام شاہ	۱۹۱۶ء	
۲	العلاج	-	حکیم بشیر احمد	۱۹۱۷ء	طبی رسالہ
۳	اتالیق	-	عبدالرب کوکب	"	بچوں کا ر
۴	رہبر مزارعین	-	مظہر حسین	۱۹۱۸ء	زرعی رسا
۵	ثمرۃ الادب	-	عبدالسمیع	۱۹۱۸	نصیر الدین ہاشمی
۶	شعلہ	-	سید نوازش علی شعلہ	۱۹۱۸ء	حیدرآباد کے مشہو
۷	النساء		صغرا بیگم	۱۹۱۹	نسوانی رسالہ
۸	نونہال		مرغوب الدین	۱۹۲۰	تعلیمی رسالہ
۹	اردو	سہ ماہی	مولوی عبدالحق	۱۹۲۱ء	سہ ماہی انجمن
۱۰	خادمہ		مریم بیگم	۱۹۲۲ء	نسوانی رسا
۱۱	مجلہ عثمانیہ (سہ ماہی)			۱۹۲۶ء	جامعہ عثمانیہ
۱۲	ورزش جسمانی (سہ ماہی)		محمد صالح	۱۹۲۹ء	جسمانی صحت

۱۳ سائنس ۱۹۱۹ انجمن ترقی اردو

۱۴ حیدرآباد ٹیچر - ۱۹۲۹ء محکمہ تعلیمات کی جانب سے

۱۵ پھول - بیگم ابوبکر خاں ۱۹۲۹ء خواتین کا رسالہ کافی مشہور

۱۶ سفینۂ نسواں - صاحبزہ قریشی ۱۹۲۹ " " "

۱۷ ترجمان القرآن - ابوالاعلیٰ مودودی ۱۹۴۰ء بلند معیار کی وجہ سے کافی شہرت

۱۸ المسیلی - طلبائے سٹی کالج ۱۹۴۳ء طلبائے سٹی کالج کے مضامین

۱۹ مجلہ طیلسانین - قدیم طلبائے جامعہ عثمانیہ ۱۹۴۷ء بلند پایہ اور معیاری تحقیقاتی ہوتے تھے۔

۲۰ مجلہ تحقیقات (ماہوار) - ڈاکٹر محی الدین زور ۱۹۲۸ء ادارہ ادبیات اردو کا معیار جو آج تک بھی شائع ہو رہا ہے۔

۲۱ سید کس اطفال - سعد الدین ۱۹۲۸ء بچوں کا رسالہ

ان کے علاوہ اور بھی ہفتہ وار اور ماہواری رسائل شائع ہوتے رہے ہیں

ہفتہ وار رسالے

چند قابل ذکر ہفتہ وار رسائل کا یہاں سرسری ذکر کیا جائے گا۔

نام اخبار	اشاعت	نوعیت	نام ایڈیٹر	تبصرہ
۲۴ مستقبل	۱۹۴۵ء	ہفتہ وار	عظیم الدین	"
۲۶ ترجمان	۱۹۴۱ء	"	علی اشرف	"
۲۷ تاج	۱۹۴۶ء	"	سید حسین	
۲۸ ادیب	"	"	محمد عثمان و حسینی شاہد	
۲۹ مبصر	"	"	محمد صفدر	
۳۰ یاد	"	"	کرنل خواجہ [illegible]	

۳۱) صحت عامہ	"	پندرہ روزہ	حکیم لیق احمد
۳۲) تاجر	۱۹۴۷ء	ہفتہ وار	عبدالقدوس ہاشمی
۳۳) اقتدار	"	"	علی اشرف
۳۴) پیام امن	"	"	جانکی پرشاد
۳۵) نظام حیدرآباد	"	"	عزیز احمد
۳۶) آزاد حیدرآباد	"	"	ٹھاکر امراؤ سنگھ
۳۷) انتخاب	"	"	شیخ ابوالقاسم
۳۸) انصاف	"	"	سید احمد اللہ قادری
۳۹) اتحاد	"	"	سلطان بن عمر
۴۰) انقلاب	"	"	مرتضیٰ مجیدی
۴۱) جناح	"	"	سید اظہر حسین
۴۲) مجلس	"	"	سید نورالحق
۴۳) جمہور	"	"	سید ابراہیم وحید
۴۴) مدرس	"	"	احمد اللہ
۴۵) تعمیر دکن	"	"	محمد عبدالقادر
۴۶) دکن گزٹ	"	"	محمد عبدالقادر
۴۷) جنتا	"	"	حسینی شاہد

یہ رسائل و اخبارات ۱۹۴۷ء تک جاری ہوتے رہے اُن میں سے بعض جاری رہے اور کچھ بند ہو گئے اسی اثنا میں پولیس ایکشن ہوا تو آیئے اب تاریخ کو ہم پولیس ایکشن یعنی ۱۹۴۸ء کے بعد سے جائزہ لیتے ہیں۔

تاریخ اردو صحافت۔ پولیس ایکشن کے بعد

چند اہم اخبارات کا تذکرہ پولیس ایکشن کے بعد یعنی ۱۹۴۸ء کے بعد جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن ہوا اور نظام کی یعنی آصف جاہی حکومت اپنے اختتام کو پہنچی اور جمہوری ہندوستان میں حیدرآباد ضم ہو گیا۔ یہیں سے اردو کے زوال کا دور بھی شروع ہوتا ہے پھر بھی چند محب اردو اصحاب جن میں دانشوران۔ صحافی۔ ادیب و شاعر حضرات کی انتھک کوششوں کی وجہ سے آج بھی باوجود مخالف حالات کے حیدرآباد اردو کے علم کی بلند کر رکھا ہے۔ جسکی مثال اس بات سے بھی دی جاسکتی ہے کے ملک کی پہلی اردو یونیورسٹی کا قیام حیدرآباد میں ہو رہا ہے۔

اردو کی ترقی اور ترویج میں جہاں ملک کے نامور صحافی محترم جناب سید لطیف الدین صاحب (رہنمائے دکن) محترم جناب عابد علی خاں صاحب (سیاست) اور منصف کے ایڈیٹر جناب محمود انصاری نے سرگرم حصہ لیا ہے آیئے ہم چند اہم روزناموں کا ذکر کرتے ہوئے اس تحقیق مقالہ کو اختتام کو پہنچاتے ہیں۔

مشیر دکن: یہ حیدرآباد کا سب سے قدیم روزنامہ ہے جو ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا جسکے ایڈیٹر محترم کشن اور صاحب اور پھر اسکے فرزند داس دیورائے تھے۔ یہ ایک معیاری اخبار تھی جو سلطنت آصفیہ کے دور میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ مقبول عام اخبار تھا۔ ایک غیر مسلم بھائی کی اردو کی خدمت اور اس سے محبت اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کاش آج سے اس بات پر غور کر کے سبق لے کر عمل کیا جائے تو بہتر رہے گا۔

رہنمائے دکن: یہ اخبار حکومت آصفیہ کے دور میں شائع ہوا یہ "رہبر دکن" کا قائم مقام ہے۔ سید احمد محی الدین مرحوم کی ادارت میں ۱۹۲۰ء میں جاری ہوا۔ پولیس ایکشن کے بعد رہبر دکن پر پابندی لگادی گئی جسکی وجہ سے بعد میں رہنمائے دکن کے نام سے یہ اخبار جاری ہوا۔ ۱۹۲۰ء سے آج تک جس ایڈیٹران صاحب نے اسکی خدمت کی ہے

حسب ذیل ہیں۔

۱) جناب سید احمد محی الدین سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک
۲) حامد محی الدین ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۳ء تک
۳) سید محمود وحید الدین ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک
۴) منور حسن ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۵ء تک
۵) " " ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۶ء تک
۶) سید لطیف الدین قادری ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۴ء تک
۷) سید وقار الدین قادری ۱۹۸۳ء سے تاحال

رہنمائے دکن کا اپنا ذاتی پریس ہے یہ ایک معیاری اخبار ہے اسمیں ادبی، ثقافتی تعلیمی، تہذیبی، سیاسی مضامین بہت ہی اچھے پیمانے پر جاری ہوتے ہیں عوام میں مقبول ہے بین الاقوامی حیثیت کا مالک ہے ہر دو شنبہ کو خصوصی شمارہ نکلتا ہے ادبی علاوہ ادبی انجمنوں کی بھرپور مدد و تعاون کرتا ہے۔ بہرحال اردو ادب کی ترقی میں و شبہ بنیادی رول ادا کر رہا ہے۔ خدا اس اخبار کو اور ترقی دے

<u>روزنامہ سیاست</u> : روزنامہ سیاست ۱۵ اگسٹ ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا۔ اخبار کے بانی مرحوم میر عابد علی خان صاحب ہیں جنکی ادارت میں یہ اخبار حیدرآباد کے تا کے بعد جاری ہوا اسکے جائنٹ ایڈیٹر جناب محبوب حسین جگر ہیں۔ جناب میر عابد علی اور جناب محبوب حسین جگر کی کوششوں اور کاوشوں کے نتیجے میں آج اخبار سیاست نمایاں مقام بین الاقوامی سطح پر بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ حیدرآباد کا سب زیادہ مقبول عام اخبار ہے اسکی اشاعت یومیہ ۵۰،۰۰۰ پچاس ہزار سے نیز تجاوز کر گئی ہے۔ یہ ۸ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے صفحہ پر ملکی اور غیر ملکی شائع ہوتی ہیں تو آخری صفحہ پر ریاستی خبریں شائع ہوتی ہیں پانچ کے صفحہ پر قا

اضلاع کی خبریں۔ فکر و نظر۔ فکر و خیال۔ ہماری ڈاک اور اداریہ قابل ذکر ہیں۔
موجودہ ایڈیٹر جناب میر زاہد علی خان صاحب بھی اپنے والد کی طرح بہت ہی محنتی اور
کامیاب صحافی ثابت ہو رہے ہیں۔ اخبار کے اسٹاف میں نامور شعرا ادیب دانشور
موجود ہیں۔ اخبار سیاسی۔ سماجی معاشی تعلیمی، ادبی اور معاشرتی پہلوؤں پر بے ٹوک
اور قابل ستائش تنقید بھی کرتا ہے تو بعض امور کی صراحت بھی ہے۔ اسلئے یہ اخبار
دن بدن ترقی کر کے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ سیاست حیدرآباد کے تقریباً 60٪
مسلم گھرانوں کے علاوہ غیر مسلم گھرانوں میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ میری نیک خواہشات سیاست
کے مالکین و اسٹاف کے ساتھ ہیں۔ خدا اس اخبار کو اور ترقی دے۔

روزنامہ منصف: روزنامہ منصف ۳ مارچ ۱۹۷۷ء کو محمود انصاری کی ادارت میں
شائع ہوا۔ روزنامہ منصف بھی حیدرآباد کے روزناموں میں ایک مقبول عام روزنامہ ہے جو
کبھی ۶ صفحات پر تو کبھی ۸ صفحات پر شائع ہوا کرتا ہے اس کے بانی جناب محمود انصاری
صاحب مرحوم تھے اب یہ اخبار محترم جناب مسعود انصاری صاحب کی ادارت میں شائع
ہو رہا ہے۔ یہ ایک بے باک ترجمان کی حیثیت سے کافی مشہور ہے۔ اس میں بھی
اداریہ کی جانب سے تنقید و تبصرہ شائع ہوتے رہتے ہیں ادیبوں اور شاعروں کا پسندیدہ
اخبار ہے کیوں کہ یہ ادبی انجمنوں ادیبوں اور شاعروں کی بہت ہمت افزائی کرتا ہے
ادبی، سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی معلوماتی بیانات شائع کر کر اخبار دن بدن ترقی
کر رہا ہے روزنامہ منصف آج ان تین بڑے اخباروں کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے جنکے نام
حسب ذیل ہیں۔ رہنمائے دکن۔ سیاست۔ منصف۔ الغرض یہ اخبار اپنے معتود اسٹاف
اور کافی پڑھے لکھے اسٹاف کی اعانت سے دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ ہماری نیک
خواہشات بھی اس اخبار سے وابستہ ہیں۔

انکے علاوہ حیدرآباد کے دوسرے روزناموں میں اس فہرست جو اخبار آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں
ملاپ، انگارے، ہمارا قدم، امر بھارت وغیرہ۔

انصار مہدی رضوی
۱۸۰-۱۱-۹ قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۸

میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے (غالبؔ)

(انجمن طلبائے قدیم مدارس کے جلسہ منعقدہ ۱۳ رمئی ۹۵ء میں پڑھا گیا۔ قارئین شاداب کے لیے پیش ہے۔)

کائنات کے مشاہدہ سے یہ بات ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہو گیا کیونکہ لاکھ انتظام اور احتیاط کے باوجود کوئی خامی رہ جاتی ہے یا پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ناقابل قیاس عرصہ سے انتظام کائنات درہم نہیں ہوا۔ صانع کا ارشاد مکمل جسکی کھے سکا آج تک حق ادا نہ ہوا۔ سخندانی کا دعویٰ کرنے والے بھی دعوئی صنعت و تخلیق کیا ثابت کرتے تشریح تخلیق انسانی بھی دست قدرت کی شاہکار ہے جسکو تمام ترقی کے باوجود کما حقہ تا حال سمجھا نہ جاسکا کی گتھیاں سلجھائے نہیں سلجھتیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ انسان خود اپنے اعصابی نظام پر مکمل علم کا کب د باب مدینۃ العلم حضرت علی علیہ السلام نے صدیوں قبل فرمایا تھا کہ انسان بھی قدرت کی عجب مخلوق ہو بولتا ہے چربی سے دیکھتا ہے اور ہڈی سے سنتا ہے۔ اس ارشاد کی توضیح سائنس کی ترقی سے ہوئی کہ بات بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے کیونکہ زبان سے بولا جاتا ہے اور زبان گوشت ہی سے بنی ہوتی ہے مگر دیکھنے کا معاملہ بہت عمیق ہے جسکے لئے سطحی نظر کافی نہیں۔ سائنس داں بھی تکمیل تحقیق میں سرگرداں اور اوقات قدرت سے قاصر ہیں مشاہدہ تو یہ بتاتا ہے کہ جوں جوں سائنس ترقی کرتی ہے خود اپنی تحقیق کی تردید نظریات پیش کرتی ہے عرصہ تک خیال تھا کہ انسان آنکھ کی پتلی سے دیکھتا اور کان کے اندر پردہ سے سنتا ہے۔ ہڈی سے سننے اور چربی سے دیکھنے کا علم تو تھوڑے وقت ہوا جب کہ قریب میں لامتناہی تحقیق کے نتیجہ میں معلوم ہوا کہ آنکھوں کی پتلی کے آخر میں چربی کی تہہ ہے جس پر پتلی کے ذریعہ انعکاس نور ہوتا ہے اسی کو دیکھنا ہے۔ اس تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے کیمرہ ایجاد ہوا۔ یہ بھی پتہ چلا کر پردہ سماعت سے متحرک ہڈی ہے۔ آواز ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی اسی ننھی سی ہڈی سے ٹکراتی ہے تو ہڈی میں پیدا ہو کر پردہ سماعت سے ٹکراتی ہے جس طرح نقارہ پر چوب پڑتی ہے اور یہی عمل سماعت ہے۔ علم تشریح بدن (Anatomy) پر ہے اور نہ مضمون نگار اس پر گفتگو کا اہل ہے۔ عنوان سے فکر مقصود ہے۔

جسمِ انسانی میں کان سر کے دونوں جانب نمایاں مقام پر ہوتے ہیں اس اہم عضو کی تخلیق کا جو کچھ بھی تکنک ہو مگر انسان نے استعمال کے کئی طریقے ایجاد کر لئے ہیں کسی پر رعب جمانا ہو یا warning دینا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کان کھول کر سن لو، وہ تو کھلے ہوتے ہی ہیں، منشا یہ ہوتا ہے کہ یہ تاکید ہے، خلاف ورزی نہ ہونے پائے یہ کان ہی ہیں جو آسانی سے دوسروں کے ہاتھ آجاتے ہیں جس کو غصہ آتا ہے پہلے ہاتھ کان ہی پر جاتا ہے ایک لڑکا چھری لے کر اپنے دونوں کان کاٹنے پر آمادہ تھا۔ ماں لپکی ہاتھ سے چھری چھین لی اور ڈانٹا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ لڑکے نے کہا! نہ کان رہیں گے نہ ماسٹر صاحب اینٹھیں گے۔

کان مدافعت بھی کرتے ہیں۔ ادھر کسی کو غصے میں دیکھا اور دونوں کان پکڑ کر توبہ شروع کر دی غصہ ٹھنڈا پڑ گیا، آئی بلا ٹل گئی۔ سزا میں شدت پیدا کرنے اور اہمیت جتانے کے لیے کان پکڑ کے اٹھک بیٹھک کروائی جاتی ہے تاکہ دوسرے دیکھیں اور عبرت حاصل کریں ورنہ یہ بھی سزا بھگت کے بھی "بدمزہ نہ ہوا" سے فائدہ اٹھا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ورزش کر رہا تھا۔ قدرت نے دونوں کان ایک ہی مقصد سے وضع فرمائے مگر کچھ حضرات دو کانوں سے مختلف دو کام لیتے ہیں یعنی اِس کان سنا اُس کان سے نکال دیا۔ ایک قسم اور بھی ہے جنکو سننے سے انکار نہیں ہوتا مگر ان سنی کر دیتے ہیں ایسے لوگ یا تو بااختیار و اقتدار ہوتے ہیں یا سیاسی، بے حیا بھی ایسا کرتے ہیں۔ کچھ سننے کی نعمت سے مالا مال ہونے کے باوجود محرومی کا اظہار کرتے ہیں۔ فائدہ یہ حاصل کرتے ہیں کہ کوئی کچھ کہے یہ اپنے مطلب کی سنتے ہیں عذر یہ ہوتا ہے کہ ثقلِ سماعت ہے عذر معقول سمجھ کر لوگ درگزر کر دیتے ہیں۔
غالب نے بھی استفادہ کیا ہے ؎ بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات ۔۔ سنتا نہیں ہوں بات، مکرر کہے بغیر
کانوں کے تعلق سے یہ بھی ہدایت کی ہے ؎ نہ سنو گر بُرا کہے کوئی۔

کسی نے ایک دانشور سے پوچھا! میاں بیوی میں محبت و اتفاق کی کیا ترکیب ہے؟ دانشور نے کہا یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ یا تو بیوی گونگی ہو یا شوہر بہرا۔

کان کی ساخت میں قدرت نے یہ اہتمام کیا کہ آوازیں گھوم پھر کر پردۂ سماعت تک پہنچ جائیں جیسے بھول بھلیاں حضرتِ انسان نے اس مخصوص کام کیلئے وضع کئے گئے عضو سے غرور و تمکنت، تملق کے مظاہرہ کا کام لینا شروع کر دیا دوسروں کی نظر زیادہ تر سر سے گردن تک ہی پڑتی ہے اور کان سر اور گردن کے بیچ میں واقع ہوئے ہیں ۔ اوپر سے نیچے دیکھئے یا نیچے سے اوپر، کانوں پر نظر ضرور پڑے گی ۔ قدرت نے کان کیلئے ایک ہی سوراخ کو کافی سمجھا لیکن انسان نے اتنے سوراخ چھید ڈالے کہ ہر سوراخ کسی نہ کسی زیور کا ہولڈر۔ دولت کی ریل پیل ہے تو سونا، جواہرات سے

کان لٹکے پڑے ہیں، پھٹ پڑے ایسا سونا جس سے ٹوٹیں کان غریب' چاندی اور کم قیمت دھاتوں سے کچھ کیس بنا لیتے ہیں۔ سونے اور جواہرات سے مَس ہو کر جب آوازیں کان سے دماغ تک پہنچتی ہیں تو دماغ ریڈیم کا بن جاتا ہے' دماغ سے یہ بات نکل جاتی ہے کہ سب کی تخلیق قطرہ نجس سے ہوتی ہے اور مادرِ نجس سے پرورش۔ تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ بس واہ وا' ماشاءاللہ' سبحان اللہ' حضور' تقصیر' خداوند' مالک کی صدا کانوں تک پہنچتی رہیں۔ انسان خود خدا نہیں بن بیٹھتا۔ آوازیں خدا بنا دیتی ہیں۔ کچھ اور دماغ خراب خود کو رازق اور رب العالمین سمجھنے لگا۔ "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔" مرید کانوں ہی کو آکر کاٹتے ہیں بجز اسکے کہ کوئی پیدائشی بہرا ہو فضاؤں میں گونجنے والی آوازوں کا کان میں پڑنا ضروری ہے ہر آواز جو کان میں پڑتی ہے وہ سنی نہیں جاتی۔ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سمجھنے کا سوال ہی نہیں بس کانوں کے دیوتا سے مجبوری ہے۔

پڑی ہوئی آوازوں کو دماغ تک پہنچا کر کان اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ آگے کا کام دماغ کا ہے لیجئے ماہر علمِ اخلاق حضرت علی کا ایک ارشاد یاد آگیا۔ فرمایا! "یہ نہ دیکھو کس نے کہا' یہ دیکھو کیا کہا" (دیکھنے کے معنی سننے کے ہوئے) گویا دماغ سے فلٹر کا کام لیا جائے۔

قانون نے کانوں کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ سنی سنائی کو بحرف ناقابلِ ادخال شہادت قرار دیا بلکہ پھیلانے کو قابلِ تعزیر قرار دیکر دفعہ ہی وضع کر دیا۔ ہاں! آنکھوں دیکھی کو قانون معتبر سمجھتا ہے اردو میں ایک کہاوت مستعمل ہے "آنکھوں دیکھی کہتا نہیں، کانوں سنی کہتا ہوں" گویا راوی نے کانوں کو بے اعتباری ظاہر کرکے واقعہ کی صحت یا عدم صحت کی ذمہ داری سے خود کو بری الذمہ قرار دے لیا۔

ایک عام طریقہ ہے کہ کوئی راز کی بات کہنا ہوتی ہے تو کہتے ہیں! ذرا کان قریب لائیے تو سنئے مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ "دیوار ہم گوش دارد" کان کسی بات کا امین نہیں ہوتا یہ محض آلۂ ترسیل۔ حفاظت مرسل الیہ یا عمل کنندہ کا فرض ہے۔ زبان کہاں خاموش رہتی ہے۔ "زبان سے نکلی کوٹھوں چڑھی" یہ کوٹھوں چڑھی ایڈز سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ عام طور پر دوسروں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کچے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سب کانوں کے کچے ہیں وجہ یہ ہے کہ ہم منافقوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ منہ لگی بات کا یقین کر لیتے ہیں۔ بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو سننے کے بعد تحقیق سے حقیقت معلوم کریں قبل اسکے کہ کان الٹے جائیں کانوں سے ہوشیار۔

پروفیسر محسن احسان
(پشاور یونیورسٹی)

دعائیہ غزل

(ہند پاک دوستی کے نام)

اسیرِ دامِ حزنیاں ہیں آپ بھی ہم بھی
حقیقتوں سے گریزاں ہیں آپ بھی ہم بھی

فسادِ موسمِ برق و شرر گزر جائے
تو میرِ صبحِ درخشاں ہیں آپ بھی ہم بھی

اگرچہ دشمنِ انسانیت نہ آپ نہ ہم
تو کیوں عدوئے دل و جاں ہیں آپ بھی ہم بھی

اب اور اپنے دکھوں میں نہ ہم اضافہ کریں
دکھوں سے دست و گریباں ہیں آپ بھی ہم بھی

مزاجِ غنچہ و گل ہم اگر سمجھ جائیں
تو پھر فدائے گلستاں ہیں آپ بھی ہم بھی

جبیں پہ کس نے ہمارے کدورتیں لکھ دیں
کتابِ چہرۂ خنداں ہیں آپ بھی ہم بھی

چلو کہ سوزنِ مژگاں سے چاکِ دل سی لیں
گدائے بے سر و ساماں ہیں آپ بھی ہم بھی

چلو ادائے محبت سے جسم و جاں ڈھانپیں
ہجومِ دہر میں عریاں ہیں آپ بھی ہم بھی

چلو کہ ہم نئے سانچے میں زندگی ڈھالیں
عداوتوں سے پریشاں ہیں آپ بھی ہم بھی

چلو کہ دونوں چمن خوشبوؤں سے مہکا دیں
نسیمِ امن کے خواہاں ہیں آپ بھی ہم بھی

مئی ۱۹۹۵ء

شاداب

وقت کا تقاضا

محمد امان علی ثاقب صابری
۴۶۷-۸-۲۲
پرانی حویلی حیدرآباد

وقت کے اس تقاضے کو پہچان لو
حق تعالیٰ کی مرضی پر چلتے رہو
چاک ہونے نہ دو دامنِ صبر کو
مصطفیٰؐ جانِ رحمت کو آواز دو
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

معرکہ حق و باطل کا پھر ہے بپا
اِس طرف جوشِ ایماں اُدھر اسلحہ
ہے یہود و نصاریٰ کا واں جمگھٹا
اِس طرف حق کی نصرت کا اک ولولہ
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

پھر الٹ دی ہے تاریخ اپنے ورق
خونِ انساں سے رنگیں ہوا ہے اُفق
اب زمانہ ہمیں دے رہا ہے سبق
مردِ میداں بننا ہے پھر بہرِ حق
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

عزم راسخ سہارا ہے آفات میں
ہر اجالا ہے اپنی روایات میں
کام لینا ہے ہمت سے خطرات میں
گھوڑے دوڑا دیئے بحرِ ظلمات میں
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

کھیل تلوار و خنجر کا ہے چارسو
زخم خوردہ نظر آتے ہیں کو بہ کو
کچھ فسادات چھپ کر تو کچھ روبرو
رزم کا سلسلہ ہے منتظر کبھو دو بدو
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

خون اپنا نہیں جائے گا رائیگاں
پوچھیے ان سے وہ جو ہیں تاریخ داں
ہم تو دیتے رہیں گے یونہی امتحاں
اب دکھائے گا انجام وہ آسماں
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

ہم ہیں ابنائے ملت بیضا بھلے
اور طوفان کی گود میں ہیں ہم پلے
آیئے اب تو ملت کے پرچم تلے
سطح دریا پہ کشتی سلامت چلے
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

غمزدوں دکھ بھروں کی حمایت کرو
مال و دولت سے ان کی اعانت کرو
خوش عقیدت کو شمع ہدایت کرو
دین اسلام کی طرح سے خدمت کرو
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

اب لرزتا ہے ثاقب کے ہاتھوں قلم
دیکھ کر چار جانب یہ ظلم و ستم
ہم جو کٹتے رہیں گے نہیں اس کا غم
خون سے روشن رہے اپنی شمع حرم
حق کی رسی کو مضبوط اب تھام لو
وقت کا بھی تقاضا ہے یہ دوستو

عزیز بھارتی
صدر مرکز ادب

قطعات

کچھ روز قبل شہر میں اک واقعہ ہوا
کچھ لوگ اپنے ظرف کا نیلام کر گئے
بے روح شخصیت کو لیے جی رہے ہیں وہ
بے چارے اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے

○

حرص و ہوس میں خود کو جلا لیتے ہیں کچھ لوگ
طوفان اپنے سر پہ اٹھا لیتے ہیں کچھ لوگ
پہنچانے دھواں اپنے پڑوسی کے مکاں میں
خود اپنے گھر میں آگ لگا لیتے ہیں کچھ لوگ

○

خلوص دل نہ ہو جس میں مجھے وہ پیار نہ دو
میں بے قرار ہی بہتر ہوں تم قرار نہ دو
وجود ہی نہیں جس کا تمہاری فطرت میں
خدا کے واسطے تم ایسا اعتبار نہ دو

○

ڈاکٹر ایم، ایم خان منصور
پروفیسر وصدر شعبہ انگریزی
چھندواڑہ - ایم - پی

غزل

مجھے ہے بھنور میں ڈالا مجھے گھر سے جو نکالا
کہوں کیا اسے کہ کیا ہے وہ غضب جو تو نے ڈھایا

مرا عشق تری ضرورت ترا حسن مری ضرورت
تو نے مجھ کو کیا پھنسایا میں نے تجھ کو کیا پھنسایا

کیا غضب تھی زندگی کی وہ بہار جو دل میں آئی
مجھے دی ہوس جو گل کی تری خار بھی چھپایا

ترا شکریہ ادا میں کروں کس طرح ہے انجمن
جو بھی باغباں رہا ہے مرا آشیاں اجاڑا

جس نظر نے مجھ کو بخشی مری زندگی کی ہیبت
وہ نظر ہی اس نے مجھ سے زدہ کرم چرایا

وہ جنون تھا یا کیا تھا ترے حسن کا سحر تھا
تو کبھی جو یاد آیا ترے ہوش کو اڑایا

کبھی ہمنفس تھے منصور کسی شخص کے تو ہوں گے
ذرا وہ بھی بھول بیٹھا، ذرا وقت نے بھلایا

o

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

غزل

دیکھا جو میں نے آج وہ پہلوئے دہر تھا
وہ شہر جس کا نام اجالوں کا شہر تھا

تیشے کی کیا مجال تھی پتھر تراشتا
عزم و جنوں ہی باعث تخلیق ہنر تھا

زخموں کی اوٹ سے جسے دیکھا تھا دور سے
پہچانئے وہ کیا تھا، کرم کہ قہر تھا

چہرے اتر گئے جو سنی میری گفتگو
لفظوں کے پیرہن میں حقائق کا زہر تھا

ٹکرا کے آج میں لب ساحل بکھر گیا
میرا وجود جیسے سمندر کی لہر تھا

ہمراہیوں سے روشنی ہے یہاں مدعائے حیات
تاریک آرزو کی صلیبوں کا شہر تھا

رحمت نہیں رہا مئے گل گوں میں کچھ اثر
وجہ سرور ہجر کی راتوں کا زہر تھا

○

سعید شرجی
دوجہ قطر ۔ P.O ۔ ۳۳۸۷

غزل

جو وقت گذرا ہے گویا سراب جیسا تھا
یہ فانی دنیا کا منظر بھی خواب جیسا تھا

جو دیکھا مصحفِ انور تو دل ہوا مسرور
تمہارے چہرہ بھی گویا کتاب جیسا تھا

سخن نواز اور دلبری کا پیکر تھی
جو لفظ لفظ بھی گویا خطاب جیسا تھا

اُسے بھی سازشِ دنیا نے کر دیا میلا
جو شخص میری نظر میں گلاب جیسا تھا

ہزاروں پھول تھے رنگت میں خوشنما خوشبو
وہ سارے پھولوں میں لیکن گلاب جیسا تھا

میں سوچتا ہوں تو ہوتی ہے دل کو ایک حیرت
تمہارا وصل کا منظر بھی خواب جیسا تھا

فلک پہ غم کے بھی آثار کچھ نمایاں تھے
فلک کا رنگ بھی کالا سحاب جیسا تھا

سمجھ رہے تھے جو دنیا کو دائمی راحت
خیال و خواب تھا یہ بھی سراب جیسا تھا

جو دینِ حق پہ چلا اس کی بات کیا کہئے
خدا کی راہ میں وہ ماہتاب جیسا تھا

اسی پہ فخر تھا انساں کو کس قدر ہمدم
یہ رنگ روپ بھی انساں کا خواب جیسا تھا۔

سکوں کا نام نہ تھا ہر طرف ہے ہنگامہ
یہ ماجرا بھی سعید اضطراب جیسا تھا۔

○

غزلیں

بشیر امجد
چار قت مرلی۔ آغا پورہ

ترا پیار دل سے بھلایا نہ جائے کسی اور سے دل لگایا نہ جائے
کچھ اس طرح اس نے زباں بند کی ہے کہ افسانۂ دل کا سنایا نہ جائے
میں آیا نہیں ہوں بلایا گیا ہوں بھری بزم سے یوں اٹھایا نہ جائے
اک اپنی خوشی اور بھلائی کی خاطر کسی اور کا دل دکھایا نہ جائے
اگر روشنی کی ضرورت ہے تم کو پڑوسی کے گھر کو جلایا نہ جائے
اگر چاہتے ہو تم احسان کرنا تو احسان کر کے جتایا نہ جائے
بھلانا ہے اسکو بھلا دیجئے امجد
نیا درد دل میں بسایا نہ جائے

شفیع اللہ خاں راز اناوی

زیست کی رہگذر ہے رنجیدہ آدمی کا سفر ہے رنجیدہ
زندگی سر بسر ہے رنجیدہ آجکل ہر بشر ہے رنجیدہ
ہر خوشی ناگوار لگتی ہے دل کسی کا اگر ہے رنجیدہ
حال پوچھو نہ تم پرندوں کا طاقتِ بال و پر ہے رنجیدہ
غم زدہ بحرِ بیکراں ہوگا ایک قطرہ اگر ہے رنجیدہ
بیکسوں نے تو پی لئے آنسو ہر ستمگر مگر ہے رنجیدہ
گلستاں ماتمی لباس میں ہے رنگِ برگ و شجر ہے رنجیدہ
کسقدر غم زدہ فضائیں ہیں حسنِ شام و سحر ہے رنجیدہ
قافلے رو رہے ہیں رستے میں
راز ہر راہبر ہے رنجیدہ

ڈاکٹر سید حسن بی اے۔ ڈپلوما ان فزیو تھراپی

غزلیں

طوفاں ہے اور وقت کا دریا ہے سامنے
جانا جو ہے تو ڈوب کے جانا ہے سر

تصویر دیکھئے تو ذرا میرے شہر کی
محشر کا اک کھلا ہوا نقشہ ہے

نفسی ہی نفسی چار سو، راہ وفا ہے بند
جاؤں کہاں میں کونسا رستہ ہے

بھرتا ہے کان کوئی فقیہان شہر کے
خود مطلبی کا دیکھئے چرچا ہے

شہرت کے تار پر جو چڑھے کوئی عنکبوت
اہل خرد کے حق میں تماشہ ہے

میں جس میں جا رہا تھا گماں کی وہ دھوپ تھی
پلٹا ہوں اب یقین کا سایہ ہے

اپنی انا کو بڑھ کے بچانا پڑا مجھے
اک مرحلہ تو ایسا بھی آیا ہے

دیکھیں کہ کس کا عزم یقیں کس کا چور ہو
پتھر ہے اس کے ہاتھ میں شیشہ ہے

لکھنی تھی اپنی بات پہ کیا لکھ گئے حسن
دیکھو اسی کی بات کا خاکہ ہے سامنے

[۲] ابو الفاروق مشعور

رہتا ہے انتشار سے محفوظ وہ مقام
وحدت کے جام کی جہاں ہوتی ہے ر

بعض فیوض اہل نظر، اہل دل ہے وہ
آتا نہیں ہے حسن جہاں کے جو

جن کی نگاہ و دل میں ہے تو ہی بسا ہوا
رہتا ہے ان کے لب پہ ترا نام

اصلاح میکدہ کی توقع فضول ہے
جب تک نہ میکدہ کا بدل جائے

آئے زمیں قبر پر وہ لگانے کو شاخ گل
کانٹے جو زندگی میں بچھاتے تھے

وہ پردہ جھوٹ ڈالنا جن کا ہے مشغلہ
ظاہر میں لیتے رہتے ہیں وہ قائدہ

کیا سو گئے شعور عنادل۔ بہار میں
زاغ و زغن چمن میں ہوئے قابض

اسلم ڈبائیوی
"اپنکا ہینڈلوم ایمپوریم"
ڈبائی بلند شہر یوپی ۲۰۲۳۹۳

غزل

یہ کیا عجب ہے یہ کیا ہے تمہاری بستی میں — وفا نہیں ہے سُنا ہے تمہاری بستی میں ہے
یہاں امیر غریبوں کا خون پیتے ہیں — الگ الگ یہ سُنا ہے تمہاری بستی میں
دھواں دھواں ہیں سبھی پہ مکان کیوں دیکھو — یہ کیسا شور اٹھا ہے تمہاری بستی میں
وہاں غریب ہے شاید خدا ابھی دور ہے — پڑے پڑوں کا خدا ہے تمہاری بستی میں
فلک کے چاند ستارے بھی رو دیئے جس پر — وہ مرد قتل ہوا ہے تمہاری بستی میں
زمیں پر بھی ہے موجود جنت الفردوس — یہ راز آ کے کھلا ہے تمہاری بستی میں

سروں سے جائیگا اسلم نہ عشق کا سودا
وہ رنگ ہم نے بھرا ہے تمہاری بستی میں

(۲)

شاغل ادیب۔ ایم۔ اے
مشیر آباد

سزا جنوں کی دوانو! فقط یہی ہو گی — ستم کی سولی پہ لٹکی یہ زندگی ہوگی
تمام رات طلوع ہوگا چاند سے تیرا — تمام رات نگاہوں میں چاندنی ہوگی
چراغ دل کے جلانا ہمیں کو آتا ہے — ہمیں سے جادۂ تیرہ میں روشنی ہوگی
لہو ہمارے بدن کا نہ جائیگا بیکار — اسی سے چہرۂ انساں پہ تازگی ہوگی
شجر دکھائی نہ دیں گے کہیں تمنّا کے — رہ حیات میں اب صرف دھوپ ہم ہوگی

یہ شاعری تو ہے انعام ربّی اے شاغل
کہا یہ کس نے ہنسک اس سے آپ کی ہوگی

غزلیں

جمیل نظام آبادی ایم اے

(۱)

کیسا سفر کہاں کا سفر لوٹ جاؤ تم ہر موڑ میں چھپا ہے بھنور لوٹ
تم نے ستاروں سا تھا مرا رات بھر دیا اب بجھ چکا ہے لو بکھر لوٹ
امید و آرزو میں وفاؤں میں پیار میں کرنا پڑیگا خونِ جگر لوٹ
بستی ہے قاتلوں کی کہاں پاؤگے اماں اچھا یہی ہے بھائی اگر لوٹ
حسرت سے چاند تارے تمہیں دیکھنے لگے لگ جائے نہ کسی کی نظر لوٹ

اس پرفریب شہر میں سچ بات مت کہو
بہتر ہے یہ جمیل کہ گھر لوٹ جاؤ تم

میر علاؤالدین دلؔ ہاشمی، ۲۸۲-۲-۱۲ مراد نگر (۲)

تشنہ جذبہ شراب میں دیکھا
عکسِ دنیا حباب میں دیکھا
برق گویا بدن میں لہرائی
ایک طوفاں شباب میں دیکھا
جسکو دنیا کی چاہ تھی ہردم
اسکو ہردم عذاب میں دیکھا
ایک چہرا تھا آئینہ کیطرح
وہی چہرا نقاب میں دیکھا
کس نے سمجھا ہے غم مرا اے دلؔ
کس نے دل کی کتاب میں دیکھا

ش۔ا۔خان۔انور
محلہ مکان ۲-۶-۷۷
عاطل آباد ۵۰۰۰۴۰

غزل

روشنی کے دامن میں ظلمتیں کچھ ایسی ہیں
دل وفا سے خالی ہیں، الفتیں کچھ ایسی ہیں

آدمی کو مشکل ہے، آدمی سمجھنا بھی
صورتیں کچھ ایسی ہیں سیرتیں کچھ ایسی ہیں

کچھ دوا کی دیوانے، فکر ہی نہیں کرتے
دردِ عشق میں شاید لذتیں کچھ ایسی ہیں

ہم جفا نہیں کرتے، وہ وفا نہیں کرتے
کیا کریں گے دونوں کی فطرتیں کچھ ایسی ہیں

چھپ رہے ہیں نظروں سے، بس رہے ہیں دل میں وہ
دوریاں کچھ ایسی ہیں، قربتیں کچھ ایسی ہیں

جیسے گل سے خوشبو کو، روح کو بدن سے ہے
ہم کو عشق میں اُن سے نسبتیں کچھ ایسی ہیں۔

لوح پر رہا ہوں میں، عرش پر گیا ہوں میں
خاک ہوں مگر میری عظمتیں کچھ ایسی ہیں

دہر سے سب پوشیدہ، سب میں پھر بھی گردیدہ
حسن کی زمانے میں شہرتیں کچھ ایسی ہیں

ترکِ عشق پر مائل ہوتا ہی نہیں ہے دل
بے قراریوں میں بھی راحتیں کچھ ایسی ہیں

صرف ہاتھ ملتے ہیں، اور دل نہیں ملتے
آجکل زمانے میں، چاہتیں کچھ ایسی ہیں

ہم گذر ہی جائیں گے، آنے والوں سے کہئے
راہِ عشق میں انورؔ آفتیں کچھ ایسی ہیں

○

غزلیں

محمد قمر الدین صابری

(۱)

بہ فیضِ ہجر وہ مجھ سے قریب تر آیا
جدھر بھی میں نے نظر کی وہی نظر آیا

مرے لہو نے کیا خون لالہ و گل کا
مرے جنون سے کانٹوں میں رنگ بھر آیا

کلی چٹک کے چمن میں بہار لے آئی
کھلا جو پھول بہ اندازِ نو نکھر آیا

انہی سے ہو گئی ہر راہِ زندگی روشن
نظر کے راستے جب دل میں وہ اتر آیا

تھا اس کی بزم میں اس کا جمال ہوش رُبا
گیا تھا ہوش میں آیا تو بے خبر آیا

زمانہ جذبۂ صادق مٹا نہیں سکتا
دبا جو عشق تو اک بار پھر ابھر آیا

ادب کی چاندنی نزدیک و دور پھیل گئی
تمہاری بزم میں اس شان سے قمر آیا

○

محمد ایوب فاروقی صابر

(۲)

جب بھی گلشن پہ [illegible] سوال آتا ہے
جوش پھولوں میں تو کانٹوں پہ جلال آتا ہے

پرسشِ غم کے بہانے بھی وہ غم دیتے ہیں
چارہ سازوں کو مرے یہ بھی کمال آتا ہے

جشنِ نظارۂ خورشید منائیں [illegible]
مجھ کو ڈوبے ہوئے تاروں کا خیال آتا ہے

بار صدیوں کا اٹھاتے ہوئے ڈر بیٹھے
وہ تو لمحہ ہے جو بن کر مہ و سال آتا ہے

دن گذر جاتا ہے احباب کی دلداری میں
رات آتی ہے تو زخموں کا خیال آتا ہے

گرمیٔ شدتِ احساس نے ڈھالا ہے مجھے
ورنہ صابر تمہیں کب ایسا کمال آتا ہے

○

ماہنامہ
شاداب
حیدرآباد

جلد (۱۲)
شمارہ (۶)
جون : ۱۹۹۵ء
قیمت : ۶ روپے

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینیجنگ ایڈیٹر
...الدین صابری	رشید الدین	قدیر انصاری

مجلس مشاورت

...مہ عائشہ بیگم ۔ ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن خان منشا ۔ محترمہ سیدہ مہر ۔ پروفیسر تراب علی
ڈاکٹر یوسف الدین ۔ محمد منظور احمد منظور ۔ منیر احمد صدیقی

زر تعاون

...ستان	سالانہ ۶۵ روپے	پانچ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
...ممالک	۲۰۰ ،	۳۶۰ ،	۳۷۰۰ ،
...	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
...ستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
...ستان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ شاداب ۱۴۷-۵-۱ ریڈ ہلز حیدرآباد

...پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل آفسیٹ پرنٹنگ پریس سے چھپوا
...کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد، اے پی
...

فہرست

قمر صابری۔ ایڈیٹر شاداب

سورہ توبہ کی آیت ۳۶ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔

(مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کے حکم میں جس دن (۹/۳۶) اس نے پیدا کئے تھے آسمان و زمین ان میں چار مہینے ہیں ادب کے۔ یہی ہے سیدھا دین۔)

عرب میں قدیم سے معمول چلا آتا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے " اشہر حُرم " خاص ادب و احترام کے مہینے سمجھے جاتے تھے۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ ان میں خونریزی اور جدال و قتال قطعاً بند کر دیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ان مہینوں میں کوئی اپنے باپ کے قاتل سے بھی تعرض نہ کرتا۔ ملت ابراہیمی میں بھی یہ چار مہینے ادب و احترام کے مہینے قرار دئے گئے تھے۔ اسلئے اسے سیدھا دین یعنی دین ابراہیمی کہا گیا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ ان چار مہینوں میں ہر عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ اور ہر گناہ سے بچنا

عظم ہے۔ ماہ محرم الحرام اسلامی اور قمری سال کے اعتبار سے پہلا مہینہ ہے جس کی فض
فضیلت اسلام اور جاہلیت دونوں ادوار میں یکساں مسلم رہی ہے۔ اہل اسلام کے
محرم اور محرم میں یوم عاشورہ بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یوم عاشورہ محرم کا دسوا
دن ہے۔ نہایت مبارک اور تاریخی دن جس میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے ہیں
اللہ تعالیٰ نے اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو لشکر فرعون سے نجات بخشی
اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرقاب کیا۔ اسی یوم عاشورہ کو حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ
پہنچی تھی آنحضرت جب مدینہ پہنچے تو دیکھا یہود اس دن روزہ رکھتے ہیں آپ نے بھی روزہ ر
اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا۔ چونکہ یہود و نصاریٰ بھی اسی دن روزہ رکھتے تھے۔ اس لیے ان سے
امتیاز کی خاطر حکم فرمایا کہ ۹ محرم کو روزہ رکھا جائے۔ اس کے بعد دسویں محرم۔ اگر ۹ کو روزہ
رکھ سکے تو دس محرم کے ساتھ ۱۱ محرم کو تاکہ اس دن روزہ رکھا جائے۔ غرض عاشورہ
فضیلت کو قائم رکھا اور اس کے ساتھ ۹ یا ۱۱ کے روزہ کو ملا دیا گیا۔

آج یوم عاشورہ اس معرکۂ حق و باطل کی یاد دلاتا ہے۔ جو سرزمین کربلا پر برپا ہو
حضرت امام حسین کی شہادت کا دن ہے۔ یہ امام حسین کے ساتھیوں کے میدان کربلا
جام شہادت پی کر اپنی زندگی قربان کرنے کا دن ہے۔

اسی روز عاشورہ سے پہلے شب عاشورہ کی بھی بڑی اہمیت ہے یہ شب
والوں کے لیے قیامت کی شب تھی، آزمائشوں کی شب تھی نصرت حق میں ثابت قدم ر
شب تھی، امام حسین اور ان کے رفقاء ساری رات عبادت الٰہی میں معروف رہتے حضرت
اپنے ساتھیوں کے سامنے شب عاشورہ میں ایک تاریخی خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا۔ فوج یز
صرف حسین کے سر کی طالب ہے اس لئے دوسرے ساتھی کیوں اپنی زندگی قربان کری
انہیں اجازت ہے کہ شب کے پردہ میں خاموشی سے چلے جائیں۔ آپ نے چراغ گل کر
تاریکی کردی کہ جانے والوں کو حجاب نہ ہو۔ لیکن کوئی امام کو چھوڑ کر نہ گیا۔ وہ کسی رجوا

کے تحت امام کے ساتھ نہ تھے بلکہ ان کے نصب العین سے پوری طرح متفق تھے
صبح عاشورہ نمودار ہوئی امام کے حکم سے ان کے فرزند علی اکبر نے اذان کی۔ یہ ۱۸ سالہ جوان فرزند صورت میں رسول خدا سے بہت مشابہ تھے۔ رفتار و گفتار میں بھی مماثلت رکھتے تھے۔ لیکن یزیدی فوج کے سپاہیوں نے انہیں بھی نہ چھوڑا اور ان کے سینہ میں برچھی کا ایسا وار کیا کہ جوان بیٹے نے ۵۷ سالہ ضعیف باپ کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا۔ امام حسین کا ایثار دیکھئے کہ نہ صرف صبر کیا بلکہ سجدہ شکر ادا کر کے انسانی تاریخ میں قربانی کی ایک اعلیٰ و ارفع مثال پیش فرما دی۔
نماز سے فراغت پا کر حضرت حسین نے اونٹ پر سوار ہو کر یزیدی فوج کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔ امام حسین نے جان بوجھ کر گھوڑے کے بدلے اونٹ کی سواری منتخب کی کہ اس دور میں اونٹ امن کی سواری اور گھوڑا جنگ کی سواری سمجھا جاتا تھا آپ نے خطبہ میں فرمایا وہ جنگ نہیں امن چاہتے ہیں اسلام کے پیرو ہیں، اسلامی قدروں کے محافظ ہیں۔ اسلام صلح اور امن کا پیغامبر ہے اس لئے وہ جنگ پسند نہیں کرتے۔ آپ نے یزیدی فوج میں شامل افراد کے نام لے کر پوچھا۔ بتاؤ میری کس خطا پر یہ ظلم کر رہے ہو کہ اپنے نبی کے نواسے کے قتل پر آمادہ ہو۔ مخالف فوج سے کچھ جواب تو بن نہ پڑا۔ البتہ تیروں کی بارش شروع کر دی۔ امام حسین نے سمجھ لیا ان سے گفتگو بیکار ہے۔ اتمام حجت ہو چکی۔ اپنے ساتھیوں کو دفاعی جنگ کا حکم دیا۔ اس جنگ میں ایک طرف ہزاروں کا لشکر تھا تو دوسری طرف ۷۲ افراد جن میں ضعیف بھی تھے، شیر خوار اور کمسن بچے بھی۔ جوان بھی تھے اور پھر سر فروشی کا کیسا جذبہ تھا۔ حق پر ثابت قدم رہنے کا کیسا ولولہ تھا۔ اسلام کی حفاظت کی کیسی لگن تھی اور باطل شکنی کا کیسا حوصلہ تھا کہ یہ مختصر سی جماعت ایک بڑے لشکر کو خاطر میں نہ لائی۔ نہ کوئی خوف تھا نہ ہراس۔ بس ایک ہی خیال تھا کہ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت پی لیں۔ اور حسین کا حق رفاقت ادا کر دیں۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ جو

تمام ہو گیا۔ عصر کے وقت امام حسین یکہ و تنہا تھے۔ اس عالم میں بھی دشمنوں سے جنگ کر کے آپ نے یہ بتا دیا کہ خدا پر یقین کی قوت سبھی قوتوں سے بالاتر ہے، عزم محکم اور نفس مطمئن کے ساتھ حق کی حمایت کا جوش اور ولولہ مادی وسائل کی کمی سے متاثر نہیں ہوتا۔ آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ حق پرست افراد کی کثرت اور مادی وسائل کی فراوانی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت کو بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ زندہ رہتے ہیں تو حق کے لیے اور مرتے ہیں تو حق کی سربلندی کے لیے۔ وہ فکر و عمل کی بے جا پابندی پر راضی ہوتے ہیں نہ ضمیر کی آزادی سے دست بردار ہوتے ہیں۔ امام حسین نے عاشورا کے دن حریت فکر اور آزادی ضمیر کا پیغام دیا۔ اور دنیا کو بتا دیا کہ حقیقی فتح مقصد کی فتح ہوتی ہے۔

جنگ کرتے کرتے جب دشمنوں نے امام کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہر طرف سے تیر و تبر اور نیزہ و شمشیر کے وار ہونے لگے، دور سے پتھر برسائے جانے لگے۔ اور زخموں سے چور امام حسین کا لہو ریگ زار کربلا پر گرنے لگا۔ تو آپ کے خون کا ہر قطرہ انسانیت کی نجات کا پیغام بن گیا۔ اقبال کہتے ہیں۔

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

حضرت امام نے اپنے خون سے ریگزار کربلا پر نقشِ الا اللہ لکھا۔ گویا ہماری نجات کو رقم فرما گئے۔

زخموں سے چور اور نڈھال گھوڑے سے زمین پر آ رہے تو اپنی پیشانی ریت پر رکھ دی۔ سجدۂ حق ادا کیا اور نعرۂ تکبیر بلند کر کے اسلام کو حیاتِ نو اور ایمان کو تازگی عطا کی۔ اقبال کہتے ہیں۔

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

یہ تاریخی سجدہ انسانیت کی آبرو بن گیا۔ ایمان کی بنیادوں کو مضبوط کر گیا۔ یہ ایسا ذوق عبادت وعبدیت سے لبریز سجدہ تھا کہ سجدہ کرنے والے نے زمین پر سر تو رکھا لیکن پھر زمین سے اٹھایا نہیں۔ بلکہ دھڑ سے الگ کر کے زمین سے اٹھایا گیا۔ ان اشعار میں حقیقت حال کا اظہار ہے:

دین است حسین دین پناہ است حسین ؛ شاہ است حسین بادشاہ است حسین
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید ؛ حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

یوم عاشورہ کا سانحہ ہمیں امام حسین کی عظیم قربانی کی یاد دلاتا ہے۔ ہم ہر سال اس کی یاد مناتے ہیں۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہم اس قربانی کی اصل روح کو پس پشت ڈال کر فروعات میں گم نہیں ہو گئے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم امام حسین کی شہادت کے اصل مقصد کو اپنے پیش نظر رکھیں۔ اسے سمجھیں اور ان کی عظیم قربانی جس مقصد کے لیے تھی۔ اسے اپنائیں اور اسے اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ اسی صورت میں ہم دنیا کو امن وسلامتی اور صلح وآشتی کے راستہ پر لیجا سکتے ہیں۔ اور خیر امت کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سلسلہ صفحہ ۱۱

(ترجمہ) میں نے سنا ہے کہ عارفان راہ خدا نے کبھی دشمنوں کا بھی دل نہیں دکھایا۔ اور تجھ کو خدا کا قرب کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ جب کہ تو ہر وقت دوستوں کی دل آزاری میں اپنا وقت برباد کرتا ہے۔ ۱۲

الحاج سید غلام محمد کیفی شاہ نظامی

اخلاق حسنہ

تصوّف کی بنیاد

ارشادِ نبوی ہے۔۔۔ اکمل المومنین ایماناً احسنھم
کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔ تمام عبادات کا مقصد
انسان میں اچھے اخلاق پیدا ہوں۔ حدیث شریف میں ہے "جس کی نماز
اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے دور کر دیتی ہے"۔ ایک جگہ ؎
انسان حسنِ خلق سے وہ درجہ پا سکتا ہے۔ جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات
کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

ان الرجل لیدرک بحسن خلقہ درجۃ قائم اللیل
النھار۔

تصوف کی تعریفوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیشتر تعر
جن میں تصوّف کو اخلاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مشائخ کے نزدیک تصوّف کا
انسان خود اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرے اور دنیا کے دوسرے بسنے والوں کو
اور آلودگیوں سے پاک و صاف کرے یعنی نوعِ انسان کے ساتھ تعلقات

پیدا کرنا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا۔ برائی سے بچانا اور بھلائی کی طرف بلانا یہ وہ کام ہیں جو عبادت سے زیادہ اہم ہیں۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے بہت نماز پڑھنا اور وظائف میں بکثرت مشغول رہنا۔ قرآن کی تلاوت میں معروف رہنا۔ یہ سب کام چنداں مشکل نہیں ہیں۔ ہر باہمت شخص کر سکتا ہے۔ بلکہ ایک ضعیف بڑھیا بھی کر سکتی ہے۔ روزہ پر مداومت کر سکتی ہے۔ تہجد گزاری میں معروف رہ سکتی ہے۔ قرآن مجید کے چند پارے پڑھ سکتی ہے۔ لیکن مردان خدا کے کچھ اور ہی کام ہیں۔

مشائخ متقدمین کی نظر میں تصوف ایک اخلاقی پروگرام کا نام تھا جس میں اپنی اور دوسروں کی اصلاح کو زندگی کا سب سے اہم فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ صوفیائے کرام کے حالات زندگی اور تصوف کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلامی تصوف نفوس انسانی کو مادی نجاستوں سے پاک کرنے اور اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے کی ایک عظیم الشان تحریک تھی۔ صوفیہ نے کارِ نبوت کو جاری رکھا اور بنی نوع انسان کے اخلاق و اطوار۔ فکر و عمل کو درست کرنے کی کوشش کی۔ مشائخ متقدمین کے ملفوظات تعلیم اخلاق کی سلسبیل و کوثر ہیں جن کی خاموش روانی دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہے اور دلوں میں اچھے عمل کا جذبہ اور ولولہ جوش مارنے لگتا ہے۔ ان بزرگوں کی کوششیں صرف یہی نہیں تھی کہ انسان کے ظاہری اعمال درست ہو جائیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ برائی کے سوتے ہی بند ہو جائیں۔ انسان کا دل برائی کی طرف راغب ہی نہ ہو دل کی نجاست جسم کی نجاست سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگیوں کا جو پہلو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے وہ ان کی تعلیم اخلاق ہے۔ خواجہ اجل شیرازی کا یہ واقعہ جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک بار اپنی مجلس میں بیان فرمایا مشائخ متقدمین کے لائحہ عمل، طریق کار اور مقصد حیات کا بہترین آئینہ ہے۔ فرماتے ہیں:-

ایک شخص خواجہ اجل شیرازیؒ کی خدمت میں آیا اور مرید ہو کر خواجہ صاحب کے حکم کا منتظر رہا تھا کہ آپ مجھے نماز یا درود بتلاتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے صرف یہ کہا کہ "جو بات اپنے لیے پسند نہیں کرتا وہ اوروں کے لیے بھی پسند نہ کر اور اپنے لیے اس بات کی خواہش کر جو اوروں کے لیے خواہش کرتا ہے"۔ مدت بعد وہ شخص پھر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اس روز آپ کا مرید ہوا تھا اور منتظر تھا کہ آپ مجھے نماز یا درود کی بابت فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ اب بھی میں اسی بات کا منتظر ہوں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا: "اس روز کیا سبق دیا تھا"؟ مرید حیران رہ گیا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ خواجہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا: "اس روز میں نے تجھ سے کہا تھا کہ جو بات اپنے لیے پسند نہیں کرتا دوسروں کے لیے بھی نہ کر۔ اور اپنے لیے اسی بات کی خواہش کر جس کی اوروں کے لئے کرتا ہے چونکہ تو نے پہلا سبق یاد نہیں کیا اب میں دوسرا سبق کس طرح سکھاؤں"! (فوائد الفواد)

حقیقت یہ ہے کہ تصوف تمام ہی خدمت خلق اور تعلیم اخلاق کا ہے - ہمارے مشائخ متقدمین نے اس کو یہی سمجھا تھا اور اسی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔

محبت الٰہی، خدمت خلق، تعلیم اخلاق ان سب کا نتیجہ کیا ہے۔ صوفیا کا کہنا ہے سب کا نتیجہ ارتقاء روحانی ہے ارتقا روحانی کی وضاحت حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کی زبانی کہ اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں ہے فرماتے ہیں۔ "فی الحقیقت وہ قانون ارتقا جو لامارک، بلیرؔ، ابن مسکویہ اور ڈارون نے دریافت کیا صرف مخلوقات کے جسم تک ہی محدود ہے۔ کچھ نہیں بتاتا کہ ارتقا کی یہ زنجیر ہیکل انسان کی کڑی تک پہنچ کر بھی کہاں چلی جاتی ہے اس کے بعد ارتقا کے منازل باقی رہتے ہیں یا نہیں۔ لیکن وہ قانون ارتقا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا وہ بتلاتا ہے کہ بلاشبہ انسانیت کے مرتبہ تک پہنچ کر بعد ارتقائے جسمی تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے بعد ایک ارتقا روحانی کا سلسلہ شروع اور جسم حیوانی کو انسان کا ہیکل اختیار کرنے کے بعد بھی انسان بننے کے لیے بہت کچھ

ترقی کرنا باقی رہ جاتا ہے۔

یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت واللہ بما تعملون خبیر

(جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جن لوگوں نے علم حق حاصل کیا سو اللہ تعالیٰ ان کے مدارج کو ترقی دیتا اور ارتقاء بخشتا ہے۔ (۵۸ : ۱۱)
یہی مدارج ہیں جو اولیاء اللہ اور اصحاب الجنہ کے نزدیک اللہ کی مختلف منزلیں ہیں۔
ایمان باللہ اور محبت الٰہی اس ارتقاء روحانی کی اصل ہے اور ارتقاء انسانی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پر ایمان و ایقان ترقی کرے اور اللہ کی ولایت اور دوستی اونچے مرتبوں اور مقاموں تک بلند ہو جائے۔

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ

(کلمات طیبہ وعمل صالح اللہ ہی کی طرف بلند ہوتے ہیں اور وہ عمل صالح کرنے والوں کو ارتقاء بخشتا ہے (۳۵ : ۱۱) اس آیت کریمہ میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں "کلم الطیب" اور "عمل صالح" پس انسانیت کی تکمیل اور ارتقاء کی بنیاد بھی یہی دو چیزیں ہیں۔ کلم الطیب سے مقصود ایمان باللہ ہے اور عمل صالح سے مقصود انسان کے وہ تمام کام جو حکمت و اصلاح اور عدل و حقیقت کے مطابق ہوں۔ فرمایا کہ ایمان باللہ صعود کرتا ہے اور بلند ہوتا ہے اور عمل صالح کو خدا اونچے درجوں تک لیجاتا ہے (اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان)۔ یہی ارتقاء ہے روحانی انسانیت کی تکمیل ہے۔ اور یہی صوفیا اور تصوف کا مقصد بھی ہے۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمنان ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام
کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

باقی صفحہ پر

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

یکساں سول کوڈ اور مسلمان

یکساں سول کوڈ کا سوال دے کر مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کو موضو
عرصہ سے بنایا جاتا رہا ہے، اور یہ سمجھایا جاتا رہا ہے اور پبلک کو بھی باور کرایا
کہ مسلمانوں کا پرسنل لا اصول لا بہت ظالمانہ اور فرسودہ ہے، اور یہ زمانہ کے ساتھ
اس بات کی وضاحت سے قبل کہ مسلمانوں کا پرسنل لا زمانہ کی ضرورت کے خلاف نہ
توجہ دلانا ضروری ہے کہ خود ملک کے اکثریتی فرقہ کے مختلف طبقوں کے اندر متضاد
رائج ہیں۔ اور ان طبقوں کو ان پر اصرار ہے۔ اور دستور میں ان کی ضمانتیں
ہیں۔ ان کو کوئی نہیں کہتا کہ وہ فرسودہ ہیں، اور وہ ایک دوسرے سے مختلف و
جب آواز آتی ہے تو مسلمانوں کے حوالے سے آتی ہے۔ حالانکہ ان کا سماجی
پرسنل لا بڑا جامع اور سماجی الجھنوں کو دور کرنے والا ہے اور زندگی کی
کا حل رکھتا ہے۔ مخالف اسلام دانشور حضرات غیر جانبدارانہ غور نہیں کرتے۔

چند سال قبل مطلقہ کے مسئلہ کو لے کر بات چلائی گئی تھی، دراصل مسلمانوں کے
گردن پر تلوار چلادی گئی تھی لیکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی رہنمائی میں
کے جذبات و خیالات جب سامنے آئے تو بالآخر مسلمانوں کی شریعت کے تبدیلی
رہنے کو تسلیم کر لیا گیا

اور اب آواز دوسرا نکاح کرنے کے عنوان سے اٹھائی جا رہی ہے، یہ بار بار کے تجربے مسلمانوں کے حق میں بے انصافی اور ان کے جمہوری اور سیکولر حقوق کو نظر انداز کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس ملک کی آبادی میں ۱۲،۱۵ فیصد ہیں ان کے خلاف ہندوستانی دستور میں ان کے مذہبی حق کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔ اس کو نظر انداز کرکے بار بار نئی باتیں کیوں کی جاتی ہیں۔؟

مسلم پرسنل لا کے جو مسئلے خاص طور پر زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ ان میں نکاح، طلاق اسلامی وراثت اور تعدد ازدواج نمایاں ہیں اور ان میں طلاق اور تعدد ازدواج سرفہرست ہیں۔ جہاں تک طلاق کا تعلق ہے شریعت اسلامی میں اس کو اضطراری صورت حال میں حل کے طور پر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں یہ فرمادیا گیا ہے کہ جائز باتوں میں سب سے بری بات طلاق ہے۔ یہ حل ایسے موقع کے لیے ہے جب شوہر بیوی کا ساتھ رہنا ناقابل برداشت ہو جائے اس صورت میں بیوی کی گلوخلاصی بہتر ہے، یا جذبات، اختلاف و نفرت سے مجبور ہو کر ان کا گلا دبا دینا، آگ لگا دینا بہتر ہے؟ اس کا فیصلہ ہر سمجھدار یہی کرے گا کہ علاحدگی کر دینا بہتر ہے۔ اس کے لیے شریعت اسلامی میں مرد کو علاحدگی کا فیصلہ خود کر دینے کا حق دیا گیا ہے، جو لفظ طلاق جس کے معنیٰ چھوڑ دینے کے ہیں، کے استعمال سے ہوتا ہے اور بیوی کے لیے قاضی کے یہاں شکایت کر کے علاحدگی کروانے عمل میں آتا ہے جس کو خلع کہتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک بات نکاح کے سلسلہ میں یہ بھی سمجھ لینے کی ہے کہ ہندو مذہب اور مسلمان مذہب میں نکاح کی حیثیت بہت مختلف ہے۔ ہندو مذہب میں نکاح کے ذریعہ شوہر بیوی میں ایسا جوڑ طے کر دیا جاتا ہے جو کسی حالت میں بھی نہیں ٹوٹتا۔ حتیٰ کہ شوہر کے مرنے پر بھی یہ تعلق نہیں ٹوٹتا ایسے میں ان کے یہاں طلاق نہ ہو تو تعجب نہیں، لیکن مسلمانوں کے مذہب میں نکاح ایک باقاعدہ اور ٹھوس معاہدہ اور پیکٹ ہے جو بعد میں آپس کا جوڑ نہ رہنے اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرسکنے کی صورت میں ختم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن یہ پیکٹ کرنے اور پیکٹ ختم کرنے کے لیے مضبوط ضابطے مقرر ہیں۔ طلاق
کے بعد اسلام میں بیوی بیوی نہیں رہتی۔ اسی لئے ان کے نان نفقہ کا بھی سوال نہیں
ہاں متاع کا حق ہے۔ یعنی رخصت کرتے وقت اکرامیہ یعنی خوش دلی پیدا کر
لیے کچھ دے کر رخصت کرنا۔ طلاق یا خلع کے بعد بیوی شادی سے قبل کی
پلٹ جاتی ہے۔ اور وہ دوبارہ اپنے میکے کی فرد بن جاتی ہے۔ اس لیے
مسلمان معاشرہ میں کوئی عصبیت کی بات نہیں ہے۔ البتہ اسلام میں ہر طرح تاکید
کہ طلاق مجبوری پر دی جائے اور تین مہینے کے اندر سوچ سوچ کر دی جائے۔

دوسرا مسئلہ تعددِ ازدواج یعنی کئی بیویاں رکھنے کا ہے تو اولاً جائزہ لیا ج
تو اس طرح یہ مسلمانوں سے زیادہ دیگر قوموں میں ملے گا۔ ہندو معاشرہ میں یہ زیا
مسلمانوں کے یہاں یوں بھی کم ہے کہ اس کو اسلام نے ضرورت اور مشکلات کا حل بتا
جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو اس لائق نہ پائے کہ اس کی توقعات پورا کرتی ہو اور اس
اس کا جوڑ نہ بنتا ہو اور طلاق دینے میں بیوی کا نقصان ہو یا شریفانہ وضعداری کے
معلوم ہوتا ہو تو اس کو باقی رکھتے ہوئے شوہر کو دوسری بیوی لانے کا حق دیا گیا ہے۔
دونوں کے حق کو یکساں ادا کرنے کی شرط رکھ دی گئی ہے۔ اسی طرح بعض وقت ملک
مردوں کی قلت ہو جاتی ہے جیسا کہ جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں ہوا۔ عورتیں بڑھ
رہیں۔ ایسے حالات کا حل بھی تعدد ازدواج ہے ورنہ پھر بے راہ روی سے بچا نہیں جا
سماجی زندگی میں جو مشکلات پیش آتی رہیں ان کے لیے اگر شریفانہ
تلاش کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں جنسی بے راہ روی اور ظلم حتیٰ کہ قتل کے واقعا
رونما ہوتے ہیں جس کی مثالیں اب کثرت سے سامنے آرہی ہیں۔ بیوی کو زندہ
کے واقعات حیرت انگیز تعداد میں پیش آرہے ہیں کیوں کہ شوہر بیوی سے مطلق
ہونے پر جب طلاق نہیں دیتا تو جلا دیتا ہے۔ کبھی تعلقات خراب ہو جانے پر اور

اور جوڑے گھوڑے نہ لانے پر جس کو اسلام میں منع کیا گیا ہے، اسلام میں نکاح کا بوجھ اصلاً مرد پر ڈالا گیا ہے اس کو مہر دینا پڑتا ہے۔ یعنی ایک وقیع رقم بیوی کو پیش کرنا ہوتی ہے۔ بیوی پر اسلام نے کچھ لانے کی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف کرتے ہیں وہ شریعت اسلامی پر عمل کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں، اس میں اسلام کا قصور نہیں ہے، اسلامی شریعت کو اگر مسلم دشمنی کے اثر سے ہٹ کر اور غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں ایسی مشکلات کے شریفانہ حل رکھے گئے ہیں! بجائے اس کے کہ ان کو بڑھاوا دیا جائے اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے ان پر پابندی لگانے کی بات کرنا حالات کو خرابی کی طرف لے جانے کے مرادف ہے۔

اور جہاں تک اسلامی شریعت کی اہمیت کی بات ہے تو وہ مسلمانوں کے لئے ویسی ہی لازم اور ضروری ہے جیسے ان کا عقیدہ، شریعت میں تبدیلی کرنے یا تبدیلی کو صحیح سمجھنے کے بعد مسلمان مسلمان نہیں رہتا، اس طرح شریعت کی تبدیلی مسلمانوں کے لئے گویا مذہب کی تبدیلی ہے، اس لئے مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی شریعت کی حفاظت کے لیے پورے پورے عزم وہمت کا ثبوت دیا ہے جیسا کہ مطلقہ کے نان نفقہ کے مسئلہ میں پیش آیا اور مسلمانوں نے متحد ہو کر اس کے خلاف آواز اٹھائی اور پارلیمنٹ کے ارکان کو سمجھایا، وزیر اعظم نے اہمیت کو تسلیم کر کے قانون بنا کر مسلمانوں کو مستثنیٰ کیا، یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی شریعت کا ماننا ویسا ہی ضروری ہے جیسا اپنے مذہب کو ماننا، شریعت میں تبدیلی کو تسلیم کرنا مذہب کو تبدیل کر لینے کی طرح کا عمل قرار پاتا ہے اسی کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو پوری صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے رسول کے دیئے ہوئے احکام کی پیروی کریں اور جن باتوں سے انہوں نے منع کیا ہے ان سے باز رہیں! "مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا" اور ایک دوسری آیت میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ الخ" تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ

جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں۔ اور جو فیصلہ تم کر دو۔۔۔۔۔ اس اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے (نسا آیت ۶۵)

قرآن مجید ہی میں ایک جگہ اس بات کی بھی صراحت کر دی گئی جس کو نبی کریمؐ کی حیات طیبہ کے اختتام کے قریب نازل کیا گیا کہ اب دین (یعنی مذہبی احکام کی تکمیل کر دی گئی) یعنی جو احکام آچکے اب اس میں تغیر نہیں ہوگا، فرمایا: "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا" یعنی آج میں نے تم پر دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو یعنی اسلامی احکام وشریعت کو ہی پسند کیا ہے۔

اور قرآن میں ہی ایک جگہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں دین یعنی مذہبی احکام اسلام کے ہی ہیں اور فرمایا کہ جو بھی اسلام یعنی اس کے احکامات سے ہٹ کر دوسرے احکام طلب کرے گا تو خدا کے یہاں اس کی یہ بات قبول نہیں کی جائے گی، فرمایا۔
ان الدین عند اللہ الاسلام۔" اور ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ۔"

پھر اس سے بڑھ کر یہاں تک ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو بعض میرے پاس دو فریق اپنا قصہ لاتے ہیں، بعض وقت ایک فریق زیادہ چرب زبان اپنی بات کو عمدہ طریقہ سے پیش کرنے والا ہوتا ہے دوسرا اس معاملہ میں کمزور پڑتا ہے ایسی صورت میں دلائل کو اچھے طریقہ سے پیش کرنے والے کی بات کو ہو سکتا ہے صحیح سمجھ کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں تو سن لو کہ میرے فیصلہ سے اس کا حق نہیں بن جائے گا۔ اگر اس سے فائدہ اٹھائے گا تو گویا آگ کے انگارے لے رہا ہے۔ چنانچہ اسلام میں شریعت کے احکام کی پابندی کی اس طرح تاکید کی گئی ہے اور اس کو اسلام کے لیے بنیادی قرار دیا گیا ہے۔ احکام قرآن۔

باقی ۲۲ پر

محمد اسحاق
ریٹائرڈ پرنسپل کالج آف ایجوکیشن

میرٹ کلاس

بچوں کی ذہانت کے معیار کو معلوم کرنے کے سائنٹفک طریقے

ایک ہی جماعت میں عام طور پر طلباء کی درجہ بندی کچھ اس طرح ہو جاتی ہے۔ ذہین اوسط اور اوسط سے کم تر۔ ذہنی استعداد مختلف ہونے کی وجہ ان کا تعلیمی معیار فہم اور سوجھ بوجھ بھی مختلف ہو جاتی ہے یہ نتیجہ ہے موروثت HEREDITY اور ماحول ENVIRONMENT کا۔ موروثت ماں باپ کا عطیہ ہے جو استقرار حمل کے بعد پھر اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہتی البتہ ہم ماحول کو جتنا چاہئے بہتر بنا سکتے ہیں یہ ہمارے قابو کی چیز ہے بچہ حواس خمسہ کے ذریعہ اپنے ماحول میں اطراف و اکناف میں سینکڑوں مشاہدات اور تجربات سے سیکھا جاتا ہے۔ لیکن موثر ماحول تعلیم ہے تعلیم ایک منصوبہ بند ماحول فراہم کرتی ہے سب کو ایک ہی قسم کی تعلیم اور یکساں توجہ کے باوجود طلبا میں فرق ہو جاتا ہے۔ وہ طلبا جن کا موروثت زرخیز ہے وہ تعلیم سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ اور جن کا موروثت محدود اور غریب ہے ان کا سبق اچھی طرح ہضم کرنے کے لیے زیادہ محنت درکار ہوتی ہے۔ I.A.S. کی کوچنگ کلاس میں ہر طالب علم گریجویٹس یافتہ تیاری کرتے ہیں لیکن ان میں بعض معیاری ہوا کسی اعلیٰ امتحان اور انٹرویو میں پورے اترتے ہیں۔ [illegible] یہ مثال اس لئے دی گئی ہے [illegible]

باران رحمت تو زمین پر برستا ہے لیکن جو بارش پتھریلی اور بنجر زمین پر ہوتی ہے
گھانس پھونس اگ آتی ہے۔ یہی بارش جب زرخیز زمین پر ہوتی ہے تو فصل شاداب
اور پھول پھل دے جاتی ہے۔ یہی حال ٹیچر کے سبق یا پروفیسر کے لکچر کا ہوتا ہے ذہین طا
اس سے اخذ کرتے ہیں کند ذہن طلبا کے سروں پر سے یہ لکچر نکل جاتا ہے۔

بچوں کی ذہانت کا معیار ۱۰۵ معلوم کرنے کے لیے سائنٹفک طریقے معلو
ہیں اسی طرح کسی کی شخصیت کے توازن کی جانچ کے لیے علم نفسیات میں مختلف ٹسٹ
ہیں) اگر موروثت کا رقبہ وسیع ہو اور ماحول (تعلیم) بھی اچھا ہو تو ایسے طلبا خود اپنے شعبہ
پیدا کرنے ہیں اگر موروثت تو زرخیز ہو لیکن مناسب اور موثر ماحول (تعلیم) نصیب نہ
چند دنوں بعد کھاد پانی کی کمی کی وجہ مرجھا کر رہ جائے گا۔ اس کے برخلاف مو
تو محدود اور معمولی رہ گیا ہے تو اس کے لیے بہترین ماحول اور تعلیم کا انتظام کرنے
باوجود تدریس ذہنی استعداد کی کمی کی وجہ یہ ساری محنت رائیگاں جائے گی۔
کے لیے عام طور پر کوچنگ ایک دو سال کے لیے گریجویشن کے بعد دی جاتی ہے
کوچنگ بھی عام طور پر ضائع جاتی ہے کیونکہ ایک دو سال میں اس عمر میں جو
سکتی۔ ہوشمند اور دور اندیش لوگ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے پانچ چھ
سے ایک پندرہ سالہ تعلیمی منصوبہ اور پروگرام کے تحت ان بچوں کو ملک کے اعلی
کے لیے تیار کر چکے ہیں [illegible] پبلک اسکولز جن کی تعداد ملک میں ایک فی بیس
کھانے پینے [illegible] کو ابتدا ہی سے حکومت اور اقتدار کے لیے تیار کیا جاتا ہے
ہمارے اسکولوں میں ذہین طلبا کی بڑی مشکل رہی ہے کہ انہیں کند ذہن نمبر
طلبا جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے بڑھیں ساتھ رہنا پڑتا ہے ان کے سامنے مد
کے لئے کوئی اچھا گروپ نہیں ہوتا۔ دوران عام طلبا میں اپنے آپ کو لیڈر سمجھ بیٹھتے
کو نمبروں کی تکمیل کی فکر رہتی ہے وہ سب کے سب یکساں سلوک اور توجہ کے پابند

جماعت کے اس ماحول اور گھٹن کو محسوس کرتے ہیں۔ ماحول کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ان کی اٹھان کو کھینچ کر نچلی سطح پر لے آتا ہے۔ یہ کیفیت قریب قریب سب ہی گورنمنٹ اور پرائیوٹ اسکولوں کی ہے۔ مثال کے طور پر شہر حیدرآباد کے پرانے محلوں میں کئی ایک اسکول ہیں۔ یہاں ہر جماعت میں ایک دو طالب علم ذہین مل جائیں گے لیکن انہیں اچھی معیاری تعلیم دینا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ شہر حیدرآباد کی بعض جانی پہچانی فعال شخصیتیں ایک عرصہ سے اس بات پر غور کر رہی ہیں کہ ایسے ذہین طلبا جو شہر کے مختلف اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں اگر ان کا انتخاب کرکے ان کے لئے اچھی معیاری تعلیم کا انتظام کیا جائے تو فرزندان دین کچھ جوہر نایاب نکل آئیں گے اور اکثر اچھی تعلیم کی وجہ سے معاشرہ میں اپنا ایک باوقار مقام بنالیں گے۔ اس تعلیمی سال سے عملی قدم اٹھانے کے لیے اس اسکیم کا خاکہ تیار کرلیا گیا ہے۔ انگلش میڈیم کے وہ طلبا جو پرانے شہر کے محلوں میں زیر تعلیم ہیں اور ساتویں جماعت کامیاب کر چکے ہیں تو بعد سلکشن ٹسٹ اور انٹرویو کے وہ ذہین طلباء کا ایک بیاچ چھانٹ لیا جائے اور کسی ایسے اسکول میں جس کا انتظامیہ اس میرٹ کلاس کو اپنے اسکول میں چلانے کے لیے آمادہ ہو وہیں۔ پہلا ان کی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔ اس کلاس کو پڑھانے کے لیے قابل اور ٹرینڈ اساتذہ کا اچھے مشاہرہ پر انتخاب کرکے اس کلاس کی تعلیم کی ذمہ داری انہیں سونپ دی جائے اور ان کی تعلیم و تربیت اور خاص کوچنگ کا بھی انتظام کیا جائے۔ ان طلباء کو ٹیوشن فیس کی رعایتیں، یونیفارم، کتب اور اسٹیشنری سے مدد کی جائے۔ انہیں موجودہ دور میں صنعت و حرفت کے میدان میں جو انقلابات آتے ہیں ان سے روشناس کرانے کے لئے حیدرآباد و سکندرآباد کے قرب و جوار میں جو سینکڑوں صنعتی کارخانے ہیں ہفتہ میں ایک مرتبہ ان کارخانوں کو دیکھنے کا انتظام کرنا بھی شامل ہے۔

آٹھویں جماعت سے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک پانچ سال کے لئے ان طلباء کی بہتر تعلیم و تربیت اور نگرانی کا سلسلہ جاری رہے گا اور اس مدت میں طلباء کی تعداد ۲۰۰ ہو جائے گی۔

اسکا پہلا بیاچ ۹۴۔ ۱۹۹۵ء کے تعلیمی سال سے شروع ہو کر تین سال بعد ۹۹۔۱۹۹۸ء میں میٹرک کے امتحان میں شریک ہو گا تب ہی ایک اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان طلبہ کا معیار مسلم طلباء سے کس حد تک اونچا ہے اس کلاس کو کسی اسکول میں چلانے کے لئے چند احتیاطی تدابیر ضروری ہیں کیونکہ سمندر میں یہ ایک جزیرہ ہو گا یا صحرا میں نخلستان، کچھ عجب نہیں کہ یہ جماعت طلبہ اور اساتذہ کے رشک وحسد کا شکار نہ ہو جائے۔ پھر اس جماعت کے معیار تعلیم کو مسلسل اونچی سطح پر قائم رکھنے کے لیے متعلقہ اساتذہ کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت اور پروگرام بنانا ضروری ہے

میرٹ کلاس کی اسکیم انوکھی اور دلچسپ ہے پانچ سال بعد یہ معلوم ہو گا کہ یہاں کے طلباء کن پیشہ وارانہ کالجوں میں داخلے کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ اسکیم ضرور کامیاب ہو گی بشرطیکہ تعلیمی پروگرام پر نہ صرف گہری نظر ہو بلکہ اس کی کامیابی کے لیے مدرسہ کے اساتذہ اور اولیائے طلباء کا تعاون بھی حاصل ہو۔ تعلیم کا کام دیرپا اور صبر آزما ہوتا ہے اس قسم کی عملی شروعات نہایت مبارک اور تعلیم کے میدان میں ایک فال نیک ہے (روزنامہ سیاست سے شکریہ کے ساتھ)

سلسلہ ملا

میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزندوں تک اور فیصلوں میں ملتے ہیں ان کو ماننا مسلمان ہونا ہے۔ لہٰذا ان کا انکار کرنا یا بدل دینا اپنے کو اسلام سے خارج کر دینا ہے اسی لیے مسلمانوں کا اپنی شریعت اسلامی کو قائم رکھنے اور تبدیل نہ ہونے دینے پر اصرار ہے کیونکہ یہ مسئلہ ان کے مسلمان رہنے نہ رہنے کا بن جاتا ہے۔

ہندوستان کا دستور ہندوستانی عوام کا دستور ہے ان میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی ہیں سکھ بھی ہیں عیسائی بھی ہیں، جینی بھی ہیں بدھسٹ بھی ہیں۔ دستور میں اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کا حق سب کا تسلیم کیا گیا ہے اور یونیفارم سیول کوڈ کی ضرورت بھی بتائی گئی ہے لیکن سب کے مذہبی حق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے لہٰذا یونیفارم سیول کوڈ اس حق کو ختم کر کے نہیں ہو سکتا اس کا لحاظ کر کے ہو سکتا ہے (تعمیر حیات ۲۵ ۹۵ سے ماخوذ)

روشن جامی

حصہ دوئم قسط

خدوخال

جناب صادق نوید کے مجموعۂ کلام کا تنقیدی جائزہ

صفحہ ۴۵ پر چوتھا شعر ہے۔

اس بے وفا کو جان وفا میں اگر کہوں
وہ سر ہلا نہ دے کہیں انکار کی طرح

کئی کئی بار شعر پڑھنے کے باوجود اور ہر زاویہ سے اس پر غور کرنے کے بعد بھی مطلب نہیں کھلا۔ بہت کھینچ تان کرنے کے بعد جو بات سمجھ میں آئی وہ یوں تھی کہ اس بے وفا کو یعنی روایتی محبوب کو میں اگر یہ کہوں کہ تو وفا کی جان ہے تو وہ کہیں انکار میں سر نہ ہلا دے۔ گویا کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ اور اگر وہ انکار کر دیتا تو شاعر کا کیا بگڑ جاتا وہ شاعر نے بتانا اسلئے مناسب نہ سمجھا کہ یہ شاعر کا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ ایسے غیرے نتھو خیرے کو کیوں بتائے۔

اسی غزل کا چھٹا شعر ہے۔

ہرگز کتاب دل نہ سر عام کھولنا!
پڑھ لیں گے حرف حرف وہ اخبار کی طرح

یعنی دل کی کتاب سرِعام ہرگز مت کھولنا (یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شاعر یہ مشورہ آخر کس کو دے رہا ہے) دوسرے مصرع میں کہہ رہا ہے کہ وہ اخبار کی طرح اسے حرف حرف پڑھ لیں گے اب " وہ " کون ہیں اور اگر " وہ " (اب وہ جو کوئی بھی ہو) اخبار کو حرف حرف پڑھ لیں گے تو شاعر کا کیا بگڑ جائے گا ۔؟ پھر وہی پردہ ٔ خفی ؟ شاید اسی کو فکر کی کمی کہا جاتا ہے اس شعر سے متعلق قدیر انصاری نے ایک اہم بات کہی وہ یہ کہ اخبار حرف حرف نہیں پڑھا جاتا جسطرح کتاب پڑھی جاتی ہے بلکہ اخبار تو اہم اہم سرخیاں اور کبھی کسی خبر کا متن پڑھ کر قاری اپنے کاروبار میں معروف ہو جاتا ہے بہرحال اخبار حرف حرف نہیں پڑھا جاتا۔ اب یہ شعر ؎

نادان سمجھ سکے نہ مقامِ نشاطِ غم ۔۔۔ !
جھوٹی خوشی سمیٹ کے کنگال لے گئے

اب اس مذکورہ شعر میں نادان کون ہیں. آیا وہ کنگال ہی نادان ہیں. جو جھوٹی خوشی سمیٹ کے لے گئے۔ اب مقامِ نشاطِ غم کیا ہے یہ شاعر نے یہاں بتلانے کی زحمت گوارا نہیں کی پھر اب کس سے جاکر پوچھیں ۔

اسکے بعد ہی شعر ہے ؎

جب ہو سکی نہ اُن کی کوئی چال کامیاب
آئے شکاری اور نئے جال لے گئے

گویا یہ شعر بھی چیستاں سے کم نہیں ۔ شکاری کون ہیں چال کامیاب کیوں نہ ہو سکی ۔ شکاری کہاں سے آئے اور نئے جال کہاں لے گئے اور پرانے جالوں کا کیا ہوا۔ کس کباڑ خانہ میں دے گئے کچھ پتہ نہیں چلا گیا ایسے ہی اشعار پڑھ " استاد " کہلانے کا شوق تھا ۔

" اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے "

؎ " آئے کئی لباس بدل کر ستم کے دن
جو کچھ وہ چاہتے تھے بہرحال لے گئے "

ستم کے دنوں کا کئی لباس بدل کر آنا۔ اظہار بظاہر بہت خوبصورت ہے لیکن دوسرا مصرع پڑھنے کے بعد مطلب غارت ہو گیا۔ شاعر غالباً یہی کہنا چاہتا ہے کہ ستم کے دن مختلف لباس بدل کر آئے اور جو کچھ وہ چاہتے تھے۔ (یہاں شاعر بڑا بے بس نظر آتا ہے۔ وہ (یعنی ستم کے دن گویا ستم کے دن بھی کوئی انسانی پیکر تھے۔ جیسے ہلاکو، چنگیز اور نادر شاہ وغیرہ) بہرحال جو وہ چاہتے تھے لوٹ کرنے گئے واہ کیا شعر ہے؟ اہمال کی بھی حد ہے!!!

صفحہ ۲۷ پر ایک غزل ہے ہوا میلی، فضا میلی۔ لطف یہ ہے کہ اکثر اشعار میں ردیف "میلی" نہیں نبھ رہی ہے۔

مثال کے طور پر ایک شعر کافی ہے ؎

آسان بھی مشکل بھی ہر شخص کا دل رکھنا
دل سے جو نکل جائے ہوگی نہ دعا میلی

صفحہ ۴۸ پر یہ شعر ؎

اتنے سبک ہوئے کہ زمیں پر نہ ٹک سکے
بے خانماں پرند اڑانوں میں بٹ گئے

"بے خانماں پرند" کی تشبیہ شاعر نے کس کے لئے استعمال کی ہے۔ ان کے سبک ہونے اور زمین پر نہ ٹک سکنے اور اڑانوں میں بٹ جانے سے شاعر کا کیا مراد ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جبکہ اس شعر کے مقابل ایک استاد شاعر کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔ جس میں عزم و حوصلہ کا درس ملتا ہے۔

شعر ہے ؎ تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

اس غزل کا مقطع یوں ہے ؎

شاہیں اپنے دور کے یہ پر ہوئے نوید
سب لا مکاں سے ہٹ کے مکانوں میں بٹ گئے

اپنے دور کے شاہین کون ہیں جو بے پر ہو گئے اور جو لا مکاں سے ہٹ کے مکانوں میں بٹ گئے۔ یہاں "شاہین" اور "لامکاں" کے سمبل عدم برجستگی کی بنا پر خراب۔ شاعر نے ان کا استعمال غالباً اقبال کی اتباع میں مسلمانوں کے لیے کیا ہے شعر مہمل ہو گیا۔

صفحہ ۴۹ پر پانچویں شعر میں شاید کا املا ہمزہ سے لکھا گیا ہے "شائد" سراسر غلط ہے شاید کا "ید" ہاتھ والے "ید" کی طرح لکھا جاتا ہے "قائد" "عقائد" کی طرح ہمزہ کے ساتھ نہیں اور یہ کہ شاید کی "ی" بالکسر نہیں بلکہ بالفتح۔ (ہائے املا کا سلیقہ نہیں نادانوں کو)

اسی صفحہ پر ایک شعر ہے ؎

گلشن کی شب گزیدہ فضاؤں کی خیر ہو
اب اشتیاقِ صبح نہ یادِ صبا مجھے

پہلے مصرع میں شاعر نے گلشن کی شب گزیدہ فضاؤں کی خیر مانگ لی (د۔ شب گزیدہ فضا کیا ہوتی ہے) شب گزیدہ سحر تو سنا تھا، خیر چلیے دعا قبول بھی گی لیکن دوسرے مصرع کا یہ گریز کیا معنی رکھتا ہے کہ نہ تو اب شاعر کو صبح کا اشتیاق ہے اور نہ بادِ صبا سے واسطہ (واسطہ کا لفظ تو ہم نے بڑھا دیا ہے ورنہ شاعر "نہ بادِ صبا مجھے" کہکر مصرع کو لٹکا دیا ہے) آخر شاعر چاہتا کیا ہے شعر سے نہیں ہو سکا۔ مصرع کی یہ ترتیب ؎

"اب اشتیاقِ صبح نہ یادِ صبا مجھے"

"ترکیبِ ناروا" کا شکار ہو گئی۔ علاوہ ازیں فعل کی کمی بھی کھٹکتی ہے

وہ اصل شاعر کہنا چاہتا ہے کہ اب نہ تو مجھے صبح کا اشتیاق ہے اور نہ بادِ صبا کا اشتیاق ہے۔

اگلا شعر ہے ۔ اس حسن انتظام کے قربان جایئے
وہ تو تو چھاؤں میں ہیں نہیں آسرا مجھے

یہاں "آسرا" بمعنی "چھت" کہاں تک درست ہے یہ قارئین بہتر سمجھ سکتے ہیں۔
صفحہ ۵۰ پر ایک غزل درج ہے جسکے قوافی و ردیف ہیں "چلا ہی نہ ہو" "راستہ ہی نہ ہو" بجا ہی نہ ہو وغیرہ لیکن افسوس ہے کہ کسی شعر میں بھی ردیف ساتھ نہیں دے پاتی ہے۔ مثال کے طور پر اس غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو ۔

اک ایسی راہ کہ جس پر کوئی چلا ہی نہ ہو
کہیں وہ میرا پسندیدہ راستہ ہی نہ ہو
شعور و فکر میں وسعت ہے عصرِ نو کی نوید
یہ منفرد لب و لہجہ کہیں نیا ہی نہ ہو

صفحہ ۵۱ پر غزل کا مقطع ہے ۔
ایسی تخلیق دردِ سر ہے نوید
جس میں خونِ جگر نہیں ملتا

پہلے مصرع میں "دردِ سر" کہکر خونِ جگر کی قدر گھٹا دی۔ دردِ سر کی جگہ "بے اثر" کہتے تو شعر کی معنویت اور اہمیت بھی بڑھ جاتی اور اہمال سے بھی بچ جاتے۔
صفحہ ۵۲ پر مطلع دو لخت ہو گیا ملاحظہ ہو ۔
غمِ حیات مسلسل عذاب جیسا تھا
ہمارا دور پریشان خواب جیسا تھا

پہلے مصرع میں غمِ حیات کے بارے میں اظہارِ خیال کیا تو دوسرے مصرع میں

اپنے وجود کے بارے میں۔ اکثر اشعار ایسی ہی منتشر الخیالی کے شکار ہیں۔ شعر کی تشنگی کی ایک اور مثال ہے۔
اِسی غزل کا مقطع ہے ؎

سب اپنے چہروں کی پہچان کھو چکے تھے نوید
ہر ایک شخص کے رُخ پر نقاب جیسا تھا

رُخ پر نقاب تھا کی جگہ "نقاب جیسا تھا" کہنا گویا اپنا ہی منہ چڑانا ہے۔ یہ نقاب جیسا کیا ہوتا ہے۔ یہاں دراصل ردیف ہی بے محل ہو گئی صفحہ ۵۳۔ غزل "لگے ہے مجھے" کی ردیف میں واقع ہوئی ہے دراصل آج "لگے" کہنا اسلیے غیر فصیح ہے کہ یہ زبان اب نہیں بولی جاتی۔ یہ دراصل ولی دکنی کے زمانے کی زبان ہے۔ جو اب متروک ہے۔ بعض ہمارے معاصرین نے کبھی کسی متقدمین میں سے کسی کی زمین میں غزل کہی بھی ہے تو وہیں پوری غزل اسی شاعر کی تقلید بھی کر اور یہی روایت و تہذیب کا اقتضا بھی ہے۔
صفحہ ۵۴ پر چوتھا شعر ہے ؎

میں اپنے آپ سے چھپ کر انا کی زد میں رہا
نہیں کسی کا نہیں خود مجھے مرا ڈر تھا

جب اپنے آپ سے چھپ گئے تو پھر "انا" کی زد میں رہنے کا کیا محل۔
اسکے بعد کا ایک اور شعر ہے ؎

قریب آ کے وہ ہم سے معانقہ کرتے
ہمارے ہاتھ میں پتھر نہیں گل تر تھا

مہمل شعر ہے۔ کیا معانقہ کرنے کیلئے ہاتھ میں گل تر ہونا ضروری ہے۔ کیا یہ نا ضروری ہے شاعر نے معانقہ کیلئے اپنے آپ پر غیر ضروری تحدیدات عائد

صفحہ ۵۵ پر مطلع ہے ؎

شدتِ غم میں کچھ کمی تو ملے
ہم کو اتنی سی اک خوشی تو ملے

"اتنی سی" کہنے کے بعد "اک" کہنا "عدم قدرتِ اظہار" کی دلیل ہے۔

اسی کا مقطع ہے ؎ پھر خلش رہ گئی نہ ملنے کی
جن سے ملنا تھا وہ ابھی تو ملے

شاعر "عدم قدرت اظہار" کی وجہ سے تضاد بیانی کا شکار ہو کر رہ گیا کیا کہنا چاہتا ہے، الفاظ ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں

مقطع ہے ؎ مژدۂ جانفزا یہی ہے نوید
مسکرا کے وہ سرسری تو ملے

"مژدۂ جانفزا" کے ساتھ "سرسری" کا لفظ منہ چڑا رہا ہے

صفحہ ۵۷ پر شعر ہے ؎

حقیقتاً تری عظمت کہاں ہے مجھ سے جدا
تری بڑائی بھی یاروں کے اہتمام سے ہے

اس شعر میں شاعر "شتر گربہ" کا شکار ہو گیا ہے پہلے مصرع میں "مجھ" اور دوسرے مصرع میں "تری" اور "یاروں" کہا ہے۔ ویسے شعر صادق نوید کے حسبِ حال ہے کیونکہ عظمت (اگر کچھ ہے تو) احباب کی وجہ سے ہی ہے۔ اسی کے بعد شعر ہے ؎

صدف ہے جبرِ مشیت رواں ہے سیلِ حیات
کہ ذرہ ذرہ سلامت اسی نظام سے ہے

پہلے مصرعے میں "سیل" کے ساتھ رواں کا استعمال محلِ نظر ہے ویسے یہ شعر ہی محل ہے شاعر کیا کہنا چاہتا ہے لفظوں سے پتہ ہی نہیں چل پا رہا ہے کیا محض الفاظ کو معنی

کردینے ہی کا نام شعر ہے ؟
صفحہ ۵۸ پر مطلع ہے ؎

ہم جشنِ بے گناہی کا اقرار کیا کریں
ضائع کچھ اللہ عمر سرِ دار کیا کریں

سرِدار تو حق گوئی کی عمر کا حاصل ہوتا ہے ۔ اسکو ضائع کرنا کہکر شاعر کی مٹی پلید کردی۔

صفحہ ۵۹ پر مطلع ہے ؎

مانا کہ بس میں توسنِ عمرِ رواں نہیں
گردش میں کب زمین نہیں آسماں نہیں

شعر دو لختگی کی شاندار مثال ہے ۔ توسنِ عمرِ رواں کا بس میں نہ ہونے کا اور آسمان کی گردش سے کہاں تک ہے

آگے شعر ہے ؎

احساسِ کرب، سوزِ دروں، تشنگی، گھٹن
ذکرِ غمِ حیات ہے یہ داستاں نہیں

ذکرِ غمِ حیات داستاں کیوں نہیں ہو سکتا۔ ذکرِ غمِ حیات کی جگہ "سرمایۂ حیات" "داستاں نہیں" کی بات بن جاتی ۔

اسی کا مقطع ہے ؎ خود اپنے آپ سے بھی تعارف نہیں تو کیا
صادق نوید آپ کا چرچا کہاں نہیں

چرچا کس بات کا شعر میں اسکی کوئی وضاحت نہیں ملتی ۔ خود اپنے آپ سے تعارف نہ ہونے کی بات بھی مضحکہ خیز ہے۔

صفحہ ۶۰ پر شعر ہے ؎ یقین کا شہر تھا احساس کے سمندر میں
بو تونے ڈوب کے دیکھا تر ا گماں ٹوٹا

شہر سمندر میں نہیں ہوتا ۔ شاعر پتہ نہیں کس خیالی جزیرہ کی بات کر رہا ہے ۔
یہاں بھی عدم قدرتِ اظہار ہے ۔

ایک اور شعر ہے ؎ خود اپنے قد کی تاریخ بن گئے ہم لوگ
مٹا کے ہم کو ترا فخرِ آسماں ٹوٹا

روایت تو یہی ہے کہ آسماں کا کام ہی مٹانا ہے۔ ایسے میں فخر ٹوٹنے کا نہیں بلکہ اور بڑھے گا۔ کیونکہ اس نے آپ کو مٹا کے تاریخ بنا دی ہے ۔

صفحہ ۱۶ پر مطلع ہے ؎ صحرا سے نکل آیا تو بستی نے ڈبویا
مجھ کو میری انساں پرستی نے ڈبویا

اس میں علانیہ ایطا کا سقم موجود ہے ۔ "بستی" کا قافیہ جب آپ نے "پرستی" باندھ لیا تو حرف "سین" کی شمولیت آپ نے قافیہ میں لازم کر لی کیونکہ شاعر اپنے قوافی مطلع ہی میں طے کر لیتا ہے۔ اب آگے "س" کی قید برقرار نہیں رہی۔ دیگر قوافی خشکی، سیاہی، ہندی وغیرہ ہیں جو مطلع میں ایطا کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ایطا کی غلطی اساتذہ کے پاس سخت ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے اسلئے کہ یہ غلطی علمِ قوافی سے عدم واقفیت کی بنا پر واقع ہوتی ہے۔

آگے کا شعر ملاحظہ کیجئے گا ؎

احساس کے آنگن میں تری چھاؤں گھنی تھی
مجھ کو تری زلفوں کی سیاہی نے ڈبویا !

پہلے مصرعہ میں احساس کے آنگن کی گھنی چھاؤں کا ذکر ہو رہا تھا تو دوسرے مصرعہ میں ایک غیر متعلق بات یعنی زلفوں کی سیاہی کے ڈبونے کی بات کہی جا رہی ہے۔

([illegible] بات کہنے کا سلیقہ [illegible])

ایک شعر ہے ؎ [illegible]

یہ شعر تو یک لخت مہمل ہے۔ بلا فرصت شوخی کی قسم کھائی جا رہی ہے کہ ہاتھ
ڈبو دیا۔ ڈبو دیا تو کہاں ڈبو دیا اور اگر اس ڈوبنے ڈبونے سے حسن کے سر الزام
تو جائے اس سے ڈبونے ڈوبنے میں کیا فرق پڑتا ہے

مقطع ہے — شہرت سے تو یہ آپ کو نفرت سہی لیکن
فنکار کو حالات کی پستی نے ڈبو دیا

خلاف واقعہ بات کہی گئی ہے۔ شہرت کس فنکار کو عزیز نہیں ہوتی کسی بھی
فن کو جلا بخشنے میں محنت کے علاوہ شہرت کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے بعض بے
تو شہرت حاصل کرنے کیلئے اپنی خودداری اور انا بھی اوروں کے ہاتھوں بیچ دیتے
اور جو لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں وہ نیر تاباں کے آگے ہاتھ جوڑ
صفحہ ۶۲ پر ایک مطلع ہے جو مہمل ہے ملاحظہ کیجئے —

ہم جس طرف اٹھا کے نظر دیکھتے رہے
شعلوں کی زد میں اپنا ہی گھر دیکھتے رہے

کتنا غلو ہے۔ حد سے زیادہ غلو بھی شعر کو مہمل اور بے معنی بنا دیتا ہے۔
آگے ایک شعر ہے — ہوتی رہیں خلوص کے پردے میں سازشیں
ہم کب کسی کے عیب و ہنر دیکھتے رہے؟

عیب و ہنر دیکھنا تنقید کا منصب ہے جس کیلئے نظر اور بصیرت کی ضرورت
حیرت ہے کہ اس اعلیٰ منصب کو شاعر سازش سمجھتا ہے ہائے رے بے کمالی۔
صفحہ ۶۳ پر مطلع ہے —

ذہن میں یوں بچھڑ کے اکیلا گزر نہ جا
اس طرح میرے یاد میرے ہمسفر نہ جا

پہلے مصرع میں نہ گزر کی جگہ گذر نہ جا کہنا ردیف کی مجبوری ہی تو ہے لیکن،

لیکن شاعر نے اس کمزوری کو روا کیسے رکھا اسلئے کہ یہ اسکے قلم کی کمزوری ہے کیونکہ آگے کے اشعار میں بھی ایسی ہی کمزوریاں چلی آرہی ہیں ملاحظہ ہو "ڈر نہ جا - بکھر نہ جا"

مانا کہ زندگی کے مسائل ہیں مختلف
تو زندگی کے سخت مسائل سے ڈر نہ جا
پھر ریزہ ریزہ خود کو سمیٹا نہ جا سکے
شیشے کی طرح ٹوٹ کے ایسے بکھر نہ جا

دوسرے شعر میں لفظ "طرح" قابل توجہ ہے یہ یہاں "طرحا" پڑھا جا رہا ہے یعنی

شیشے کی "طرحا" ٹوٹ کے ایسے بکھر نہ جا"

شیشے کی طرح کہنے کے بعد پھر "ایسے" کہنے کا کیا محل ہے!

صفحہ ۶۴ پر مطلع ہے

روح بے چین لگے ہے کسی گھایل کی طرح
لوگ آپس میں الجھتے ہیں مسائل کی طرح

اول تو "لگے ہے" کہنا غیر فصیح اور متروک ہے دوسرے یہ کہ مسائل، بسمل، دل وغیرہ کا قافیہ گھایل ہرگز نہیں ہو سکتا (کوئی جاہل ہی "مسائل" کا قافیہ "گھایل" باندھ سکتا ہے) جب کہ گھایل میں "ل" سے پہلے کا حرف (یعنی "ی") بالفتح ہے۔

یعنی پایل، ہلچل وغیرہ کے وزن پر گھایل بھی ہے۔

(باقی آئندہ)

وسیم عباس

"رقصِ حیات"

سورج جیسے قبرستان کو الوداع کہتے ہوئے رخصت ہو رہا تھا اُسکی آخری کر
قبرستان کو ختم کیے ہوئے تھیں اور ان کرنوں کا سارا زور صرف ایک سفید سنگ مر
پر مرکوز ہو گیا تھا جیسے وہ دکھلانا چاہتا تھا ان سرخ دمکتے ہوئے گلابوں کو اور
عبارت کو جو قبر کے اس سفید کتبے پر سیاہی سے کندہ تھی " نوجوانی کا سب کو دے
عرفان کی نظریں اس عبارت پر جم گئیں۔ اس کے منہ میں جلتا سگریٹ اپنی
منزلیں طے کر رہا تھا ۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ سارا قبرستان جل رہا ہے۔ ہماری کائنات
یہی ہے کیونکہ سگریٹ کی طرح آہستہ آہستہ اُسکی ذات جل رہی تھی۔

ذات اور کائنات۔ ۔ ۔ کائنات اور ذات کیا یہ دو مختلف چیزیں ہیں؟
کیا ان میں کوئی ربط ہے ؟ ذات کے بغیر کائنات کا وجود کیا معنی ؟ وہ وہاں تنہا
فلسفے میں محو رہا۔ سگریٹ سے جھڑی ہوئی راکھ قبرستان کی گیلی زمین میں جذب
تھی اسی طرح جیسے انسان خاک ہی تو ہے خاک ہو جاتا ہے اور منوں مٹی کے ڈھیر تلے
چلا جاتا ہے۔ دفن ہو جاتا ہے۔ اسکی ذات دفن ہو جاتی ہے۔ اسکی شخصیت دفن ہو
ہے۔ جس طرح نوجوان رعنا دفن ہو گئی تھی۔

معمول کی طرح عرفان مہر کی اُس قبر کے پاس بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ آسمان کی سرخی سیاہی میں گھل گئی۔ قبرستان پر تاریکی اور سناٹا چھا گیا۔ اسی سناٹے میں اس نے ایک آواز محسوس کی جیسے یہ آواز اُسی لحد سے آرہی ہو اور رعنا اُس سے کہہ رہی ہو "عرفان جاؤ زندگی کے دھارے میں مل جاؤ اور حیات کے رقص میں شریک ہو جاؤ۔ ورنہ تمہاری ذات تمہاری شخصیت ادھوری رہ جائیگی" اسکے آگے وہ کچھ سن نہ سکا کیونکہ یکایک ہوائیں تیزی سے چلنے لگیں ہر طرف دھول اُڑنے لگی ماحول غبار آلود اور وحشت ناک ہو گیا۔

عرفان اُس غبار آلود اور وحشت ناک ماحول سے نکل کر آہستہ آہستہ آگے جانے لگا رعنا کی آواز اُس کا مسلسل پیچھا کر رہی تھی "عرفان جاؤ زندگی کے دھارے سے مل جاؤ" آواز جو شخصیت کی پہچان ہے۔

عرفان نوجوان تھا اُس نے نوجوانی ہی میں زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر کھائی تھی اُس نے نوجوانی ہی میں اپنی محبوبہ اپنی شریک حیات رعنا کو کھو چکا تھا۔ قدرت کا یہ عجیب مذاق اُسکے ساتھ ہوا تھا۔ زندگی یہ کتنی ناپائیدار ہے اور انسان اپنی تمنا کے کیسے عالیشان محل اس پر کھڑا کرتا ہے۔ عرفان کے قدم اس سانحے کو بوجھل ہو گئے تھے۔

قبرستان پرانے شہر کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ جمال بابا کی درگاہ اس قبرستان سے قریب تھی۔ اس سے پرے کچھ فاصلے پر ایک نئی عمارت کھڑی تھی۔ جس پر رنگین قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اور ایک سلگتا بجھتا نیون سائن بورڈ راستہ چلنے والوں کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ یہ تھا "آشیانہ" انسانوں کے لیے دانشوروں کے لیے

عرفان نے اپنے بوجھل قدم تیز کر دیئے۔ اور آشیانے میں داخل ہو گیا۔ یہاں کا ماحول کچھ عجیب تھا۔ عرفان نے زندگی میں پہلی بار اس ماحول میں قدم رکھا تھا۔ اُس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ ایک بڑا نیم روشن ہال لوگوں کے قہقہے۔ کچھ لوگوں کی سرگوشی۔ کوئی اونچی

آواز میں بات کرتا ہوا۔ کوئی زندگی کی گہرائی میں ڈوبا ہوا گم صم۔ کوئی اپنے آ
بڑبڑاتا ہوا۔ کبھی گلاس سے گلاس ٹکرانے کی کھنک۔ کچھ لوگ فلسفۂ عشق کی
معروف۔ کوئی تخلیقِ کائنات کی بحث میں الجھا ہوا کوئی سگریٹ کے دھوئیں
بناتا ہوا۔ اور کوئی اپنی خالی گلاس کو گھورتا ہوا۔ اس ماحول میں تنہائی نہ تھی۔ اکی
تھا تصنع نہ تھا۔ "آشیانے" کے اس ماحول میں عرفان کو سکون محسوس ہوا اس
اور سگریٹ جلائی اور اپنے جام سے دو گھونٹ جلدی سے نکل گیا۔ اس نے ہلکا
محسوس کیا۔ پھر اس نے اپنا گلاس خالی کر ڈالا۔ غم کے جذبات مٹتے چلے گئے۔ نا
بادل چھٹتے چلے گئے۔ اسکے آگے ماحول رقص کرنے لگا۔ حیات رقص کرنے لگی۔
گھڑی نے گیارہ کے گھنٹے بجائے۔ روشنیاں گل ہونے لگیں۔ دروازے بند
ہوگئے لوگ باہر نکلنے لگے۔ "آشیانہ" کے منتظمین وقت اور اصول کے بہت پا
رات کے گیارہ بجنے کے بعد ایک جام بھی گردش میں نہ آسکتا تھا عرفان اپنا
جام ختم کرکے نہایت ہی متانت سے باہر نکل آیا۔ شہر کی سڑکیں جگمگا رہی
وحشت اور مایوسی کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اسکے قدموں کا بوجھل پن دھلا ہو گیا تھ
سیدھے اپنے گھر چلا آیا۔

عرفان جس کمپنی میں کام کرتا تھا وہ کمپنی سرکاری دفاتر کو مختلف قسم
اور برقی سامان مہیا کرتی تھی عرفان کے ذمہ ان دفاتر سے کمپنی کے لیے چیک
کرنا تھا اس سلسلے میں وہ مختلف دفاتر ہوتا ہوا اپنی آفس چلا آتا۔
عرفان کی زندگی کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ ہر شام اپنے آبائی قبرستا
اور رعنا کی قبر پر سرخ گلاب بکھیر دیتا اس کو ایسا کرنے میں رعنا کے قرب
ہوتا ایک تسکین ملتی۔

وقت رواں رواں تھا۔ عرفان تنہا ہو گیا تھا۔ تنہائی اس کا مقدر

ایک شام جب آسمان صاف تھا اس پر ایک مدھم سا دلکش ہلال نمودار تھا۔ عرفان اسکی دلکشی میں کھو گیا۔ کہتے ہیں کہ آج سے چودہ سو برس پہلے اس ماہ کے ہلال نمودار ہونے پر عرب قوم کے لوگ سال نو کی خوشیاں مناتے تھے۔ لیکن سانحہ کربلا کے بعد یہی ہلال علامت غم بن گیا۔ ابھی عرفان جمال بابا کی درگاہ سے ہلال نو کا نظارہ کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ سیاہ لباس پہنے وہاں سے گزر رہے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچا کہ تشہیر غم تو توہین غم ہے۔ ضبط غم عظمت غم ہے۔ غم تو آنکھوں آنکھوں میں پیا ہوا وہ آنسو ہے جو نوک مژگاں پر بھی نہ آئے اور دامن ضبط میں جذب ہو جائے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے ایک پر درد۔ دلسوز نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز پر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"وہ پھول زیبا، وہ غنچۂ رعنا، وہ سرو بالا، وہ گل و لالہ، عجب چمن
تھا کہ یاد اسکی جہاں کو اب تک رلا رہی ہے"

عرفان کے آنسو دامن ضبط میں جذب ہو گئے اور آواز دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ آواز جو شخصیت کی پہچان ہے۔ وہ بہت دیر تک اسی پر درد آواز میں کھویا رہا۔ آج اسکے ہاتھ اس سفید مزار پر سرخ پھول نہ بکھیر سکے۔

آواز جو ملاحت ہے۔ آواز جو درد کا نغمہ ہے۔ جو مسرت کی لے ہے۔ جو انسان کا رفیق ہے۔ انسان کی زندگی پر جب تنہائی اور مایوسی کے گھنے بادل چھا جاتے ہیں اور وہ دور تک وہ تنہا ہی اپنا راستہ طے کرتا ہے تو کانوں میں گونجتی آواز ہی اسکی ساتھی بن جاتی ہے عرفان ہر شام قبرستان جاتے جاتے جمال بابا کی درگاہ کے پاس کچھ دیر کے لئے رک جاتا کہ شاید وہ آواز اسے پھر سے سنائی دے اور وہ اس ملکۂ ترنم کو دیکھ سکے۔

انسان کی قوت ارادی کبھی کبھی اسکو اپنی منزل تک پہونچا دیتی ہے عرفان بھی ایسی شخصیت سے ملنے گیا اسی دفتر کی اکاؤنٹ آفیسر مس شبانہ سے کراتے ہوئے کہا

آپ اپنی کمیشن کا چیک ہماری اکونٹ آفیسر سے لے لیں۔

شبانہ ذہین تھی۔ شبانہ کا کیبن صاف ستھرا تھا۔ میز پر سرخ گلاب کا گلدان اسکی سلیقہ مندی کی غمازی کر رہا تھا۔ عرفان نے پھولوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ پھول زیبا، وہ غنچہ رعنا، وہ سرو بالا، وہ گل ولالہ" اس پر شبانہ چونک پڑی پوچھا "عرفان صاحب کیا آپ شاعر ہیں"

"جی نہیں"

کیا آپ شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ عرفان نے کہا "ہاں" "یہ شعر آپنے کہاں پڑھا" عرفان مسکرایا پھر اس نے کہا "یہ شعر میرے ذہن پر اس طرح نقش ہو گیا کہ ایک آسمان پر ہلال غم نمودار تھا اور میں جمال بابا کی درگاہ کے پاس کھڑا اسکا نظارہ کر رہا تھا کہ ایک پُر درد آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور یہ شعر میرے دل کی گہرائی میں اتر گیا۔"

شبانہ نے کہا میں جمال بابا کی درگاہ کے پاس ہی رہتی ہوں۔"

عرفان کے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ شبانہ کی آواز جو بہت دیر سے آشنا لگ رہی تھی اس کا راز اب اس پر کھل گیا تھا۔

پھر کمیشن کے لیے چیک کی وصولی کا سلسلہ جاری رہا۔ شبانہ اور مسرت سے عرفان کی ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔

۲۴ دسمبر کی رات تھی گرجے کے گھنٹے یسوع مسیح کی پیدائش کا اعلان کر رہے تھے۔ کرسمس کے دن لوگوں کے دل فرط مسرت سے دھڑک رہے۔ عرفان مسز جولی کو مبارکباد دینے اسکے گھر پہنچا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اسکی ملاقات شبانہ سے ہوگی تو وہ اس مقدس دن اپنے دل کی بات اس سے کہے گا۔ شبانہ اسکی توقع کے مطابق وہاں موجود تھی۔ عرفان نے مسز جولی کو Happy Christmas کہتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحہ کیلئے بڑھایا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ شبانہ کی جانب بڑھایا۔

شبانہ مجبور ہوگئی اُسکے سرد ہاتھ نے عرفان کے گرم ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ اسکے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ حرارت جو زندگی کی علامت ہے۔

کرسمس کیک کھاتے ہوئے شبانہ اور عرفان محو گفتگو رہے عرفان نے کہا۔ "ہم لوگ اپنے پیغمبروں کی پیدائش کا جشن تو مناتے ہیں لیکن انکے پیغام کو کہاں تک روبہ عمل لاتے ہیں؟

شبانہ نے کہا "سچ تو یہ ہے" عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی" عرفان نے کہا بالکل ٹھیک۔

'یقین محکم" عمل پیہم' محبت فاتح عالم" شبانہ نے کہا" ہر شاعر اور دانشور عمل کا ہی پیغام دیتا ہے" پھر انکی گفتگو جاری رہی۔ شبانہ نے عرفان کو اپنا ہم خیال پایا رخصت ہونے سے پہلے عرفان نے اپنے دل کی بات زبان پر لا ہی لی۔ شبانہ خاموش ہوگئی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ہر روز انکی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ چھٹے دن یہ لگا کر اڑ گئے۔

۳۱ر دسمبر کی رات آ پہنچی۔ دنیا کا گوشہ گوشہ نئے سال کا جشن منانے میں مصروف ہوگیا۔ سارا شہر برقی قمقموں سے جگمگا اٹھا" آشیانہ" میں ایک گھما گھمی تھی۔ نئے سال کی مسرت میں لوگ دھڑلے سے پی رہے تھے۔ عرفان اپنا آخری جام لیکر مسز جولی کے گھر پہنچا مسز جولی کا ہال مہمانوں سے بھرا تھا۔ pop music گونج رہی تھی۔ ایک ایک جوڑا باہوں میں باہیں ڈالے رقص میں مدہوش تھا۔ دیوار پر لگی گھڑی کے گھنٹوں نے رات کے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ روشنی کچھ لمحوں کے لیے گل ہو کر روشن ہوگئی۔ ہال میں Happy New Year کے نعرے گونجنے لگے۔ نئے سال کا رقص شروع ہوگیا۔ زندگی کا رقص۔ مستوں کا رقص۔ حیات کا رقص۔

مسز جولی نے Happy New Year کہتے ہوئے عرفان کی طرف جام بڑھایا۔ خلوص کا جام مسرت کا جام محبت کا جام، صحت کا جام۔ عرفان نے بھی مسز

ممتاز مہدی
پنچل گوڑہ حیدرآباد ۲۴

کوئی زندگی کو خواب سمجھتا ہے کوئی مر مر کے جینے جانے کو زندگی سمجھتا ہے۔ کوئی زندہ دلی کی دلیل سمجھتا ہے یہ سمجھ کا ہیر پھیر ہے سمجھ میں آگیا تو گائے کو پوجے دیکھیں پر اتر آئیں تو "مہاتما" کو بھی گولی ماردیں سمجھ کے رنگ نرالے ہیں۔

شاعر کہتا ہے ؎

سمجھ سمجھ کر سمجھ کو سمجھو سمجھ سمجھنا بھی ایک سمجھ ہے
جو لاکھ سمجھانے پر نہ سمجھے میری سمجھ میں وہ ناسمجھ ہے

علامہ اقبال دیر سے مدرسہ پہنچے تو مدرس نے کہا "اقبال دیر سے آئے ہو" علامہ نے "اقبال دیر ہی سے تو آتا ہے" اور اقبال ناسمجھوں سے یوں مخاطب ہیں ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

غالب کی عمیق شاعری عام قاری کے سر سے اوپر جاتی دیکھ کر آغا جان عیش نے یوں سمجھایا ؎

مگر اپنا کہا یہ آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب نے شاعرانہ انداز بدلا ہے۔

یک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

موت کا ایک دن معین ہے ؎ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ؎ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غالب سمجھ میں آنے لگے اور عام فلاسفہ نے اتنا پیار دیا کہ "چچا" بنالیا۔ غالب سے پہلے اور غالب کے بعد کسی اردو شاعر کو اتنی محبت اتنا پیار نہیں ملا۔ علامہ ملک الشعرا وغیرہ وغیرہ تو بہت ہوئے مگر کوئی "چچا" کے رتبہ تک نہ پہنچ سکا۔

حیدرآباد کے ایک بزرگ، معصوم اور سیدھے سادے ایڈیٹر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنے اردو ماہنامہ "ہندوستانی ادب" میں تلفظ کے اعتبار سے املا کرتے اور جو سمجھ میں آیا لکھ مارتے۔ علامہ حیرت بدایونی، منجو قمر، اور نواب اکبر علی خاں کو جو سمجھ میں آیا لکھ دیا حد یہ کہ اپنے والدین کے عشق کی افسانوی داستان قسط وار اپنے رسالہ میں شائع کی اور یہاں تک لکھ دیا کہ مجنوں کو لیلیٰ سے شیریں کو فرہاد سے اور رانجھا کو ہیر سے عشق لڑانے کی آزادی تھی تو میرے باپ کو میری ماں سے عشق کرنے سے بھلا کون روک سکتا تھا۔ ان کی سمجھ کا نادر نمونہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں صرف دو ہی "انسان کامل" گزرے ہیں ایک وہ بذات خود اور دوسرے پنڈت جواہر لال نہرو، نہرو کے انتقال کے پندرہ سال بعد ایک ایسی غلطی کا علم ان کو ہوا کہ انہوں نے بہت ہی افسوس کے ساتھ نہرو کو اپنی سمجھ والے "کامل انسان" کے اعزاز سے

خارج کر دیا اور اعلان کیا کہ اب عرف میں اکیلا ہی " انسان کامل رہ گیا ہوں ۔
موصوف نے اپنی سمجھ سے کام لے کر اپنی جانب سے انگریزی ڈکشنری کو ایک لفظ عطا
" Meatman " اس لفظ کو انہوں نے دنیا کی ساری یونیورسٹیوں میں گشت کروا!
اعلان کیا کہ کبھی انگریزوں نے بھارت پر فتح حاصل کی تھی، ہم نے ایک نیا انگریزی لفظ
کو دے کر ساری انگریز قوم پر فتح حاصل کی ہے ۔ ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

غریب اردو صحافت کے اس معصوم مجود اور بے لگام مدیر کی مثال اس شرابی کی سی

پی کے میخانے سے ایک رند بلانوش چلا
جب ہوا ہوش سے بیگانہ تو نالے میں گرا
منہ میں موری کا گیا پانی تو یوں بول اٹھا
ساقیا اور پلا اور پلا اور پلا

اگلے وقت کے لوگ کتنا حوصلہ ہمت رکھتے تھے " انسان کامل " کے دعوے سے
آج یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؎

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے
ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

سمجھ نہیں سمجھے سمجھنے سمجھانے والی بات اتنی سی ہے کہ بڑا چھوٹے کو نہیں سمجھتا چھوٹے
کو نہیں سمجھے ' نہ وفاداری بہ شرط استواری ہے نہ دین داری دکھاوے سے خالی ہے
ـــــ ہر بت طناز اپنے کو خدا سمجھا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں انسانیت مفکر خیز یوں
میں پھنس کر رہ گئی ہے اس کا مداوا ہم لطیفوں میں ڈھونڈ رہے ہیں کہ لطیفہ سمجھ
معیار سے ٹکرانے سے وجود میں آتا ہے ۔ لہٰذا مزاح کو " آدمی باتیں شائستہ کہنا ہے

ایک مسکراہٹ کی کیا قیمت ہوتی ہے، جوش ملیح آبادی کے کلام میں تلاش کیجئے اور طنز کے تیر کو محسوس کرنے کی کوشش کیجئے کہ "طنز" سمجھ کا ایسا ہتھیار ہے جو علم طور سے اکثریت کے سروں کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ نشانے پر بیٹھ جائے تو اصلاح کا باعث بن جاتا ہے۔
برنارڈ شا کے کوٹ کے پھٹے آستین کو دیکھ کر ان کے ہمعصر ادیب نے کہا!
مسٹر شا! آپکے کوٹ کے پھٹے آستین سے آپ کی غربت جھانک رہی ہے۔!"
برنارڈ شا نے فوراً جواب دیا "نہیں آپ کی حماقت میرے کوٹ کے آستین کے اندر جھانک رہی ہے"۔ حسد، غیبت، لالچ، سگریٹ، شراب، جوا، سٹا، ناسمجھی کی علامتیں ہیں زندگی کی ساری بلندیوں اور پستیوں میں جھانک کر دیکھئے، ہر قسم کے فساد کی جڑ "ناسمجھی" ہے سمجھ سے کام لیجئے۔
سمجھ کے شیش محل کو ٹھوکر نہ لگایئے۔

سلام ۳۷

جولی کو Happy New Year کہا پھر جام سے جام ٹکرائے۔ عرفان کی نظریں شبانہ کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھی محو تماشہ تھی۔ عرفان نے نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے اپنا ہاتھ شبانہ کی طرف بڑھایا۔ شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ عرفان نے پاس کے گلدستے سے ایک سرخ گلاب نکالا اور شبانہ کی زلفوں میں لگایا شبانہ کی نظریں فرط مسرت سے جھک گئیں۔ عرفان شبانہ کو لیکر رقص کرنے لگا۔
عرفان کی زندگی رقص کرنے لگی۔ اسکی حیات رقص کرنے لگی۔ اسکی کائنات رقص کرنے لگی۔ اسکی شخصیت رقص کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج وہ زندگی کے دھارے میں مل گیا ہے۔ حیات کے رقص میں شریک ہو گیا ہے۔

حامد لطیف ملتانی قادری

آم میں غذائیت

(انجمن طلبائے مدارس قدیم کے جلسہ منعقدہ ۱۳ مئی ۹۵ء میں پڑھا گیا۔ قارئین شاداب کے لئے پیش)

کہا جاتا ہے کہ آم کا وطن ملایا ہے لیکن بعد تحقیق یہہ پتہ چل گیا کہ آم کا
وطن ہندوستان ہے آسام اور برما کے علاقوں میں آم پایا گیا چنانچہ آج بھی چٹاگ
علاقے اور آسام کی پہاڑی پر اسکے خودرو جنگل پائے جاتے ہیں۔ آم اتنا لذیذ
پھل ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اگانے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہو
دنیا کے ان ممالک میں پایا جاتا ہے۔ تھائی لینڈ' انڈونیشیا' برازیل آسٹریلیا
امریکہ' ویسٹ انڈیز اور برما وغیرہ۔ ان تمام ملکوں میں آم ہندوستان سے پہنچا
لیکن ان آموں کی لذت' مزہ' ہندوستانی آموں کی مہک اور مزے سے بالکل
ہوتی ہے۔

اُردو اور ہندی میں اسکو آم کہتے ہیں اور زبان تلگو میں مامڈی پنڈلو بولا جا
([illegible]) ہندوستان کی قدیم زبان پالی میں اسے انبو اور بر
انبم (آمبم) بولا جاتا تھا چنانچہ فارسی میں یہی لفظ انبہ بن گیا عربی میں آم کو انبج
اور انگریزی میں (MANGO) کہتے ہیں اور سنسکرت میں اسکو امر کہتے ہیں

ہر زبان میں الگ الگ نام ہیں۔

خاندان غلامان کے ایک مشہور بادشاہ شمس الدین التمش کو آم بے حد نہایت پسند تھے چنانچہ اس نے اس پھل کا نام فارسی زبان میں "نغزک" رکھا جس کے معنی ہے نادر نایاب تحفہ لیکن یہ نام مقبول نہ ہو سکا۔ خاندان مغل کے بانی بادشاہ ظہیر الدین بابر نے کہا تھا کہ آم ہندوستان کے عمدہ پھلوں میں سے ایک ہے اور یہ پھل میرا دل پسند ہے۔ اکبر اعظم نے تو آم کو تمام پھلوں کا بادشاہ قرار دیا تھا وہ آم کا بے حد شوقین تھا اس نے بہار میں ایک لاکھ آم کے درخت لگوائے تھے۔ جو لاکھ باغ کے نام سے مشہور ہوا۔

محمد تغلق کے زمانے میں افریقی سیاح ابن بطوطہ ہندوستان ۱۳۳۳ء میں آیا تھا اپنے سفرنامہ میں آم کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اورنگ زیب کے زمانے میں ایک فرانسیسی سیاح (BERNIER) جو بارہ سال تک اورنگ زیب کا طبیب رہا تھا اپنے سفر نامے ۱۶۶۳ء میں لکھا ہے کہ بہترین آم بنگال، گولکنڈہ اور گوا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ پھل نہایت عمدہ اور لذیذ ہوتا ہے کہ کسی اور مٹھائی کا مجھے علم نہیں ہے۔

ہندوستان کے قدیم شاعر والمیکی نے رامائن میں آم کے باغوں اور جنگلوں کا جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے مشہور شاعر کالی داس نے اپنے کئی ناٹکوں میں اس پھل کا ذکر کیا ہے۔ حضرت امیر خسرو نے بھی ۱۳۲۳ء میں آم کے بارے میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا اس قصیدہ میں آم کو افضل پھل اور فخر گلشن کا نام دیا ہے۔

دوسرے پھلوں کو کاٹ کر کھانے میں مزہ نہ آتا ہو مگر یہ خوبی اور لذت صرف آم میں باقی ہے کہ کسی طرح کھائیے، اسے تراش کر کھائیے کچا کھائیے، پکا کھائیے۔ ہر صورت میں کھایا جا سکتا ہے۔ اور ہر صورت میں آم لطف دیتا ہے اور اپنا جواب آپ ہے اس لیے آم کو پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ جو اسکے اوصاف کے لحاظ سے مناسب ہے۔

اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب بھی آم کے بڑے قدردان تھے اپنے دوستوں سے

عمدہ، عمدہ آم کیلئے تقاضا کرتے چنانچہ انکے یہہ الفاظ خاص و عام مشہور ہیں "گدھے آم نہیں کھاتے" کسی نے گدھے کے سامنے آم کا چھلکا ڈالا، گدھے نے چھلکا تک نہ سونگھا۔ لوگوں نے مرزا غالب کے سامنے مثال پیش کی جس پر غالب نے یہہ جملہ چست کیا تھا "گدھے آم نہیں کھاتے"۔ غالب نے اپنے خطوں میں بھی آم کا ذکر کیا ہے چنانچہ اپنے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں۔ "شام ہو چلی چراغ روشن ہوا، منشی سید حسین سرہانے بیٹھے ہیں، میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ نصیر الدین آیا، ایک کوزا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ میں، اس کے سر پر ٹوکرا۔ اس میں گھاس بچھی ہوئی ایک ایک آم کو سر بمہر گلاس سمجھا یا دہ انگوری سے بھرا ہوا مگر کس حکمت سے بھرا ہے کہ (۶۵) گلاس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں گر سکتا"۔

اکبر الہ آبادی کو بھی آم بہت پسند تھے انکی ایک نظم "آم کی فرمائش" مشہور ہے۔

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجئے \
اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے

ایسے ضرور ہوں کہ انہیں رکھ کے کھا سکوں \
پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے

ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں \
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

آم کا تعلق ... سے بھی رہا ہے چنانچہ کیجیے آم جسکو کیری بھی ... اپنے فن میں کیری کی شکل کو استعمال کر کے گل بوٹے بنا کر آراستہ کر ...

کیری کی مثال کپڑوں پر چھاپی یا کاڑھی جاتی ہے چنانچہ کیری کے مختلف ڈیزائن کپڑوں کی دلکشی اور خوبصورتی میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔

آم کی کئی قسمیں ہیں اس مختصر سے مضمون میں تفصیلی ذکر ممکن نہیں ہے ایک اندازہ ہے کہ آم کی قسمیں ہزار سے اوپر ہے جس میں تخمی آم کی تعداد شامل نہیں ہے۔ جس ملک میں آم کی اتنی مقدار پائی جاتی ہے تو انکے نام بھی مختلف ہونگے اتر پردیش میں طوطا پری تو ... میں اس نام کو کسی اور نام سے پکارا جاتا ہے

لیجئے چند دلچسپ آم کے نام ملاحظہ فرمائیے۔ سرمے دانی، قندیل، پاپوش،

حسن آرا، کالی پری، سفیدہ، سوتاتول، زمرد، گوہر نایاب، بلبل، مچھلی، ناگن، سرخ، بدریان، کالا پہاڑ، کوہ طور، ہم ساگر، نازک بدن، چشم، میڈم، ولیم صاحب، ولیرات، بنارس کا لنگڑا، آمن انگوری، انار ملغوبہ، سویا کلاں، سیب ہند، شریفہ کیلا، عنابی گولا، چیلا آفاق، کوزہ شیریں، دو پھول وغیرہ وغیرہ۔

آم کے رنگ روپ بھی الگ الگ ہوتے ہیں چھوٹے سے چھوٹا آم امرود (بادام) کے برابر ملے گا اور بڑے سے بڑا آم آٹھ نو انچ لمبا ہوتا ہے۔ آموں کے وزن میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا قلمی آم ۵۰ گرام سے کم اور بڑے سے بڑا ڈیڑھ کیلو سے زیادہ ہوتا ہے۔ اتر پردیش کا آم جیسے حق سبو کہتے ہیں تقریباً پانچ سیر کا بھی ہوتا ہے۔

آم شکل کے لحاظ سے لمبا، پتلا، چپٹا اور گول بھی ہوتا ہے کیری بیشتر صورتوں میں ہرے رنگ کی ہوتی ہے لیکن پکنے پر رنگ بدل جاتا ہے آم پکنے کے بعد اکثر سبز رنگ ہوتا ہے۔ زرد، سرخ نارنجی یا ملے جلے رنگ کا بھی ہو سکتا ہے آموں کا ذائقہ کھٹا، میٹھا یا ملا جلا ہوتا ہے۔ ہر ایک کی بو باس الگ ہوتی ہے سب سے اچھی خوشبو والا آم جسکو گلاب خاص کہتے ہیں، ہوتی ہے ایک ایسا آم بھی ہوتا ہے جسکی سب سے ناقص اور خراب اقسام ہوتی ہے جسکی بو پیٹرول یا تارپین تیل سے مشابہ ہوتی ہے۔

پنجاب کے ایک مقام برنالہ میں دنیا کا سب سے بڑا آم کا درخت ہے جسکے تنے کا پھیلاؤ (۳۴) فٹ ہے اس درخت کی ہر شاخ خود ایک درخت کے مماثل ہے۔ اس درخت سے تقریباً ۱۵ ٹن آم ہر سال پیدا ہوتا ہے اسکے برخلاف وقار آباد میں ایک چھوٹا درخت ہے جسکی لمبائی اور پھیلاؤ دونوں (۸) فٹ ہے اس آم کو "محمود" کہا جاتا ہے۔ زیادہ پھل دینے والا درخت ہے اور اس کا آم بہت ذائقہ دار اور بدمزہ ہوتا ہے۔

حیدرآباد کی سرزمین اور آب و ہوا آم کی کاشت کے لئے نہایت موزوں ہے تقریباً سبھی قسم کے آم حیدرآباد کے آس پاس کے علاقوں میں بہتر طور پر اگائے جاسکتے ہیں۔

چنانچہ سنگاریڈی میں پھلوں کے تحقیقی مرکز کے زیر انتظام آندھرا پردیش زرعی
تمام تعلیم کے آموں کی کاشت ہو رہی ہے ضلع نلگنڈہ کے ایک گاؤں میرا پیا
(۵۰۰) ایکڑ سے زیادہ رقبہ پر آم کا ایک باغ تھا اس باغ کے مالک کے بموجب
دنیا میں سب سے بڑا آم کا باغ تھا مگر اسکو بے توجہی سے خراب کر دیا گیا۔ آصف
دور میں نواب اعظم علی خاں نے آم "اعظم الثمر" ملکہ وکٹوریہ کو تحفہ کے طور پر روانہ
جو آم کی بہترین قسم ہے جسکی ابتدائی شاد نگر میں ہے۔

اردو زبان میں آم کی کہاوتیں کافی مشہور ہیں جن میں سے چند یہ ہیں
(۱) آم کے آم گٹھلیوں کے دام (۲) آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے
(۳) آم کھائے پال کا اور خربوزہ کھائے ڈال کا
(۴) آم کے دام کھاؤ، اصلی لڈو اصلی کھاؤ (۵) کوئل بولے آم پکے۔
(۶) ایک آم ہزار دام (۷) آم کھاؤ بھانت بھانت کے، سپنے دیکھو سات رات

آم کے بارے میں ایک مزاحیہ حکایت دلچسپی کا باعث ہوگا کہا جاتا ہے
ایرانی سردار ہندوستان آیا اور آم کھا کر جب اپنے وطن واپس گیا اپنے بادشاہ کے دربار
میں آم کی بہت تعریف کی۔ بادشاہ اور درباری آم کے مزے کے بارے میں حیران ہو
گئے کیونکہ وہ لوگ آم کو دیکھے نہ تھے اور نہ چکھا بھی نہ تھا ایرانی سردار آم کے مزے
سے واقف تھا اور الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکا چنانچہ ایک برتن میں شہد اور تھوڑا
ایک مرکب تیار کیا اور اس میں اپنی داڑھی ڈبودی تاکہ آم ریشے کا پھل بن سکے اور
سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ اس ڈبی ہوئی داڑھی کا رس چوس لیں تو آم کا مزہ پا لیں گے
سب حیرت میں پڑ گئے۔

آم میں ۸۵ تا ۹۰ فی صد پانی ہوتا ہے دس فی صد پروٹین، چربی، کیلشیم
لوہا اور فاسفورس پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ طب یونانی کی کتابوں میں آم کو غذا

کا کافی تذکرہ کیا گیا ہے حکیم، وید اور قدرتی علاج کے ماہر آم کو تمام پھلوں سے زیادہ فائدے مند بتاتے ہیں۔ وید آم کے درخت کا گوند دواؤں میں کام آتا ہے غیر مسلم آم کے پیڑ کو مقدس مانتے ہیں آم کے پتے دروازے پر لٹکاتے ہیں آم کے پتوں کا دھواں کالی کھانسی اور گلے کی بیماریوں میں مفید ہے۔ آم کی چھال اور پتوں کی راکھ پھوڑے پھنسی اور کھجلی والے مقام پر لگانے سے آرام ملتا ہے آم کی کونپلوں اور کچی گٹھلی کے رس کی دو چار بوندیں ناک میں ٹپکانے سے نکسیر بند ہو جاتی ہے

یہ خیال عام ہے کہ انسان موسم سرما میں ہی اپنی صحت بنا سکتا ہے۔ لیکن آپ موسم گرما میں آم کا باقاعدہ استعمال کریں تو صحت بہتر ہوتی ہے البتہ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔

بے ریشے کا آم قبض پیدا کرتا ہے اور ریشے دار آم زیادہ فائدے مند ہے آم ایک بہتر مقوی غذا ہے خون کو صاف کرتا خون کو بڑھاتا اور جلد کا رنگ نکھارتا ہے پیشاب لاتا ہے معدے کو مضبوط کرتا ہے بھوک بڑھتی ہے گرم مزاج والے آم کا استعمال کم کریں نہار منہ اسکا استعمال نقصان دہ ہے پیٹ میں کیڑے ہوں تو نہار منہ کھا سکتے ہیں کیونکہ یہ کیڑوں کو مارتا ہے۔

آم کے زیادہ استعمال سے قبض، بدہضمی، آنکھ کی بیماری، خون کی خرابی اور موسمی بخار جیسے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک گلاس دودھ میں ۱۲۵ گرام آم کا رس ملا کر پینے سے پرانا قبض دور ہوتا ہے۔ بلاشبہ آم اعضائے رئیسہ دل، دماغ، معدہ اور گردہ کو قوت دیتا ہے اگر معدہ کی خواہش نہ ہو تو آم کھانے کے بعد لیموں کا شربت یا جنجر واٹر پی سکتے ہیں جو بہت مفید ہوگا۔ دوران حمل خواتین کیلئے آم بہترین پھل ہے اور بچہ بھی صحت مند پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال آم طاقت اور صحت کا سرچشمہ ہے۔ آم کو کھانے سے قبل ٹھنڈے پانی میں بھگو دیا جائے تو بہتر ہے اور اب یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی کہ بزرگوں نے کہا کہ "آم کھانا اور کھلانا عقلمندی کی بات ہے"۔

مستان منظور
۱۱-۳-۱۵۲ نے پلی حیدرآباد

قطعات

خودپسندی نے مچائی ہے تباہی دیکھو حسنِ اخلاص پہ بکھری ہے سیاہی
بھائی سمجھا تھا جسے وہ بھی تو بھائی نہ ہوا دوستی میں بھی بیگانہ نگاہی

○

آپ کے ہے کرم ٹوٹ کر رہ گئے اپنی سانسوں میں غم ٹوٹ کر
چوٹ ہے زخم ہے درد ہے کرب ہے کیا بتائیں کہ ہم ٹوٹ کر رہ

○

اب تمناؤں کے لٹنے کی کوئی بات نہ ہو دل ناداں کے لیے پھر نئی سو
چوٹ سہنا ہے تڑپنا ہے جیئے جانا ہے زندگانی میں محبت کی مدارا

○

خوشی کی آرزو میں تو یہاں صدمے اٹھانا ہے ملے گی زندگانی میں خوشی [illegible]
کسی کو اپنا کہہ کر ہم پشیماں ہو گئے خود ہی سکونِ دل کی خاطر بیخودی سے

○

غزل

ڈاکٹر سید حسن بی اے۔ ڈپلومان فزیو تھراپی
۔ ڈی ایچ ایم ایس ہومیو فزیشین
۲۴۱-۱-۶ غربت آباد۔ حیدرآباد۔ ۴---۵

طوفاں ہے اور وقت کا دریا ہے سامنے
جانا جو ہے تو ڈوب کے جانا ہے سامنے

تصویر دیکھئے تو ذرا میرے شہر کی
محشر کا اک کھلا ہوا نقشہ ہے سامنے

نفسی ہی نفسی چار سو، راہ وفا ہے بند
جاؤں کہاں میں کونسا رستہ ہے سامنے

بھرتا ہے کان کوئی فقیہانِ شہر کے
خود مطلبی کا دیکھئے چرچا ہے سامنے

شہرت کے تار پر جو چڑھے کوئی عنکبوت
اہلِ خرد کے حق میں تماشہ ہے سامنے

میں جس میں جا رہا تھا گماں کی وہ دھوپ تھی
پلٹا ہوں اب یقین کا سایہ ہے سامنے

اپنی انا کو بڑھ کے بچانا پڑا مجھے
اک مرحلہ تو ایسا بھی آیا ہے سامنے

دیکھیں کہ کس کا عزم یقیں کس کا چور ہو
پتھر ہے اُس کے ہاتھ میں شیشہ ہے سامنے

لکھنی تھی اپنی بات یہ کیا لکھ گئے حسنؔ
دیکھو اُنہی کی بات کا خاکہ ہے سامنے

غزل

ڈاکٹر مسعود جعفری

اک ستارہ ہی فضاؤں میں اچھالا ہوتا
شب کے آنگن میں بہت دور اُجالا ہوتا

بارِ دیگر ہی سہی یہ بھی تو کرنا تھا تجھے
پرچمِ حسن مرے نام نکالا ہوتا

تیرے اجداد نے صدیوں میں بنایا جس کو
اپنے کاندھے پہ اُسی پل کو سنبھالا ہوتا

تو نے کچھ دیر سنی ہوتی ہماری بپتا
تیری رنجش کا ذرا سا تو ازالہ ہوتا

ہم نے جلنے سے پتنگوں کو بچایا اکثر
ورنہ آئینِ وفاؤں کا نرالا ہوتا

تیری توقیر نگاہوں میں یقیناً بڑھتی
گر ترے پاس محبت کا حوالہ ہوتا

تلخیٔ زیست کے ماتم کے سوا بھی مسعود
خیمۂ جاں کو ہواؤں میں سنبھالا ہوتا

ذوالفاروق شعور
شکر گنج - حیدر آباد

رہتا ہے انتشار سے محفوظ وہ مقام
وحدت کے جام کی جہاں ہوتی ہے رسمِ عام

روشن ضمیر و اہلِ نظر اہلِ دل ہے وہ
آتا نہیں ہے حسنِ جہاں کے جو زیرِ دام

جن کی نگاہ و دل میں ہے تو ہی بسا ہوا
رہتا ہے اُن کے لب پہ ترا نام صبح و شام

اصلاحِ میکدہ کی توقع فضول ہے
جب تک نہ میکدہ کا بدل جائے انتظام

تُلے ہیں قبر پر وہ لگانے کو شاخِ گل
کانٹے جو زندگی میں بچھاتے تھے گام گام

در پردہ پھوٹ ڈالنا جن کا ہے مشغلہ
ظاہر میں لیتے رہتے ہیں وہ قافلے کا نام

کیا سو گئے شعور عنادل بہار میں
زاغ و زغن چمن میں ہوئے فائز المرام

حنیفہ انجم
۵۵۵-۲-۷
کریم نگر

میں نے یادوں کی انگیٹھی کو جلایا بھی نہیں
کوئی پل اسکو بھلا دوں یہ ارادہ بھی نہیں

یہ خرافات میں احباب کی جاتا بھی نہیں
اپنی من مانی کئے جاؤ اچھا بھی نہیں

خود کو مجرم وہ سمجھتا ہے مجھے حیرت ہے
اس پہ الزام ابھی میں نے تراشا بھی نہیں

کیوں مرے خون کا پیاسا تو نظر آتا ہے
سچ بتا تیرا مرا خون کا رشتہ بھی نہیں

اسکے آنگن میں کہاں پھول سے بچے ہوں گے
جس کے آنگن میں کسی پھول کا پودا بھی نہیں

قیمت اپنی بتاؤں یہ قدردان کیا ہے!
کیا تمہیں اپنا پرایا نظر آتا بھی نہیں

خود کو اردو کا بہی خواہ بتانے والو!
آپکے گھر میں تو اردو کا رسالا بھی نہیں

پھر وہ معصوم خموشی ہے پرستی انجم
دل مرا لٹ گیا اور پتا کا بھی نہیں

غزلیں

اسلم ڈبائیوی
آپکا ہینڈلوم ایمپوریم
مختارِ فلور مل، چودھری خیل
ڈبائی۔ بلند شہر (یوپی) ۲۰۲۳۹۳

(۱)

کیا کیا نہ دکھایا ہے شہروں کی فضاؤں نے
تحریریں لباسوں پر لکھ دی ہیں اداؤں نے

ہے جس سے حقیقت میں ہر چیز یہاں روشن
وہ نور دیا ہم کو آدم کی خطاؤں نے

محفوظ نہ رہ پائے اب تاج محل شاید
منصوبے بنائے ہیں پتھر کے خداؤں نے

اس دورِ جدیدی میں ہم سے نہ یہ پوچھو تم
گھر کتنے جلا ڈالے منہ زور ہواؤں نے

میں کیسے کروں شکوہ یا رب مجھے جینے کی
قسطوں میں اجازت دی ظالم کی سزاؤں نے

ہر پیڑ پرندوں کی قربت کو ترستا ہے
کر لی ہے کوئی سازشِ موسم سے گھٹاؤں نے

اب کشتیِ اسلم پر اللہ کرم کرنا
طوفان اٹھایا ہے موجوں کی صداؤں نے

(۲)

آئینہ لا کے دیکھ میں تیرا جواب ہوں
میں اپنی زندگی میں بہت کامیاب ہوں

میرا ہر ایک حرف پڑھو غور و فکر سے
میں زندگی کی ایک مکمل کتاب ہوں

میں چاہتا ہوں آج بھی سچائی کا لباس
تیری نظر میں کس لیے خانہ خراب ہوں

جب چاہوں آسمان سے پتھر برس پڑیں
میں دشمنوں کے حق میں خدا کا عذاب ہوں

تم لوگ ظلمتوں میں بھٹکتے ہو کس لیے
مجھ سے آجا کے مانگ لو میں آفتاب ہوں

اسلم وہ کہہ رہا تھا سرِ بزم دل کی بات
محسوس مجھ کو کیجئے میں بھی گلاب ہوں

ش۔ا۔ خان ۔ انور
محلہ بڑ، مکان ۲-۶-۷۰۰۱،
...آباد / ۵۰۰۰۴۰

غزل

روشنی کے دامن میں ظلمتیں کچھ ایسی ہیں
دل وفا سے خالی ہیں، الفتیں کچھ ایـ

پھر جدائی دیوانے، فکر پھر نہیں کرتے
دردِ عشق میں شاید لذتیں کچھ ا

ہم جفا نہیں کرتے، وہ وفا نہیں کرتے
کیا کریں گے دونوں کی فطرتیں کچھ ا

جیسے گل سے خوشبو کو، روح کو بدن سے ہے
ہم کو عشق میں ان سے نسبتیں کچھ ا

وہ ہے سب سے پوشیدہ سب ہیں پھر بھی گرویدہ
حُسن کی زمانے میں شہرتیں کچھ ایسی

ترکِ عشق پر مائل ہوتا ہی نہیں ہے دل
بے قراریوں میں بھی راحتیں کچھ ایـ

صرف ہاتھ ملتے ہیں، اور دل نہیں ملتے
آجکل زمانے میں، چاہتیں کچھ ایـ

ہم جائیں گے، آنے والوں سے کہئے
راہِ عشق میں انور، آفتیں کچھ ایسی ہیں

○

حکیم خواجہ ضمیر

غزل

تو میرے دل میں نظر میں خیال و خواب میں ہے
میں کیسے سمجھوں کہ جلوہ ترا نقاب میں ہے

یکایک آگ لگا کر مرے نشیمن کو
خدا ہی جانے یہ کیوں برق اضطراب میں ہے

ان آنسوؤں کی حقیقت کوئی سمجھ نہ سکا
جگر کا خون مرے دیدۂ پُر آب میں ہے

نہ جانے رنگ حقیقت کہاں ہے پوشیدہ
نگاہ آج بھی اُلجھی ہوئی سراب میں ہے

میں تیرے ہاتھ سے لوں جام کس لئے ساقی
تری نگاہ کی مستی کہاں شراب میں ہے

سنا ہی ہے غزل در غزل کوئی
یہ حسن کس کا مری چشم انتخاب میں ہے

جلانی ہوگی تجھے شمع عزم نو کو ضمیر
کہ زندگی ابھی اک ظلمت عذاب میں ہے

○

گھامڑ نلگنڈوی
۵-۱۲-۵۰ رحمت نگر
نلگنڈہ - ۵۰۸۰۰۱ - ۸

غزل

آپ بلائیں یا نہ بلائیں میں تو آؤنگا جناب
شادی میں بیٹی کی بریانی میں کھاؤنگا جناب

ماموں سے میرے بہت کچھ ملتا ہوں !
میں برابر ماموں کی بکریاں چراؤنگا جن

آپ ہیں رقیب میرے پھر بھی آئے گھر میرے
چائے نہیں تو کم سے کم پانی پلاؤنگا جناب

کام ملے یا نہ ملے سالے اپنی بیوی
بیچ کر زیور سہی دوبئی کو جاؤنگا جن

پیشہ آبائی کو کیسے چھوڑونگا میں !!
مسجد میں چپل وہ چرائے ہیں لوٹے چراؤنگا جناب

آپ دیوانہ کہیں یا کہیں گھامڑ :
میں ہوں شاعر ہر گھڑی گنگناؤنگا جن

○

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

جلد : ۱۲
شمارہ : ۷
جولائی : ۱۹۹۵ء
قیمت : ۶ روپے

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری	رشید الدین	قدیر انصاری

مجلس مشاورت :-

زرتعاون :-

	سالانہ	۲ سال	تاحیات
ہندوستان	۶۵ روپے	۱۲۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۲۰۰ "	۳۶۰ "	۳۷۰۰ "
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ :-

ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱ ریڈہلز ۔ حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈہلز حیدرآباد ۴ اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دعوت ہی امتِ مسلمہ کی اصل قدر و قیمت ہے

۱۳ ر ۱ ر ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۳ جون ۱۹۹۵ء معہد الدعوۃ کے طلبہ و اساتذہ کے سامنے حضرت مولانا نے جو فکر انگیز تقریر فرمائی وہ ہدیہ ناظرین ہے

اما بعد اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وَلتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینہون عن المنکر ہ

یہ بات معلوم کر کے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اس سال خطابات، مطالعہ اور پڑھنے کے سلسلہ میں مشغول کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے، یہ ایک بدیہی حقیقت اور ایک تاریخی واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تمام مساعی اور ان کی برکات۔ ان کے فیوض و اصلاحات اور ان کے فیض سے عالم انسانیت کے اندر جو تعلق مع اللہ اور تعلق باللہ پیدا ہوا اور عقائد کی تصحیح ہوئی اور اصلاح خلق کا رجحان پیدا ہوا۔ منکرات اور مظالم کے خلاف جذبہ پیدا ہوا ان کو ختم کرنے یا ان کو کم کرنے کا اور پوری انسانیت کے رخ کو بدلنے کا تمنا اور جذبہ ...

رخ کو بدلنے کا جو کام شروع ہوا۔ اور انجام کو پہنچا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے اس سب کی بنیاد دعوت تھی، نہ حکومت تھی، نہ سیاست نہ طاقت تھی، نہ صنعت تھی نہ [illegible] تھی، نہ ذاتی اثر و رسوخ تھا، خالص دعوت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں [illegible] طور سے اس حقیقت اور امتیاز کو نمایاں کیا ہے اور جس نبی کے بھی حالات پڑھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے کام کی بنیاد اور ابتداء اور انتہا بھی اسی دعوت پر ہوتی اور [illegible] تعالیٰ نے اس کا انتظام فرمایا۔ اور انبیاء کرام نے خاص اس کی جدوجہد کی کہ ان کے تیار کیے ہوئے لوگ ذمہ داری کو سنبھالیں اور اس کو اپنا فرض سمجھیں، اسی لئے قرآن مجید میں امر کے صیغے کے ساتھ ولتکن منکم امۃ الی اخرہ۔ تم میں ایک ایسی امت رہنی چاہیئے جس کا کام یدعون الی الخیر ہو (وہ خیر کی طرف بلاتے ہیں) پھر اس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ سب سے بڑے مثالی، مستند اور مقبول داعیوں اور سب سے زیادہ کامیاب داعیوں کا پیش کیا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام ہیں اگر آپ ان میں دیکھیں گے تو دعوت کی روح کو [illegible] ہوتا ہے کہ دعوت ان کا مزاج تھا۔ ایک ہوتا ہے کام، ایک ہوتی ہے ضرورت کا ایک ہوتا ہے وقت کا تقاضہ اور ایک ہوتا ہے مزاج تو انبیاء کرام کا مزاج بلکہ [illegible] مزاج دعوت ہے

اللہ تعالیٰ نے جو جزئیات بیان کیے ہیں انبیاء کے مکالمے اور ان کی دعوت کے طریقے [illegible] کیے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اولاً و اصلاً وہ داعی تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خاص امتیاز رکھنے والے دنیا میں قیامت تک ان سے نسبی و اعتقادی اور دعوتی انتساب رکھنے والے دنیا میں قیامت تک دعوت الی اللہ، دعوت الی الآخرۃ۔ دعوت الی الدین، دعوت الی الفضائل۔ دعوت الی الانسانیۃ ان سب کے ذمہ دار وہی ہوں گے۔ جو حقیقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیرو ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ملۃ ابیکم ابراہیم ھو سماکم المسلمین مہر لگا دی ہے کہ مسلمان جو آخری امت ہیں اور جن کے متعلق کہا گیا ہے۔

کنتم خیر امۃ خیر امت کے اصل صفت اعلیٰ اور اس کے بانی اور ترقی ۔ سرپرست حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں ۔ قرآن مجید میں جہاں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ آیا ہے اس میں صاف داعیانہ روح جھلکتی ہے اور ان کو سب سے زیادہ داعی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور کسی داعی کو جو سب سے بڑا خطرہ پیش آسکتا ہے اور بڑی سے بڑی قربانی اس کو دینی پڑتی ہے اس کا نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں وہ عظیم الشان قربانیاں بیان کی گئی ہیں آپ نے جب عقیدہ توحید کا اعلان کیا اور بادشاہ وقت کی پرستش سے انکار کیا تو آگ جلائی گئی اور کہا گیا کہ اس کو اس آگ میں ڈال دو ۔

دیگر انبیاء کرام کے تذکروں میں ایسی کھلی آزمائش کے واقعات تاریخ میں نظر نہیں آتے پھر دوسری آزمائش جس وقت انھوں نے کہا یا بنیّ انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تریٰ ؟

ترجمہ ۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ برخوردار میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو بامر الٰہی ذبح کر رہا ہوں سو تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے ؟

یہ دونوں قربانیاں ایسی ہیں جن کی داعیوں کی زندگی اور تاریخ میں کیا ؟ انبیاء کرام کی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور ان دونوں کا تذکرہ کرکے گویا اللہ تعالیٰ نے اشارہ کر دیا ہے کہ داعی کو یہ مرحلے پیش آسکتے ہیں تو اسلام کی تاریخ کا اسلام کی کامیابیوں کا ۔ اور جو انقلاب اسلام لایا ہے ۔ اور جو کردار اس کے سپرد کیا گیا ہے ۔ اور جو فیصلہ امت مسلمہ پر کرتی ہے ان سب کا انحصار دعوت پر ہے امت جب تک دعوت سے منسلک رہے گی دنیا میں خیر کی امید ہے اور دنیا میں خیر پھیلے گی ۔ اور خدانخواستہ یہ امت اگر دعوت سے منتقل اور کنارہ کش اور بے تعلق ہو گئی تو دنیا خطرہ میں پڑ جائے گی اس لئے ضرورت ہے کہ دعوت کے پیغام کو زندہ کیا جائے اور جیسا کہ ربعی بن عامر نے رستم سے کہا تھا ۔ جب رستم نے پوچھا تھا ما الذی جاء بکم (تم کس غرض سے آئے ہو) رستم کے اس سوال کے دس جواب ہو سکتے تھے ۔

اور رستم توقع کرتا تھا کہ اس کو یہ جواب دیا جائے گا کہ آپ لوگ سینکڑوں برس سے عیش کر رہے تھے لیکن ہم وہاں فاقہ کر رہے تھے اور خیموں میں رہتے تھے اونٹ کا گوشت کھاتے تھے اور اس کا دودھ پیتے تھے۔ اور کھجوروں پر ہماری گزر اوقات تھی، ہم اپنا حق لینے کے لیے آئے ہیں، کیا یہ سب آپ ہی کے لیے ہے؟ ہمیں بھی حصہ رسدی ملنا چاہیئے بالکل رستم اس کے لیے تیار تھا کہ اگر وہ کہ اس کا جو پیدائشی اور فطری حق اور حق ہے ان کو دے دیا جائے اور ان سے بچ سکے۔ جہاد کا کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ سب لوگ واپس چلے جائیں گے۔ اچھا ہم تمہارا وظیفہ مقرر کرتے ہیں ہر عرب کو کھانا ملے گا۔ اور تمہارے تمدن کو بھی داخل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ رستم نے سوال اسی بنا پر کیا تھا اور ہم سمجھتے ہیں۔ وہ ۹۰۔ ۹۵ فیصدی امید میں رہا ہوگا کہ جواب میں اس سے کہا جائے گا کہ ہم کو فقر و فاقے نے یہاں پہنچایا ہے کیا ظلم ہے کہ آپ لوگ ایک ایک لاکھ کی ٹوپیاں پہنیں اور ہم بھوکے رہیں۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب رستم شکست کھا کر بھاگا ہے تو اپنے ساتھ ایک ہزار باورچی ایک ہزار گویّے، ایک ہزار باز کے پالنے والے لے کر بھاگا تھا اور اس پر کہا تھا کیسے میرا گزارا ہوگا۔ اتنے تھوڑے آدمیوں سے ہمارا کام کیسے چلے گا۔؟

ساسانی حکومت پر بہت مستند اور پر از معلومات کتاب ہے جس کا پروفیسر اقبال نے ترجمہ کیا ہے اس کا مصنف نے اپنی کتاب میں حوالہ بھی دیا ہے۔ ہم تاریخی چیز سرسری طور پر پڑھتے چلے جاتے ہیں غور نہیں کرتے ربعی بن عامرؓ کا جواب۔ یہ تو بہت نمائندگی کرتا ہے، ایک داعی کے جواب کی، اور وہ امت مسلمہ کو بھی اس کا مقام بتلاتا ہے۔ انہوں نے کہا!

ما الذی جاء بکم قالو ما جاء بنا شیئٌ اللّٰہ ابتعثنا۔

(ہم کسی لالچ میں نہیں آئے ہیں ہم کو تو اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے اٹھایا ہے)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے سوچ کر آئے تھے: "اللہ بعثنا" نہیں کہا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عسکری تھے سعد بن ابی وقاصؓ نے اس کے لیے ووٹ نہیں لیا تھا اور نہ ہی کسی سے پوچھا تھا۔ اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی

عبادۃ اللہ وحدہٗ۔

ترجمہ:۔ ہم کو اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے اور اٹھایا ہے کہ جسے اسے منظور ہو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا تعالیٰ کی عبادت میں داخل کریں۔

خدا ان کی تربیت سامنے آتی ہم کیا نکال سکتے ہم کب اپنے ارادہ سے نکلے تھے فرمایا من شاء جس کو اللہ تعالیٰ چاہے من عبادۃ العباد یہاں عبادت اصنام (بت) ہو رہی تھی۔ عبادت مال و مادیت اور جنسی تقاضوں کی ہو رہی تھی۔ ہر بادشاہ معبود بنا بیٹھا تھا جب وہ رستم کے دربار میں گئے ہیں تو ان کو روکا گیا کہ تم اس طرح نہیں جاسکتے۔ گھوڑا یہاں چھوڑو۔ اور ادب کے ساتھ چلو۔ انھوں نے کہا نہیں، میں بلایا گیا ہوں خود نہیں آیا ہوں۔ اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو میں واپس جاتا ہوں۔ رستم نے کہا کہنے دو۔ اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الیٰ عبادۃ اللہ وحدہٗ، ومن ضیق الدنیا الیٰ سعتھا

ترجمہ:۔ ہم کو اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے اور اٹھایا ہے کہ جسے اسے منظور ہو کر بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا تعالیٰ کی عبادت میں داخل کریں، اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف نکالیں۔

یہ جملہ تو چونکا دینے والا ہے کہ آپ ضیق دنیا میں ہیں ہم آپ پر رحم کھا کر آئے ہیں یہ تو ایسا مکالمہ ہے کہ اس کو دنیا کی مختلف زبانوں میں تشریح کے ساتھ پیش کرنا چاہیئے۔ ایک ایک لفظ ایسا ہے جس کو کلام نبوت اور الہام خداوندی کہنا چاہیئے۔ وہ اگر کہتے ہیں کہ من ضیق الدنیا الیٰ سعۃ الآخرۃ، تو ذرا بھی تعجب نہ ہوتا۔ ہر مسلمان کا ایمان اس پر ہے کہ آخرت زیادہ وسیع ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم تم پر رحم کھا کر آئے ہیں کہ تم دنیا کے ایک پنجرے میں گرفتار ہو، تم ایک بلبل کی طرح ہو کہ جس کو پانی اور دانہ ڈال دیا جاتا ہے اور اس کو وہ کھا لیتا ہے، اس سے آگے وہ کچھ نہیں کر سکتا ایسا ہی آپ کا حال ہے کہ اگر غلام آپ کے سامنے نہ ہوں تو آپ بھوکے رہ جائیں، وہی پکاتے ہیں۔ وہی کھلاتے ہیں۔ جب آپ کھانا چاہیں

اور آپ کوئی جنبش نہیں کر سکتے ہم آپ کو اس تنگنائے اور اس پنجرے سے نکال کر دنیا کی
ہوا کھلانا چاہتے ہیں۔ اور آزاد بنانا چاہتے ہیں۔ جو مل گیا کھا لیا، جیسے مل گیا کھا لیا۔ جہاں
مل گیا کھا لیا، لیکن آپ اپنے غلاموں کے غلام ہیں۔ اپنے باورچیوں کے غلام ہیں۔ اپنے
محافظوں اور دستے کے غلام ہیں اور ان برتنوں اور ظروف کے غلام ہیں۔ تاریخ کا یہ واقعہ ہے
کہ جب کسریٰ نکلا راستے میں ان کو پیاس لگی کسی نے بتایا کہ یہاں پانی مل جائے گا۔ جب وہ وہاں
گیا تو جس برتن میں پانی لایا گیا اس کو دیکھ کر اس نے کہا کہ میں مر جاؤنگا تب بھی اس برتن میں
پانی نہیں پی سکتا" من عبادة العباد الی عبادة اللہ وحدہ۔ ومن ضیق الدنیا الی
سعتہا ومن جور الادیان الی عدل الاسلام"

ہم مذاہب کے ظلم و جور سے آپ کو نکال کر اسلام کے عدل کے سائے میں لانا چاہتے
ہیں۔ بہر حال یہ دعوت ہی اس امت کی قدر و قیمت ہے اس کے وجود کی اصل علت ہے
اللہ پاک نے اس کو باقی رکھا ہے اور اس کے سر چشمے قرآن کو بھی باقی رکھا ہے۔ سیرت نبوی
اور سنت دائمی عزائم اور داعیان اولین کی تاریخ بلکہ پوری تاریخ داعیوں سے بھری ہوئی ہے
تاریخ دعوت و عزیمت میں کہا گیا ہے کہ کوئی دور خالی نہیں رہا کہ وقت اور تقاضے کے مطابق
داعی نہ پیدا ہوا ہو۔ وقت پر فتنوں کا مقابلہ کرنے والا دنیا کے اسٹیج پر ظاہر نہ ہوا ہو۔ اس کی
مثال کسی غیر مذہب میں نہیں ملتی ہے۔ ہم نے دعوت و عزیمت میں غیروں کے بعض اعترافات
کو نقل کیا ہے شنکر آچاریہ سے پہلے صدیاں گذر گئیں، شنکر آچاریہ نے کیا اصلاح کا کام کیا
انہوں نے بت پرستی کی حمایت کی، اور عیسائیت کا حال تو یہ ہے کہ سینٹ پال، جو سترہ برس کے
بعد پیدا ہوا۔ اس نے تو عیسائیت کو دوسری پٹری پر ڈال دیا۔ بالکل ضلال پر، جس کے معنی
ہم اردو میں سمجھ نہیں پاتے ہیں۔ گمراہی یہ ہے مثلاً مشرق کی طرف جانا ہو اور مغرب کی طرف پلٹ
جائے [illegible] لین میں بھی سمجھنا چاہئے۔ اصل ضلال یہ ہے کہ راستہ اور رخ بدل جائے۔
مشرق کے بجائے مغرب کی طرف چلے اس کے لیے اس سنت کو باقی رکھا گیا ہے۔ اور قرآن مجید

اس کے ہاتھ میں دیا گیا ہے سیرت نبوی موجود ہے داعیوں کے واقعات و حالات موجود ہیں۔
کوئی بھی دور وقت کے مخلص داعی سے خالی نہیں رہا۔ اگر کوئی دعوٰی کے ساتھ کہے کہ اس امت
میں دس سال تک کوئی داعی نہیں پیدا ہوا تو یہ سراسر غلط ہے۔

اللہ تعالٰی ہر زمانہ اور ہر دور میں داعی پیدا کرتا رہا ہے ہم بہت خوش ہیں اور اللہ تعالٰی
کا شکر ادا کرتے ہیں اور درحقیقت ندوۃ العلماء کی بنیاد دعوت ہی پر پڑی ہے مدارس بہت
تھے لیکن اس عہد کے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس دین کی اہمیت اور ضرورت سمجھانے اور وقت کے فتنوں
کے مقابلہ کی صلاحیت پیدا کرنے والی چیز تقریباً مفقود اور ثانوی درجہ میں تھی ندوۃ العلماء کی
تحریک کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ عہد کے مطابق اور مزاج کے مطابق اس کی کمزوریاں اور
فتنوں کے مطابق اور چیلنجوں کے مطابق لوگ تیار کئے جائیں اللہ تعالٰی قبول فرمائے اور یہاں ایسے
داعی پیدا ہوں۔ ہم علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی "سیرت النبی" کو، اور سید صاحب
کے "خطبات مدراس" کو، مولانا شبلی کی کتاب "الفاروق" کو اور دارالمصنفین کے کام کو یہاں
تک کہ ندوۃ العلماء کے نصاب کو بھی دعوت کا جز سمجھتے ہیں جب ان کتابوں کا ذکر آگیا تو ہم عرض
کرتے ہیں کہ جب ہم نے یہ سوال اعلٰی تعلیم یافتہ لوگوں کے پاس بھیجا کہ آپ کی کن کتابیں کیا ہیں ان کو
لکھئے تو میاں بشیر احمد نے لکھا کہ جب میں آکسفورڈ میں پڑھتا تھا تو کئی بار مجھ پر الحاد کے حملے ہوئے
جب کبھی حملہ ہوتا تو "الفاروق" میرے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی تھی کہ جس کی یہ سیرت ہے وہ گمراہی
پر نہیں ہو سکتا یہ سلسلہ علمی کام جو کچھ ہوا ہے دارالمصنفین، ندوۃ العلماء یا اس سے استفادہ
کرنے والے کے ذریعہ یا شعبہ کے ذریعہ ہوا۔ اور ان سب کی قدر مشترک دعوت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

محمد قمر الدین صابری
مدیر شاداب

تخلیق اور اس کا مقصد: بنی آدم میں باہم حسن سلوک

سورۃ النساء کی پہلی آیت ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا (۱/۴)

اے لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطے سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار رہو قرابت والوں سے' بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا' پھر ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوّا کو نکالا۔ اسکے بعد ان دونوں سے تمام مرد اور عورتوں کو پیدا کیا اور دنیا میں پھیلایا تو حقیقت میں تمام آدمی ایک جان اور ایک شخص سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سب کو عدم سے وجود میں لانے والا اور سب کو باقی اور قائم رکھنے والا وہی ہے تو اس سے ڈرنا اور اس کی فرمانبرداری ضروری بلکہ ہے

اس سے دو مضمونوں کی طرف اشارہ ہوا اول یہ کہ اللہ تعالیٰ سب کا خالق اور

بھیجے۔ دوسرے یہ کہ تمام آدمیوں کے لیے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا فرمایا ایک ہی جان یعنی ابوالبشر آدم علیہ السلام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا اصلی تعلق اللہ سے ہے۔ اس کے بعد وہ تعلق اور قرب ہے جو افرادِ انسانی میں باہم پایا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اول تو ہمارے ذمہ خدا تعالیٰ کی اطاعت لازم ہونی چاہیئے کہ وہ ہمارا خالق ہے، اس کے بعد تمام مخلوقات میں خاص اپنے بنی نوع کی رعایت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ہم پر ضروری ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کے لیے مخلوق منہ اور سبب وجود ایک چیز کو مقرر فرمایا، تو جو قرب اور جو اتحاد افرادِ انسانی میں باہم موجود ہے وہ کسی دوسری چیز کے ساتھ حاصل نہیں، اسی وجہ سے شرعاً اور عقلاً آدمیوں میں باہم حسنِ سلوک ایسا ضروری ہے اور بدسلوکی اس قدر مذموم ہے جو اوروں کے ساتھ نہیں۔

خالق اور رب یعنی موجد اور مبقی ہونے کے علاوہ اللہ سے ڈرنے اور اس کی اطاعت کے وجوب کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ ہم اس کا واسطہ دے کر آپس میں ایک دوسرے سے اپنے حقوق اور فوائد طلب کرتے ہیں، آپس میں اس کی قسمیں دیتے ہیں اور ان پر اطمینان حاصل کرتے کرلتے ہیں یعنی اپنے باہمی معاملات اور حاجات میں بھی اسی کا ذریعہ پکڑتے ہیں، اس لئے اس کی اطاعت کا ضروری ہونا اور بھی محقق ہو گیا۔ اس کے بعد یہ حکم ہے کہ قرابت سے بھی ڈرو یعنی اہلِ قرابت کے حقوق ادا کرتے رہو۔ اور قطع رحم اور بدسلوکی سے بچو، بنی نوع یعنی تمام افرادِ انسانی کے ساتھ علی العموم سلوک کرنا تو آیت کے پہلے حصہ میں آ گیا۔ اہلِ قرابت کے ساتھ چونکہ قرب و اتحاد مخصوص اور بڑھا ہوا ہے، اسی لئے ان کی بدسلوکی سے اب خاص طور پر ڈرایا گیا۔ کیونکہ ان کے حقوق دیگر افرادِ انسانی سے بڑھے ہوتے ہیں۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ معدنِ وجود اور منشائے وجود کے اتحاد کے باعث تمام بنی آدم میں رعایتِ حقوق اور حسنِ سلوک ضروری ہے، اس کے بعد اگر کسی موقع میں کمی

موصیت کی وجہ سے اتحاد میں زیادتی ہو جائیگی جیسے اقارب میں یا کسی موقع میں شدتِ احتیاج پائی جائیگی جیسے یتامیٰ اور مساکین وغیرہ میں۔ تو وہاں رعایت حقوق میں بھی ترقی ہو جائیگی۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام احوال و اعمال سے واقف ہے۔ اس کے حکم کی متابعت کرو گے تو ثواب پاؤ گے ورنہ عذاب کے مستحق ہو گے۔ اور ارحام سے تعلقات، ان کے مراتب اور ہر ایک کے مناسب ان کے حقوق کو بھی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اسی لیے ہر ایک کے متعلق حکم کو حق سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی تاکید ہے۔ چنانچہ اس سورۃ النساء میں اکثر احکام بنی نوع آدم سے تعلق عام اور ارحام و یتامیٰ و مساکین وغیرہ سے تعلقاتِ خاص کے متعلق مذکور ہیں گویا پہلی آیت میں جو امرِ کلی بیان فرمایا گیا ہے۔ آگے سورۃ میں اسی کی تفصیل ہے۔ اور اس پر عمل کی تاکید ہے۔ ان پر عمل کر کے ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کریں گے اور اس دنیا اور آخرت دونوں جگہ کامرانی و کامیابی سے ہم کنار ہوں گے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ۔ ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

شیخ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہا را نماند قرار

بنی آدم ایک جوہر سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس لیے اعضا کی مانند ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، اگر کوئی عضو درد میں مبتلا ہو تو دوسرے اعضا کا قرار بھی جاتا رہتا ہے

مولانا محمد محب اللہ لاری ندوی۔ ایم اے علیگ
سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو

خطابت کی سحر کاریاں

شکسپیر کا ایک مشہور ڈرامہ (جولیس قیصر) ہے یہ افسانہ عقول عوام کی ایک دردناک داستان اور خطباء کی ہوس رانیوں اور فریب کاریوں کی ایک مکمل تصویر ہے۔ تمہیں اس قصہ میں نظر آئے گا کہ جس طرح کھلاڑی فٹبال کو اپنے حسب منشا اوپر پھینکتے نیچے گراتے اور ٹھوکریں دیتے ہیں ٹھیک اسی طرح عوام کے لیڈر، بڑے بڑے خطباء اور اچھے سے اچھے مقررین ان کے جذبات، ان کے خیالات اور ان کے احساسات سے کھیلتے ہیں کبھی اپنے قطرہائے اشک کے سیلاب میں انہیں ڈبکیاں دیتے ہیں تو کبھی اپنے برق صفت تبسم سے ان کے خرمن سکون و راحت کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں، کبھی اپنی پرجوش تقریروں سے قلب کو گرما اور روح کو تڑپا دیتے ہیں تو کبھی اپنی جادو بیانیوں سے ساری قوم کو اپنی ہوا و ہوس اور ذاتی اغراض و مقاصد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

بروٹس ایک ہمدرد قوم و ملک اور شریف و معزز رومی تھا اس نے شدت کے ساتھ محسوس کیا جولیس قیصر نے پوری رومی قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ ان کا شوق نفس قتل کے گھاٹ اتر چکی ہے۔ ابدی ذلت نے ان کے حواس و شعور پر قابو پالیا ہے ان میں اپنی زندگی کی تلخی کا احساس نہیں۔ چند سے یہی بیل و نہار رہا تو بحیثیت ایک معزز خود دار قوم کے ان کا

نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر
کہ اس مہلک مرض کا واحد علاج قیصر کا قتل ہے۔

قیصر، بروٹس کا نہایت ہی محبوب دوست تھا لیکن قوم و ملک کی خاطر
اپنی محبوب متاع کو اپنی ہی تلوار سے موت کے خوفناک گڑھے میں ڈھکیل دیا
رومی قوم قیصر کے قاتل سے انتقام لینے کے لیے بیتاب ہو گئی۔ لوگوں کا ایک
امنڈا اور بروٹس کو گھیر لیا۔

بروٹس اس غضبناک مجمع کے سامنے تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ یہ نہایت
موقع تھا سرفرازی و سربلندی کا تاج یا ذلت و رسوائی کا قعر بے پناہ بہادروں اور
کا درخشاں تمغہ یا خائن و غدار گروہ کا سا تاریک انجام یہ ظاہر ہے کہ تقریر کی
وعدم تاثیر پر موقوف تھا۔ مجمع غصے میں بھرا ہوا تھا کسی طرح تقریر سننے کے لیے تیار
زبان پر انتقام انتقام کی رٹ تھی۔ بارے بعض زعما کی کوششوں سے سکون کی فضا
اور بروٹس نے تقریر شروع کی۔

بروٹس کی تقریر:

بزرگان قوم کیا میں امید کروں کہ آپ حضرات میری بھلی یا بری، کڑوی
بکواس تھوڑی دیر کے لیے عدل و انصاف کی خاطر صبر و سکون کے ساتھ سنیں گے میں آپ کو
نہیں چاہتا اور نہ آپ کے جذبات و احساسات کی توہین کرنا اور آپ کے دلوں اور دماغ
کھیلنا چاہتا ہوں بلکہ آپ لوگوں سے میری پر زور درخواست ہے کہ واقعہ کا نہایت
غور و احتیاط کے ساتھ مطالعہ فرمائیے۔ میں آپ لوگوں کو کامل صداقت و خلوص سے
دیتا ہوں کہ قضیہ مابہ النزاع کا فیصلہ متانت و سنجیدگی اور سکون قلب و اطمینان خاطر کے
عدل و انصاف کی روشنی میں کیجیے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرا یہ اقدام مبنی برحق ہے اور
دامن پر کوئی ایسا داغ نہیں ہے جسے میں آپ لوگوں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کروں

برادران وطن! اگر آپ میں کوئی قیصر کا دوست یہاں موجود ہو اور وہ اس کے قتل پر اپنے جگر کے ٹکڑے کر رہا ہو تو مجھے معاف کرے اگر میں اس سے یہ کہوں کہ اے میرے معزز دوست! قیصر کے قاتل بروٹس کو قیصر تم سے زیادہ محبوب تھا۔ قیصر کی وقعت تمہارے دل میں اتنی نہیں جتنی اس کے دل میں تھی۔

اکابر طیب! میں تمام دنیا کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن آپ لوگوں کے سامنے کوئی جھوٹا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے اپنے محبوب دوست قیصر کو کسی ذاتی بغض و عناد کسی شخصی عداوت و دشمنی کی بنا پر قتل نہیں کیا ہے بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے قتل کیا ہے کہ روم مجھ کو اس سے کہیں زیادہ محبوب تھا۔

قیصر ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا اس لیے مجھے وہ محبوب تھا وہ شجاع اور بہادر تھا اس لیے اس کا احترام کرتا تھا لیکن وہ طامع و حریص تھا اس لیے میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ پس ایک ہی وقت میں نے اس پر آنسو بھی بہائے اور خنجر بھی چلایا۔

مجھے یقین نہیں کہ آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسے قیصر کی موت پر حقیقی اور واقعی رنج و غم اور افسوس و حسرت ہو آپ لوگ جانتے ہیں اور روم کبھی ذلت کے ساتھ زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔

آپ لوگوں میں وہ کون ایسا شخص ہے جو روم کہلایا جانا ناپسند نہیں کرتا، وہ کون ہے جو آزاد رہنا عیب سمجھتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے نفس و ضمیر کی توہین گوارا کرتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے وطن عزیز کی ذلت و حقارت کی اپنے اندر تاب رکھتا ہے۔ اگر آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہے تو بجا ہے وہی اس کا حقدار ہے کہ مجھ سے قیصر کے خون کا مطالبہ کرے کیوں کہ میں نے کسی شخص کے علاوہ کسی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا ہے۔

مجمع۔ نہیں ہم میں کوئی ایسا نہیں

بروٹس۔ تو پھر میں نے کسی کو اذیت نہیں دی۔ بروٹس نے مشکل ہی سے یہ جملہ ختم کیا تھا کہ قیصر کا

دوست اور طالبان انتقام کا سرکردہ انٹونیو مع اپنے رفقا کے قیصر کی لاش لیے ہوئے میں نوحہ و مرثیہ خوانی کے لیے پہنچا۔ بروٹس نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے یہ قیصر کی لاش ہے اور یہ انٹونیو قیصر کا دوست ہے یہاں پر یہ قیصر کے فضائل بیان کرنے کھڑا ہے آپ لوگ غور سے سنئے مگر اس فرق کو ذہن میں محفوظ رکھیے کہ گنہگار ہے اور نیک و پرہیزگار قیصر اور ہے گنہگار قیصر کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اسے تو آپ سن اب پرہیزگار قیصر کے متعلق جو کچھ کہا جائے۔ اب سنئے آخر میں ایک جملہ پر اپنی تقریر ختم کر عظمائے روم! جس تلوار سے میں نے روم کے لیے قیصر کو قتل کیا ہے وہ تلوار خاطر بروٹس کے قتل کے لیے بھی جب کبھی بھی روم چاہے ہمیشہ محفوظ رہے گی

تقریر کا اثر

مجمع۔ زندہ باد بروٹس

ایک۔ اس جاں نثار ملک و فداکار قوم کا ایک مجسمہ نصب کرنا چاہیئے۔

دوسرا۔ اس لائق فرزند وطن کو قیصر کے تاج تخت کا مالک بنا دیا جائے۔

تیسرا۔ قیصر فضل و کمال اور شرافت نفس میں اس کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔

چوتھا۔ قیصر ظالم و جفاکار تھا۔

پانچواں۔ اجی وہ سراپا جور و ستم اور ظلم و جفا تھا۔

چھٹا۔ اب روم کو اس ظالم و سفاک سے نجات ملی۔

ساتواں۔ کیا ہمیں انٹونیو کے ساتھ قیصر کے مرثیے میں شرکت کرنا چاہیئے۔

آٹھواں۔ ہاں ضرور کیونکہ بروٹس نے ہم کو حکم دیا ہے

بروٹس اب اسٹیج سے اتر پڑا اور مجمع پروانہ وار اس پر ٹوٹ پڑا۔ لوگوں نے اس کے قدموں پر لوٹ رہے تھے۔ اور آنکھیں اس کے لیے بچھی جاتی تھیں انٹونیو عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ غضبناک اور خشم آلود آنکھوں نے اس کو گھورا اگر بروٹس زندہ

اسے چشم زدن میں فرش زمین پر ڈھیر کر دیتا۔ انٹونیو نے اس غبار آلود فضا میں حسب ذیل معرکۃ الآرا تقریر شروع کی۔

انٹونیو کی تقریر

انٹونیو۔ اے رومیو!

ایک۔ خاموش، سنو، انٹونیو کیا کہتا ہے۔

دوسرا۔ نہیں، ہم نہیں سنیں گے۔ ہم اس کی بات نہیں سنیں گے۔

انٹونیو۔ پیارے بھائیو! سنو بروٹس کے حکم کی عزت کرو۔ بروٹس کی خاطر میری سنو۔

پہلا ایک: دیکھو سنو تو سہی کہ بروٹس کے متعلق یہ شخص کیا کہتا ہے۔

دوسرا: اماں۔ کچھ نہیں ہم اس کی بکواس نہیں سنیں گے۔

تیسرا۔ نہیں ہم لوگوں کو سننا چاہیئے، دیکھیں کیا کہتا ہے۔

انٹونیو۔ دوستو! میں قیصر کا مرثیہ پڑھنے نہیں بلکہ اس کی نعش کو دفن کرنے اور اس کے مردہ جسم کو سپرد خاک کرنے کیلئے آیا ہوں۔

ہر شخص اپنی زندگی میں اچھے اور برے کردار کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے اعمال حسنہ تو اس کی موت کے ساتھ مٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے افعال سیئہ قیامت تک باقی رہتے ہیں قیصر بھی انسان تھا اس کے بھی حسنات و سیئات کا یہی حشر ہونا تھا۔ اور ہوا۔

برادران قوم! اگر بروٹس مجھے اسٹیج پر آنے اور کچھ عرض کرنے کا حکم نہ دیتا تو اس وقت میں ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہ نکالتا، اس نے مجھ کو حکم دیا، میں نے اس کی اطاعت کی اور اس کے فرمان والاشان کے سامنے سر تسلیم و انقیاد خم کر دیا کیوں؟ اس لیے کہ وہ ایک شریف و لائق عزت شخص ہے۔

[illegible]

میں اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا کیوں کہ وہ ایک سچا آدمی ہے جھوٹ نہیں بولتا
بہرحال گو یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ قیصر قناعت پسند اور بے طمع آدمی تھا۔ کیوں کہ تم
نے ان کے خلاف اعلان کیا ہے میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یہی وہ لالچی
جس نے قیدی دشمنوں سے اتنا کثیر زر فدیہ وصول کیا کہ روم کا خزانہ گرد و جواہر سے بلو
اور ملک دولت و ثروت کی اس بارش سے سرسبز و شاداب ہو گیا۔ میں تو صرف ا
جھلک کر میری ان آنکھوں نے قیصر کو غربا کے فقر و فاقے ... اکثر آنسو بہاتے، گریہ و بکا ک
بہر صورت نالہ و فغاں کرتے دیکھا ہے کہ کتنی ہی ایسی راتیں ہیں جنہیں قیصر نے تنگدستوں ک
حال اور ذرائع معاش کی فکر میں آنکھوں میں کاٹ ڈالا ہے۔

میں نے خود کئی دفعہ "لوپرکال" میں تاج و تخت قیصر کی خدمت میں پیش کیا م
اس نے ہمیشہ اس سے اعراض و انکار کیا۔ اس کو تاج کا شوق نہیں تھا وہ تو خدمت
کا بھوکا تھا۔ اس کو عیش و آرام سے الفت نہیں تھی اس کو تو قوم کی خوشحالی کی خا
و مصائب کے برداشت کرنے میں لطف آتا ہے۔

بروٹس ایک نہایت ہی معزز شخص ہے میں کسی حال میں بھی اس کی مخالفت
کرسکتا ورنہ میں تم سے دریافت کرتا کہ کیا حرص و آز کا مسکن ایسا ہی قلب ہو سکتا؟
ایسے پاکیزہ دل میں کیا ایسے خدا ترس قلب میں طمع اور لالچ کے لیے کوئی گوشہ
سے بھی مل سکتا ہے۔

رومیو! آج سے پہلے قیصر تمہیں دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا تم اس
اس کی خاطر اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ پھر آج تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ ا
قطرہ بھی تمہاری آنکھوں سے نہیں گرتا۔

اگر تم اس عمدہ صفات بہتر خصائل اور لائق تعریف شمائل پر نہیں روتے
لیکن کم از کم اس کے لیے تو روؤ کہ وہ تم کو محبوب تھا تم کو پیارا تھا دنیا جہاں میں سب

تمہارا چہیتا تھا، تم اس لیے روؤ کہ کل ہی وہ شخص تھا جس کی ایک جنبش لب پر بڑے بڑے بہادروں اور سورماؤں کے دل دہل جاتے تھے جس طرح بجلی کی ایک کڑک سے اس سرے سے لیکر اس سرے تک زمین و آسمان کی ساری فضا لرز جاتی ہے۔ لیکن آج وہی شخص ہے جو ایک دیوار کے کنارے ذلیل و خوار بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے، نہ اس کا کوئی نوحہ خواں ہے نہ غمخوار۔ آہ آج اس پر کوئی رونے والا نہیں۔

اے عقل انسانی! آج یہ تجھ کو کیا ہو گیا ہے؟ تو کیوں انسانوں کے دلوں سے نکل کر وحشی جانوروں کے سینوں میں سما گئی ہے۔ تو نے اپنا راستہ کیوں کھو دیا؟ تو کیوں گم کردہ راہ ہو گئی۔ تو بہوت ہو کر رہ گئی ہے تو نے خیر کو شر اور شر کو خیر قرار دے لیا ہے کیا تجھ سے قوت تمیز چھین گئی؟ کیا تجھے اب صواب و خطا کھوٹے کھرے میں تمیز نہیں رہی؟ کیا جرائم و محاسن کی پہچان سے تو عاجز ہو گئی؟

رومیو! میری ژولیدہ بیانی و پریشان گوئی سے اگر تم کو تکلیف ہوتی ہو تو معاف کرنا کہ اس فاجعہ عظمیٰ و حادثہ کبریٰ نے میرے دماغ کو منتشر اور قلب کو پراگندہ کر دیا ہے۔

دوستو! میرے پہلو میں ایک ایسا دل ہے۔ جو تمہاری محبت و الفت کا سرشار تمہاری خیر اندیشی و نکو کوشی میں غرق تمہاری فلاح و بہبود کے لیے بےچین اور تمہاری آرام و آسائش کے لیے بیتاب ہے۔ اگر مجھے قدرت ہوتا کہ تمہارے سینے شدت رنج و غم و کثرت حزن و الم سے پھٹ جائیں گے تو میں کہتا قیصر مطلوب ہے وہ بلا قصور قتل کر دیا گیا۔

بروٹس اور اس کے رفقاء کار فخر قوم اور ملک کے مایۂ ناز فرزند ہیں ان کو مجرم و خطا کار کہنے سے پہلے میرے قیصر کو، روم کو، اور خود قیصر کی پاک روح کو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔

اتنا کہہ کر انٹونیو خاموش ہو گیا اور اس کی چشمہائے پرنم سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا۔

ایک (اپنے ہم نشین کی طرف مخاطب ہو کر) مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ شخص نہایت ہی معقول بات کر رہا ہے۔

دوسرا۔ یقیناً، اگر تم ذرا غور کرو تو تم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ قیصر کا قتل سفاکی و بے رحمی کا بدترین نمونہ اور انتہائی بزدلانہ جرم ہے۔

تیسرا۔ قیصر کے تاج و تخت سے استغنا نے تو میرے دل کو اپنا لیا۔ اس کا یہ فعل کتنا مستحسن اور کس قدر مبارک ہے۔

چوتھا۔ وہ کیسا نرم دل، رقیق القلب اور رحم دل تھا کہ مصیبت زدوں اور فاقہ کشوں کی حالت زار پر رنج و غم کے آنسو بہاتا اور جگر کے ٹکڑے کرتا تھا۔

پانچواں۔ فقیروں اور آفت رسیدوں کا ایسا مونس و غمخوار ایسا ہمدرد اور غمگسار ظالم و طامع نہیں ہو سکتا۔

چھٹا۔ اب تو جناب قیصر کی خونریزی نے بڑی اہم نازک صورت حال اختیار کر لی۔

ساتواں۔ قاتل سے ضرور انتقام لینا چاہیئے۔

آٹھواں۔ (اپنے ہم جلیس کی طرف مخاطب ہو کر)
دیکھو انٹونیو کس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا اور نوحہ کر رہا ہے۔

نواں:۔ روم میں انٹونیو سے بڑھ کر ملک کا کوئی سچا بہی خواہ نہیں۔

انٹونیو۔ کیا آپ لوگ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ تھوڑی دیر کے لیے میں یہاں سے ہٹ کر جاؤں اور اس بیکس و مظلوم میت پر نذر عقیدت کے چند پھول چڑھاؤں۔

مجمع۔ ضرور۔ ضرور

انٹونیو اسٹیج سے اتر آیا اور آہستہ آہستہ قیصر کی لاش کے پاس گیا۔ لاش اب تک انہی کپڑوں میں لپٹی پڑی ہوئی تھی جس میں کہ وہ قتل کی گئی تھی۔ اور خنجر کے زخم لباس کے اندر سے نظر آ رہے تھے۔ انٹونیو نے مجمع کو پکار کر کہا۔

ٹونیو۔ لوگو! یہی وہ قیصر ہے جس کے ابر کرم کی بارش سے تم بارہا سیراب ہو چکے ہو۔
س کی لاش زخم وخون میں شرابور ہے آؤ اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے اس کو غسل دو۔
ر کی لاش کا رواں رواں نہایت بے کسی و عاجزی کے ساتھ تم سے اس کا مطالبہ کر رہا ہے۔
تم سب لوگ اس لباس کو دیکھتے ہو مگر شاید اس کی تاریخ و اہمیت سے واقف نہیں
۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ یہ خون میں لتھڑا ہوا لباس قیصر نے اس شام کو زیب تن کیا
جس شام کو قیصر نے وہ شاندار فتحیابی حاصل کی تھی جس پر روم قیامت تک فخر کرے گا۔
اس موقع پر انٹونیو نے قیصر کی عبا کے ایک شگاف کو نمایاں کیا اور کہا:
اسی بڑے سوراخ سے اس فاتح اعظم کے جسم کو چھلنی کیا گیا اسی سوراخ سے ہو کر بروٹس
خنجر قیصر کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اسی سوراخ سے قیصر کا بے گناہ خون بہایا گیا۔
زخموں نے خنجر کے اس بہاتے ہوئے بھروکے سے اپنے قاتل کی خوفناک صورت کو رحم
اب نگاہوں سے دیکھا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ قیصر نے بروٹس سے طلب رحم کرنے سے پہلے روم
ہر ہر فرد کو دادرسی کے لیے آواز دی مگر افسوس صد افسوس کہ کسی نے بھی اس کی دادرسی نہیں کی
ر وہ بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔
قیصر نے پہچان لیا کہ میرا قاتل میرا دوست ہے جس کی گردن اس وقت بھی میری عنایتوں
و نوازشوں میری کرم فرمائیوں اور مہربانیوں کے بارگراں سے جھکی ہوئی ہے۔
اس خلاف توقع کمینگی و غداری سے اس کی ہمت ٹوٹ گئی مقابلے کی جرأت نہ رہی
س جانگداز واقعے نے جتنا کاری اثر اس کے دل پر کیا وہ کسی حیثیت سے اس زخم سے کم نہ
س لاشے کو ماہی بے آب بنا رہا تھا کم نہ تھا۔ تیغ و خنجر تیر و سنان کا خوفناک منظر اس کے لئے
اتنا لمبا تک اور ڈراؤنا نہ تھا جتنی کہ خیانت غداری اور بے وفائی کی کہ وہ اور نفرت انگیز
صورت اسی لیے قیصر کے لبوں پر مہر لگ گئی اور وہ صرف آتنا الوداعی مختصر جملہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے
بیٹھ۔ بروٹس

اور تو بھی اسے بروٹس؟

قیصر مجسمہ "پامپی" کے نیچے مقتول پایا گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے چہرہ کو اپنی
آستین سے چھپا لیا تھا تاکہ اس کی دروغ ناشکر گذاری، احسان فراموشی اور کفران نعمت کے
یہ دلدوز منظر مجسمہ کے دیکھنے سے وہ زیادہ متحمل رنجیدہ و غمگین نہ ہو۔

قیصر کی موت کے غم میں زمین و آسمان تاریک ہو گئے ہیں، شجر و حجر، بشر بھی اپنے
تحت ہاتھ سے جگر اپنی آنکھوں کی راہ سے بہا رہے ہیں مگر مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ تمہارا
دل نہایت ہی غمگین ہیں اور تمہاری آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ گئی ہے۔ میں تم کو مبارک
دیتا ہوں کہ تم اپنے سیلاب اشک سے صفا کار خونریزی جیسے رساد قتل و غارت کی وہ خونی
علامات و نشانی بہا لے گئے جس سے ظالموں کے ہاتھوں نے اس زمین کو ملوث کر دیا تھا
قیصر کی دریدہ عبا دیکھ کر زار و قطار رو رہے ہو، اگر تم اس کی نعش کے ٹکڑے اور جسم کے تکا
دیکھو تو تمہارا کیا حال ہو۔

انٹونیو لاش کے قریب آیا اور اس پر سے چادر ہٹا کر مجمع سے یوں مخاطب ہوا۔

ہر ہر زخم اپنی زبان حال سے تم سے دادرسی و انصاف کا طالب ہے، خود سے سنو کر مرثیہ میں
سے زیادہ گویائی کی قوت نہیں، مرثیے کے جگر پاش و دلگداز واقعہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ
سننے میں نہیں آسکتا۔

ایک شخص۔ کیا ہی قیامت آفریں منظر ہے

دوسرا۔ اے لوگو! قیصر پر ظلم ہوا اس کے ساتھ انصاف کرو۔

تیسرا۔ قیصر کا قتل نہایت ہی شر انگیز فعل تھا جس کی چنگاریوں نے روم کی شاندار
روایتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا

چوتھا۔ یہ دنائت اور غداری روم کے چہرے پر انتہائی بدنما داغ ہے۔

پانچواں۔ اس خیانت اور غداری نے روم کو دنیا والوں کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا

چوتھا۔ انتقام۔ انتقام

مجمع (سخت اشتعال میں) قاتلوں کو جلا ڈالو، انکے جسم کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں بکھیر دو، کسی ایک پر بھی ترس نہ کھاؤ یہ رحم کے قابل نہیں

انٹونیو۔ ٹھہرو، ٹھہرو، میں تمہارے اشتعال سے ناجائز فائدہ اٹھاکر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنا نہیں چاہتا کہ قاتلوں سے خون کا مطالبہ کرکے وطن کی فضا کو تیرہ و تاریک بنادوں۔ مجھے ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ یہ قوم کے بہی خواہ، ملک کے ہمدرد اور ملک کے معزز افراد ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قیصر کے قتل کے ان کے نزدیک وہ معقول وجوہ موجود ہوں جن کو ہم نہ جانتے ہوں میرا مطلب تو اس وقت صرف یہ ہے کہ قیصر تم کو دل وجان سے پیار کرتا تھا، اس لیے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ تم اس کا مرثیہ بیان کرو، مجلس عزا جماؤ اور اس پر نوحہ کرو۔ اگر مجھکو تمہارے ہاتھ سے عنان صبر کے چھوٹ جانے، تمہارے بے قابو ہونے کا خوف نہ ہوتا اور مجھ کو ڈر نہ ہوتا کہ تمہارے قلوب بحر الم میں اور رنج و محن میں ڈوب جائیں گے تو میں تمہیں اس فقید عصر کی وصیت سناتا۔ پھر تمہیں معلوم ہوتا کہ تم قیصر کو کتنے زیادہ محبوب تھے، وہ تمہارا کتنا جاں نثار غمخوار کارساز سردار تھا اور وہ ہرگز اس لائق نہ تھا کہ وہ تمہارے سامنے اس بیدردی سے قتل کر دیا جائے درانحالیکہ تمہاری آنکھیں دیکھتی ہوں اور تمہاری رگوں میں خون کا گردش و دوانوش ہو

مجمع۔ وصیت ضرور سنائیے۔

انٹونیو۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہارے سینے اس شہید اعظم کے قتل پر شدت حزن و الم سے شق نہ ہوجائیں

مجمع۔ نہیں ہم وصیت ضرور سنیں گے۔

انٹونیو۔ قیصر نے وصیت کی ہے کہ رومی کے ہر ہر فرد کو میرے خزانۂ خاص سے ۷۵ فرنک دیئے جائیں۔ اور تمام رومی قوم کے لیے میرے تمام باغات اور تفریح گاہیں وقف ہیں۔

ایک شخص۔ قیصر کیا ہی فیاض طبع و غریب پرور آدمی تھا۔

دوسرا۔ کیا ہی شریف و کریم تھا۔

تیسرا - قاتل تباہ و برباد ہیں۔

چوتھا - انتقام! انتقام!

پانچواں - ہم برولس کا گھر جلا کر رہیں گے۔

اس کے بعد طوفانی مجمع سڑکوں پر لہریں مارتا ہوا نظر آنے لگا ٹھیک اسی طرح جس طرح زخار سمندر میں موجیں بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

انٹونیو - (تنہا اپنی جگہ پر) اے مادر یکستر! اے بھیانک فتنہ! میں نے ہی تجھ کو تیری خوابگاہ سے اٹھایا ہے بس تو جا اور اپنا کام کر۔ تو مشتعل ہو جا اور سقف آسمان اور فرش زمین کو جلا کر خاک سیاہ کر دے۔

دیکھیے کس قدر عبرت ناک منظر ہے کہ رومی قوم نے اگما قیصر کی غلامی سے پورے طور پر نجات بھی نہیں پائی تھی کہ انٹونیو نے اپنے دام عبودیت میں ان کو جکڑ دیا جاہل و غلام ملک کی یہی حالت ہوتی ہے یا تو وہ صاحب تاج و تخت کے زیر نگیں ہوتا ہے یا کسی جادو بیان خطیب کے دام سحر کا شکار۔ (ترجمہ) (تعمیر حیات ۲۵/۵/۹۵ سے شکریہ کے ساتھ)

سلسلہ ص ۲۱
کرنی چاہیے اور فقیہ معلم کو بے پرواہی اور غفلت سے علاج کی وبس۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

علامہ اقبال

سلسلہ ص ۵۰
تکمیل کے مرحلہ پر ہے تعمیراتی رقبہ کی موجودہ بڑھتی ہوئی طلب کے پیش نظر معیاری ڈیزائن کے کارخانوں کے مزید ۱۲ یونٹس کی تیاری کا کام جاری ہے اور سال ۹۶-۱۹۹۵ء کیلئے مزید ایک معیاری ڈیزائن والے کارخانوں کے بلاک کی تیاری کی تجویز رکھی گئی ہے۔

غلام محمد کیفی شاہ نظامی

گلدستۂ رموز و حقائق

مرضیِ حق پر خوشی سے جب جھکا دیتا ہوں سر
کُند ہے پھر تو قضا کی تیز گو تلوار ہے

مطلب :- شاعر کہتا ہے کہ جب خوشی سے خدا کی مرضی پر سر جھکا دیتا ہوں تو شمشیرِ قضا کند ہو جاتی ہے اور اس کی گردن کو کچھ صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ یعنی اس شعر میں تسلیم و رضا کا مقام اور اس کا فائدہ بیان کیا گیا ہے۔

تصوف میں تسلیم و رضا سے بڑھ کر کوئی اور مقام نہیں جو اولیاء اللہ اس درجہ پر پہنچے ہیں، وہ خدا کی بہت بڑی قربت اور نزدیکی میں ہوتے ہیں۔ انہی لوگوں کو خدا نے قرآن پاک میں جابجا صابرین کے نام سے مخاطب فرمایا ہے۔ اور انہیں لوگوں کی بڑی تعریفیں آئی ہیں۔ اور مرنے کے بعد ان سے بڑے بڑے وعدے فرمائے گئے ہیں۔

تسلیم و رضا کے معنی دوست کی مرضی پر راضی ہو جانا اور اپنی خواہش کو اس کے اوپر قربان کر دینا ہے۔ مثلاً خدا کسی پر کوئی بلا نازل کرے تو چاہیئے کہ آدمی اس بلا کو خدا کی طرف سے سمجھے اور کسی آدمی یا چیز کی طرف اس بلا کو منسوب نہ کرے گو بظاہر اس کا نازل کرنے
[illegible]

آیا کرتی ہیں۔ اگر کسی آفت کو کسی شئے کی طرف نسبت کرے گا اور اس بلا کے لانے والے کو کوئی آدمی خیال کرے گا تو یہ شرک خفی ہوجائے گا اور شرک خدا کو بہت ہی ناپسند ہے مگر جب وہ آفت اور بلا کو خدا کی طرف منسوب کرے گا اور اس کی مرضی پر صبر اختیار کرے تو اس وقت وہ خدا کی پناہ میں آجائے گا۔ قاتل یا تلوار اس پر اثر نہ کرسکے گی۔ مثلاً اگر کوئی شخص جس کے مارنے کے لیے لوگ آئے ہوں، کسی بادشاہ کی پناہ میں آجائے تو قاتلین کا اس پر کوئی قابو نہ چل سکے گا۔ یہ جان لینا چاہیئے کہ تلوار بھی وہی ہے اور قاتل و مقتول بھی وہی ہے صرف خیال اور نظر ہی کا دھوکہ ہے جس سے آدمی مارا جاتا ہے

جب خود بلائیں بھی وہی ہے۔ یعنی وہ خود آفتوں اور بلاؤں کی صورت اختیار کر آیا ہے اور جس پر وہ بلائیں نازل ہوتی ہیں وہ بھی وہی ہے اور اُن سے بچانے والا اور پھر مانے والا بھی وہی ہے تو جو شخص اس حقیقت کو سمجھے گا اس پر کوئی بلا اثر ہی نہیں کرسکے اور تمام آفتوں اور بلاؤں کو بھی وہ کھیل تماشہ اور دلچسپی کی باتیں سمجھے گا۔

جب کوئی کسی پر عاشق ہوتا ہے معشوق کے جور و ظلم اور مار پیٹ بھی اس کو بھلے معلوم ہوتے ہیں اور ان میں بھی اس کو وہ لذت آتی ہے جو دوسروں کے پیار و محبت میں نہیں حاصل ہوتی۔ جو لوگ عاشق ہیں انہیں کے دل جانتے ہیں کہ معشوق کی طرف سے پہنچائی جانے والی ہر ایک تکلیف ان کے لیے باعث راحت ہوتی ہے۔ اب بتائیے کہ جو کوئی خدا کا عاشق ہوگا یعنی اس کو دیکھتا رہے گا اسی سے محبت رکھے گا، اسی کا خیال ہر وقت دل میں جماتا رہے گا اس پر اوّل تو بلا ہی نہیں آئے گی اور جن کو لوگ بلائیں سمجھتے ہیں وہ اس کے لیے راحتیں ہیں۔ اس لیے قرآن شریف میں فرمایا گیا۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

یعنی "خدا کے دوستوں کو تو کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم" یعنی اہلِ توحید

صرف اسی خیال سے یہ محنتیں اور جانکا یہاں برداشت کرتے ہیں کہ وہ خوف اور رنج سے محفوظ رہیں۔ مگر جس قدر وہ اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے جاتے ہیں اسی قدر مزید رنج و غم میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں اور سچی خوشی اطمینان دلی اور راحت و آرام دل ان سے اسی قدر دور ہوجاتا ہے تو اب معلوم ہوا کہ خدا کی مرضی پر راضی رہنے اور بلاؤں میں صبر و شکر کرنے سے انسان کو راحت قلب میسر آتا ہے۔ جو کسی دولت، مرتبہ اور کسی عزت سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

الغرض معلوم یہ ہوا کہ بلاؤں کے دفع کرنے کا یقینی علاج یہ ہے کہ آدمی ان پر صبر کرے اور برائے نام لوگوں پر ظاہر کرنے کے لیے جس طرح طبیعت بے پرواہی سے علاج کی طرف رجوع رہے۔ مگر دل میں خدا ہی کی مرضی کو مقدم سمجھے اور اپنی دلی خواہش کو کہ وہ بلا دور ہو جائے ترک کرے کیوں کہ تقدیر اور قضا و قدر کا مقابلہ کرنے سے آدمی آفتوں اور بلاؤں سے چھوٹنا بھی پسند نہیں کرتے اور اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے حوالے کر دیتے ہیں یہاں تک کہ خدا فوراً بلا کو ان سے دور کر دیتا ہے یا اس بلا ہی کو ان کے لیے راحت و آرام کا سبب بنا دیتا ہے وبس ؏

خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را!

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اس شعر کی نثر عبارت یہ ہے کہ جسکو ہم شہود سمجھتے ہیں وہ غیب ہی غیب ہے جو لوگ خواب میں جاگے ہیں وہ خود خواب میں ہیں؟

خلاصہ مطلب یہ کہ حضرت حق باعتبار اپنی ذات کے ہمیشہ غائب ہیں اور باعتبار صفات یا لباس کے ظاہر ہیں۔ غیب کے لغوی معنی نظر سے پوشیدگی کے ہیں اور شہود کے

اور دوسری تشبیہ یا ایک غیب اور ایک شہود۔ دیکھو روح جس کا تمہیں یقین ہے
تمہاری نظر کے سامنے نہیں آسکتی مگر تم اپنے بدن کو ان ظاہری آنکھوں سے دیکھ
سکتے ہو روح عالم غیب میں ہے اور جسم عالم شہود میں یعنی روح غائب ہے اور جسم
دوسری مثال یہ ہے کہ پہلی دفعہ تمہارے دل میں جو خیال آتا ہے وہ تم
باطنی آنکھ سے بھی غائب ہوتا ہے مگر پھر وہی خیال ایک ہلکا جسم اختیار کر کے
تمہارے دل کی آنکھ کے سامنے آتا ہے۔ اور پھر عالم خارج میں وہی خیال جسم کے
ساتھ آتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ تمہیں مکان بنانے کا خیال آتا ہے اس وقت
یہ صرف خیال ہی خیال ہے۔ اس کی کوئی صورت شکل تمہارے دل میں قائم نہیں ہوئی
اس وقت یہ خیال عالم غیب میں ہے یعنی تم کو خیال کا تو یقین ہے کہ میرے دل میں
ایسا خیال گذرا مگر اس کی صورت تمہارے دل میں متعین نہیں ہوئی اب تم نے اس
مکان کے بنانے کے خیال پر زیادہ زور دیا اور دل میں سوچا کہ مکان کس نمونے کا ہو۔
اس وقت دل میں اس مکان کا پورا نقشہ تیار ہوا اور تم دل کی آنکھ سے اس کی
صورت اور دیوار و در دیکھنے لگیں گے۔ جب یہ صورت تمہارے ذہن میں قائم ہوئی
وہ خیال اب عالم مثال میں اتر کر آگیا اور ایک ہلکا سا وجود اس نے حاصل کر لیا
بعد از اں تم نے اس کا ذہنی وجود یعنی مکان کا نقشہ کھینچا اور جیسی صورت اس مکان کی
تمہارے دل میں قائم ہوئی تھی اس کو ہو بہو تم نے کاغذ پر اتار لیا اور وہی خیال عالم
سے ترقی کرتے ہوئے عالم خارج یعنی شہود میں پہنچ گیا۔ اور نقشہ کے مطابق عمارت
ہوگی۔ جس کو ہر کوئی دیکھ سکتا ہے اور تم اس گھر میں رہتے ہو۔ اور وہ مکان کبھی گرتا ہے
پھر تعمیر ہو جاتا ہے۔ کبھی بالکل فنا ہو جاتا ہے۔ اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا
مکان کی تصویر تمہارے دل میں ہمیشہ قائم رہتی ہے اور جب تم اس کو دیکھنا چاہتے ہو

ر خارجی مکان تھوڑی مدت میں گر کر فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے آدمی مر جاتا ہے۔ مگر
ہ عالم مثال اور عالم خیال میں بدستور موجود رہتا ہے۔ جس طرح تمہارے اکثر و بیشتر رشتہ دار
مر چکے ان کے جسم فنا ہو گئے۔ قبروں میں سوائے مٹی کے کچھ باقی نہیں رہا مگر تمہارے دل میں
ہ بدستور سابق موجود ہیں تم انہیں ذرا دل میں غور کرو تو ان کی تصویر یعنی ان کی مثالی شکلیں تمہارے
سامنے آجاتی ہیں کیونکہ اب ان کے جسم کثیف نہیں رہے۔ اس لیے وہ تمہیں ان ظاہری آنکھوں
دکھائی نہیں دیتے مگر وہ سب عالم مثال اور عالم ارواح میں بدستور سابق موجود ہیں۔ اس
ح اب تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ روح یعنی ذات واحد ہمیشہ غائب رہتی ہے مگر اس کا جسم
رنگ خواہ لطیف ہو یا کثیف نظر آسکتا ہے مگر بغیر کسی جسم کے روح غائب ہی رہتی ہے
شاعر کہتا ہے کہ جن چیزوں کو ہم حاضر اور ظاہر سمجھتے ہیں وہ بھی در اصل غائب
ہیں۔ دیکھو خواب میں انسان اس بات کا یقین کرتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں۔
وہ اصلی ہے۔ مگر جب نیند سے چونکتا ہے تو وہ سب شکلیں غائب ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح
زندگی میں ان ظاہری آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے ہزاروں شکلیں بعد غائب ہو رہی ہیں۔
اس لیے یہ دنیا اور یہ زندگی بھی ایک طرح کا خواب ہے ایک گھنٹہ پہلے جو آبادی حیدرآباد
میں تھی وہ ایک گھنٹہ کے بعد بالکل غائب ہو گئی گویا کہ وہ اگلی آبادی اب خواب و خیال ہے
اسی طرح سے اگر ہم اپنی زندگی کی حالتوں پر نظر ڈالیں تو ہم کو معلوم ہو گا کہ ہمارے اوپر
کیا کیا حالتیں آئیں اور کن کن لوگوں سے ہم کو سابقہ رہا اور اب کہاں ہیں۔ گویا خود کہا ہے
تھے ہی نہیں اور جو کچھ اس میں دیکھا تھا اور آئندہ جو کچھ دیکھیں گے یا اب جو کچھ
دیکھ رہے ہیں وہ بھی خواب کی طرح سے غائب ہو جائے گا۔

غرض کہ اسی طرح ہم ہر ایک عالم میں مقام کرتے ہیں۔ اور وہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر
دوسرے عالم میں جاتے ہیں۔ اور اسی طرح سے خدا جانے کب سے اور کب تک لا تعداد
عالموں میں ہوتے چلے جائیں گے۔ پیدا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایک عالم سے دوسرے عالم

یں آئے یعنی ہم اس مادی دنیا میں کسی اور عالم سے آتے ہیں اور مرنے سے یہ عزم
ہم یہاں سے روانہ ہوئے اور کسی عالم میں پیدا ہونگے۔ غرض کبھی ذات مطلق مجرد یعنی بے
پیکر دکھائی نہیں دیتی۔ مگر مختلف جسموں اور لباسوں کے ساتھ نظر آتی ہے اور ہر آن
اس دنیا میں اور دوسرے عالموں میں بدلتی رہتی ہے اور مختلف عالموں میں سیر کرتی
اس بات کو یقینی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے مگر کبھی ہم اس پر غور نہیں کرتے۔
دیکھو پانی ایک شے ہے مگر وہ ہمارے سامنے کتنی حالتیں بدلتا رہتا ہے
کو خوب گرم کیا جائے تو وہ دھواں (بھاپ) کی حالت میں آکر اوپر چڑھتا ہے ا
خیف آگ دیجاتی ہے۔ تو غائب ہو جاتا ہے یعنی دھواں کی حالت میں جو ظاہر
دکھائی نہیں دیتا آ جاتا ہے۔ اور نظروں سے غائب ہو جاتا ہے مگر وہ اس عالم میں
موجود رہتا ہے اور جب سردی آتی ہے تو وہی نامحسوس دھواں ابر کی صورت اختیار
اس وقت آسمان میں اولی کے گالے سے اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں پھر زیادہ
ہے۔ ابر پانی بن جاتا ہے اور پگھل کر قطروں کی شکل میں زمین پر آتا ہے جس کو
کہتے ہیں پھر اس پانی کو خوب سردی اور دباؤ دیا جاتا ہے تو وہ یخ یعنی برف اور
شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہی رقیق پانی ٹھوس ہو کر برف کی صورت میں ہمارے
آتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہی پانی ایک شے ہے مگر کبھی تو وہ رقیق ہوتا ہے اور کبھی
اور کبھی ہوا کی صورت اختیار کرتا ہے۔ گویا ایک ہی شے مختلف حالتوں میں گردش کرتی
اور طرح طرح کے لباس بدلتی ہے کبھی جسم کثیف کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوتی ہے۔
لطیف جسم کے ساتھ عالم آخرت میں جاتی ہے۔ غرضیکہ انسان ابدی اور ازلی ہے
ہم کو یقین کرنا چاہیے کہ ہم کبھی نہیں مریں گے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور مختلف
سیر کرتے رہیں گے جو لوگ موت کو نہیں سمجھتے وہ اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں مگر
اس کو دوسری حیات (زندگی) جانتے ہیں۔ یعنی شاعر کی زبان میں یوں سمجھو

موت کو سمجھا ہے غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

صحبت صاحبدلاں اکسیر قلب عیب ہاست
ہرچہ در شاہان تکبر در فقیران کبریاست

ترجمہ :۔ صاحب دلوں کی صحبت کیمیا ہے۔ جو عیب کو ہنر سے بدل دیتی ہے۔ جو بات بادشاہوں میں تکبر اور غرور خیال کی جاتی ہے وہی بات فقیروں میں شان کبریائی ہوتی ہے۔

اس شعر کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ صاحب دل اشخاص کی صحبت اکسیر کا حکم رکھتی ہے اور وہ عیبوں کو فضائل کے ساتھ مبدل کر دیتی ہے اس دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ بادشاہوں کو مغرور متکبر کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں سے بے پرواہی رکھتے ہیں اور کسی سے مخاطب نہیں ہوتے۔ مگر یہی باتیں فقیروں میں خداوند تعالیٰ کی شان کبریائی سمجھی جاتی ہیں۔ چونکہ بادشاہ میں نفس کار ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس ہی کی پرستش کرتا ہے۔ اس لیے وہ مغرور اور متکبر ہوتا ہے۔ اُمرا کو چاہیے کہ وہ ہر شخص سے تواضع اور انکسار سے ملیں مگر فقیروں میں نفس زیر ہوتا ہے اور وہ نفس کی غلامی میں نہیں ہوتے۔ اس لئے ان کی بے پرواہی اور لوگوں سے نہ ملنا شان کبریائی سمجھا جاتا ہے۔

ایک صاحبدل کے نزدیک ایک بادشاہ اور ایک غریب دونوں برابر ہوتے ہیں اور وہ بادشاہ سے بھی اسی طرح ملے گا جس طرح کوئی ایک ادنیٰ آدمی سے ملتا ہے اور اس کی تعظیم و تکریم ہرگز نہیں کرے گا۔ تو یہ بات اظہار کبریائی ہے۔ کیونکہ صاحب دل کا فعل خدا کا فعل ہے۔ اور خدا میں شان کبریائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو اس کی [illegible] سے ظاہر ہوتی ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ امیروں کو ہمیشہ خاکساری اور تواضع اختیار

خواجہ فریدالدین صادق

حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ادبی خدم

کسی بھی زبان کی ترقی کا دارومدار زبان کو عام فہم بنا کر عوام کے سامنے پیش
ہوتا ہے ۔ اور یہ کام ادیبوں شاعروں اور سماج کے ذمہ دار دانشوروں ۔ صوفیوں
کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ۔

جہاں تک اردو زبان کی ابتدا اور ترقی کا سوال ہے یہ بات بالکل واضح ہے
کہ اسکی ابتدا اور ترقی دکن کے صوفیوں اور شاعروں وادیبوں سے ہی ہوئی ۔

اردو کی ابتدا : دراصل مختلف زبانوں کے آپس میں مل جانے سے اور
کے ایک سے دوسری زبان میں جذب ہو جانے سے ہوئی ۔ تاریخ اس بات کی
کہ جب ہندوستان پر آدمیوں نے شمالی حصہ پر قبضہ کر لیا تو وہاں کے دراوڑی لوگ دکن
طرف نکل پڑے جنکی زبان تامل ۔ اڑیا اور تلگو وغیرہ تھی ۔

آریاؤں نے جو فاتح تھے مفتوح کی زبان سے مغلوب نہ ہوکر اپنی ایک زبان سنسکرت
کو عام کرنے کی کوشش کی لیکن سولہ سو راجہ بکرماجیت کے دور کے سنسکرت کبھی ترقی
کر سکی یہ سنسکرت زبان یہاں کے مقامی زبانوں سے ملکر ایک نئی شکل اختیار
جسکو ہم پراکرت کہتے ہیں ۔

پروفیسر ویبر کی تحقیقات کی رو سے چھٹی صدی میں تو بنگا جیسے زیادہ پر

زبانیں بولی جاتی تھیں ان میں سے چند مشہور زبانیں "پالی" "جینی" "مہاراشٹری" "سلطھی" اور شورانسی تھیں۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا آغاز ۹۲ھ میں ہو چکا تھا سندھ اور شمالی ہند پر صدیوں حکومت کرنے کے بعد اردو کی ابتداء کے تعلق سے مختلف محققین کا خیال ہے کہ یہ پنجاب سے یا سندھ سے دوآبہ گنگا جمنا سے یا پھر دکن سے ہوئی بہر حال۔ یہ طے ہے کہ ہندوستان ہی میں اردو کی ابتداء ہوئی ہندو اور مسلم کے باہمی اتحاد سے ہی یہ زبان وجود میں آئی انکا آپس میں میل جول اسکی ترقی کا ضامن بنا۔

جہاں تک دکن میں اردو کی ابتداء اور ترقی کا سوال ہے یہ بہت ہی اہم سوال ہے دکن میں اردو ادب کی ترقی میں مختلف حکومتوں نے اپنا اپنا رول بخوبی نبھایا ہے مثال کے طور پر دکن کے چند حکومتیں یہ ہیں۔ بہمنی (BAHMANI) حکومت۔ عادل شاہی حکومت۔ قطب شاہی حکومت مغل حکومت۔ پھر آخر میں برٹش دور اور سلطنت آصفیہ قابل ذکر ہیں۔

ہم اس بات کو مدنظر رکھیں کے ہر دور میں اور ہر حکومت میں اردو کو جہاں شاہوں نے ترقی دی ہے وہیں پر ادیب شعرا کرام صوفی دانشور اور مفکروں نے بھی اسکی ترقی میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

بہمنی دور (BAHMANI DYNASTY) ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۵ء | علاؤالدین خلجی کے (۳۰) سالہ شاندار دور اور بعد میں سلطان محمد

تغلق کا جو دور شروع ہوا اسی دور میں دکن میں امرا سے دو سال کی جدوجہد کے بعد اپنی اپنی حکومتوں کا اعلان کیا حسن خاں المخاطب ظفر خاں علاؤالدین بہمن شاہ کے خطاب سے دکن کا خود مختار حاکم بن بیٹھا اور تقریباً دو سو سال تک اس خاندان کے ۱۸ بادشاہوں نے گلبرگہ اور بیدر میں حکمرانی کرتے آئے۔ اسکے زوال کے بعد دکن میں

پانچ حکومتیں گولکنڈہ، بیجاپور۔ احمد نگر۔ برار اور بیدر قائم ہوئی۔ بہمنی سلطنت کا مشہور بادشاہ فیروز شاہ بہمنی گذرا ہے جسکے دور میں نہ صرف حکومت کافی استحکام اختیار کر گئی تھی بلکہ اردو ادب بھی کافی فروغ پایا۔ یہ وہ دور تھا جب بہمنی حکومت پورے دکن پر قابض ہو کر جو بحرہ عرب سے بحرہ بنگال تک کا علاقہ تھی اردو زبان ادب کا سلسلہ اس وسیع علاقہ پر تیزی سے پھیلتا گیا۔ بہمنوں کی ادب پروری کی تعریف کی جائے کم ہے انہوں نے کئی ادیبوں شاعروں اور صوفیوں کی سرپرستی جسکی وجہ سے اسکے دور میں اردو ضبط تحریر میں آئی اس وقت تک اردو صرف بول کی زبان تھی۔ جسطرح اکبر بادشاہ۔ محمد قلی قطب شاہ ابراہیم عادل شاہ بین قومی تمدن کو لائج کرنے میں شہرت رکھتے ہیں اسطرح فیروز شاہ بہمنی بھی علم و فضل اور شعر و سخن علاوہ بین قومی تمدن کو رائج کرنے میں کافی مشہور ہے اور دراصل اسی کے عہد سے ہمیں اردو کی نثر و نظم کا پتہ چلتا ہے اور اسکا پایہ تخت گلبرگہ دکن میں اردو کا ابتدائی مرکز تھا۔

سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱ تا ۱۴۲۲ء)

سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز فیروز شاہ بہمنی کے دور میں دکن تشریف لائے آپکا بادشاہ نے خود استقبال کیا اور گلبرگہ سے آیا آپ فیروز شاہ بہمنی کے دور میں تشریف لائے۔ فیروز شاہ بہمنی جو خود ایک بہت ذہین بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب و شاعر بھی تھا اور عروجی تخلص کیا کرتا بہت ہی ادب دوست اور صوفیوں اور شاعروں کی سرپرستی کرنے میں شہرت رکھتا تھا۔ بہرحال جب حاکم وقت ہی ادیب و شاعر ہو تو پھر زبان کی ترقی میں تیزی آجاتی ہے۔ فیروز شاہ بہمنی کا دور اس واسطے تاریخ میں سنہری الفاظ سے لکھا اس دور میں اردو زبان کی اور ادب کی بے پناہ ترقی ہوئی اور اردو زبان

ضبط تحریر میں آئی۔"

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز جو ایک بہت بڑے عالم فاضل صوفی تھے اپنے وقت کے بہت مشہور بزرگ بھی تھے آپ ہندو مسلمان ہر ایک کو بہت چاہتے تھے جسکی وجہ سے آج بھی آپکی مزار پر بلالحاظ مذہب و ملت لوگ ادباً حاضری دیتے ہیں آپکے کئی کرامات بھی کافی مشہور ہیں۔ جیساکہ وہ پہر بیان کیا جاچکا ہے کہ آپ سلطنت بہمنیہ کے دور میں فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ تشریف لائے تھے۔ آپ خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ علم دین کی اشاعت کے لیے جہاں آپ نے سرگرم حصہ لیا وہیں پر آپ نے اردو کی تصنیف و تالیف کا بھی کارنامہ ہائے انجام دیا۔ آپ دین کی اشاعت کے بیلے جب کبھی بھی ضرورت پڑتی عربی اور فارسی سے ناواقف لوگوں کے لیے مکنی زبان یعنی "اردو" کی مدد لیتے اور اکثر و بیشتر اپنے واعظ اور بیان میں دکنی زبان "اردو" کا استعمال کرتے۔ ظہر کی نماز کے بعد آپ دین کی اشاعت کے کام کے بیلے اردو میں وعظ فرماتے۔ اسلامی اصول اور بنیادی اخلاقیات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے۔ بھائی چارگی۔ محبت، خلوص اور انسانیت کا سبق دیتے۔

بادشاہ وقت کے مزاج کے مطابق آپ دین کی اشاعت کا کام دکنی زبان "اردو" میں کرنے لگے اور کئی کتابیں تصنیف فرمائیں آپ بہ ذات خود ایک اچھے ادیب و شاعر تھے۔ آپ اپنا تخلص "شہباز" فرماتے تھے۔ اپنا نام جہاں اسلام میں ایک مشہور صوفی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے وہیں "اردو ادب" میں بھی سنہری الفاظ سے لکھا گیا ہے۔ "آپ اردو کے پہلے نثر نگار اور پہلے شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپکی چند مشہور تصانیف کا یہاں پر مختصراً ذکر کیا جائے گا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (حضرت سید محمد حسینی) ۸۱۵ھ میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ تشریف لائے اور تاحیات یہیں پر رہے آپ نے بھی

آپکا مزار شریف گلبرگہ میں موجود ہے جہاں ہر سال عرس شریف بھی پابندی سے
منایا جاتا ہے۔ آپ بہت ہی پائے کے عالم تھے آپ نے جہاں انسانیت کا سبق
پڑھایا۔ دین کی اشاعت اور اردو ادب و زبان کی ترقی کے لیے پہل کی۔ آپکو
جن کا ایک ہم ذکر کرنے والے ہیں دکنی زبان کی اپنی آپ مثال ہیں آ
ہی سادہ الفاظ اور جلد سمجھے والے متن کو بڑی اچھی طرح سے پیش کیا
اردو ادب کے پہلے ناثر قرار دیئے گئے ہیں۔ آپ نے تصنیف و تالیف کا
خوبی سے انجام دیا ہے۔ جو لوگ آپکی طرف رجوع ہوتے تھے ظاہر ہے کہ وہ
رہنے والے تھے یعنی دکنی تھے اور عربی اور فارسی سے واقف نہیں تھے اسیا
وعظ بھی دکنی زبان میں فرماتے تھے۔ علم تصوف حدیث اور سلوک کا درس
زبان میں دیا کرتے تھے۔ آپ نے انہی لوگوں کے لیے چند تصانیف مرتب فر
ہم ذکر کریں گے۔ مختصراً تاکہ یہ مقالہ طوالت نہ اختیار کر جائے۔

حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح کی تصانیف :

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح کی جن تصانیف کا پتہ چلتا ہے وہ حسب
(۱) معراج العاشقین۔ ہدایت نامہ - "تلاوت الوجود" - شکار نامہ ا
رسالہ بانہ وغیرہ ہیں۔ اسکے علاوہ بہت سی نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ جو
قابل ذکر "راگ راگنیاں اور چکی نامہ ہے۔ جو مختلف کتب خانوں کے یہا
آج تک بھی محفوظ ہے۔

اب ہم اس عظیم صوفی اور بزرگ ہستی کے چند نثری نمونوں اور نظموں پر
زبان کتنی سلیس اور شائستہ استعمال ہوئی ہے اسکا اندازہ انکو پڑھکر ہی
حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصانیف میں سے عبارت کا ایک نمونہ پیش

جس سے قدیم ترین اُردو نثر کا پتہ چلتا ہے ۔

نثری نمونہ :

"انسان کے بوجھنے کو پانچ تن ۔ ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں ہور پانچ دربان ہیں ۔ پہلا تن واجب الوجود مقام اسکا شیطان نفس اسکا امارہ ۔ لیکے واجب کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو حرص کے کان سوں غیر نہ سننا سو ۔ حسد تک سوں بربولی نہ بیا سوں ۔ کینہ کی شہوت کو غیر جاکہ نہ خرچنا سو ۔ پیر طبیب کامل ہونا ۔ تیغ پچھان کر دوا دینا ۔"

(دکنی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محی الدین قادری زور)

اب آپ اس نثر سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کسطرح عام فہم الفاظ میں جو آج بھی رائج ہیں حضرت خواجہ بندہ نواز سے تحریر فرما کر نہ صرف انسانیت اور دینی کا سبق دیا ہے بلکہ اُردو ادب پر بھی ایک بہت بڑا احسان کیا ہے ۔

اس سے ہٹ کر آپکی تحریر کے چند اور نمونے پیش ہیں ۔

"دو بنی کے تحقیق خدا کے درمیان تے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھیار کے اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جاوے تو اسکی آنچ تے میں جلوہ اور ایک وقت ایسا ہوتا ہے اور دیکھ بینے پردہ اندھیارے کے اوجیالے کے عارفاں پرہے و املان پر پردے نورانی ۔ دے واملان کا صف پیدا ہوتا ہے ۔ محمد کا نور اے عزیز اول ربوبیت کا پردہ سوائے تن جمالی جسم کے پردے کو اپڑنے باج اس جمالی الوہیت کے پردے ممکن الوجود کو اپڑ سکے ۔ (معراج العاشقین)

(دکن میں اردو ۔ مولانا نصیر الدین ہاشمی)

تو آپ [illegible] نثری نمونوں کو دیکھ کر [illegible] کہ حضرت خواجہ

بندہ نواز گیسو دراز" اردو ادب کے سب سے پہلے نثر نگار تھے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ایک شاعر بھی تھے آپ "شہباز" تخلص تھے۔ آپ کی چند نظمیں کافی مشہور ہیں جن میں چکی نامہ اور راگ راگنیاں مشہور ہیں۔

یہاں پر ایک نظم کے چند شعر درج کئے جا رہے ہیں۔

کھولے کھولے پیو جیو میں آپیں آپ دکھاوے
ایسے سجنے معشوق کوں کوئی کیوں دیکھ پاوے
بندہ دیکھے اسے کوئی نہ بھاوے

○

کل سے نیارا ہے اسے کون پچھانے
جو کوئی عاشق اس پیو کے اسے جیو میں جانے
اسے دیکھت گم رہے جیسے ہیں دیوانے

○

خواجہ نصیر الدین بجنے سائیاں پیو بنائے
پیو کا گھونگھٹ کھول کر پیا مکھ آپ دکھائے
راکھے سید محمد حسینی پیو سنگھ کہیا نہ جائے

(از دکنی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محی الدین قادری)

چکی نامہ :۔ اس نظم میں بارہ بند ہیں۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور نے اپنی کتاب "تذکرہ" میں اس کا تعارف کرایا ہے۔

(ڈاکٹر م، اے، ا، ہاشمی)

آیئے اب ہم اس چکی نامے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

نظم چکی نامہ:-

دیکھو واجب تن کی چکی | پیو چاتر ہو کے سکی
سوکن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی | کہے یا بسم اللہ ، اللہ ہو

الف اللہ کا دستا | نے محمد ہو کر بسنا
ہنچی طلب یوں کو دستا | کہے یا بسم اللہ ہو اللہ

وائے ہی سوچن چن لانا | شاید باتوں سے لے کر بہانا
شریف سے چکی میں | کہے یا بسمہ اللہ ہو اللہ

الف اللہ اسکا بالوں | پیر مرشد ملک جانو
پو انا اس لے پچھانو | کہے بسم اللہ ہو ہو اللہ

لا دم وجود باسن ہونا | اس تو ہستی دھونا
ذات کی پائے سو اسکی کو ہننا | کہے بسم اللہ ہو ہو اللہ

(دکنی میں اردو نصیر الدین ہاشمی)

اسطرح خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ پہلے نظم گو ہونے کا سہرا اپنے سر لیتے ہیں۔ آپکی علمی ادبی خدمات کا محاصرہ کرنا بہت مشکل ہے پھر بھی میں نے چند محققین کی تصانیف کی مدد سے آپکے ادبی خدمات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اوپر بیاد کیا جا چکا ہے کہ خواجہ صاحب ایک اچھے شاعر بھی تھے اور شہباز تخلص فرماتے

آئیے اب انکی غزل کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

توں تو سہی ہے کر نفس گھوڑا سوار توں
ناہو نرم تجہ اوپری پس پاوے گا آزاد توں

○

تب قید گھوڑا ر تے لگا تجھ لامکاں لے جاے گا
تب عشق جھگڑا پاے گا خوش مارے تلوار توں

○

دونوں رکاباں نیک و بد رکھتا قدم تو ایک حد
تب او پری کا ایک جب تو ہاکا چابک مار توں

○

وی کلا دل گیا نا کا چارا کھلا ایمان کا
انعام دے خوش حیان کا یا خدا اپنے دار توں

○

شہباز حسینی کہوتے کر ہر دو جہاں دل دھوے کر
اللہ لیے یک ہوے کر تب پاوے گا دیدار توں

(دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی)

یہ تھی مرصع غزل جو اردو ادب میں غزل کی ابتدا تھی آپ محترم اسلاح آ
ادب کے پہلے شاعر ہونے کا اعزاز کی حیثیت سے آپ تا قیامت یاد ر
جاتے گے۔ حضرت کے علمی اور ادبی خدمات کے بارے میں راقم اتنا ہی کہے گا
لیے متبرک ہاتھوں سے اردو نثر و نظم و غزل کی ابتدا ہوتی ہے۔ تو پھر اردو ادب
فروغ اور اسکی ترقی اور تمام اصناف سخن میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا ہے"

آج اُردو کے مخالف سارا زمانہ ہے ہندوستان آزاد ہونے کے بعد اُردو کی ترقی
ں کئی رکاوٹیں آئیں پھر بھی آج کے اس دور میں بھی اردو ادب اور اُردو زبان اپنے
ںپر نہ صرف باقی اور برقرار رہنے کی جدوجہد کررہی ہے بلکہ ترقی کرتی جارہی ہے۔ یہ
ب محترم صوفی اکرام اور خاص طور سے سید محمد حسینی حضرت خواجہ بندہ نواز جو اُردو کے
ا ادیب و شاعر ہیں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے
آپکے بعد بہتی دور کے اور کئی مشہور صوفی اکرام شعرا اور ادیبوں نے اُردو کی ترقی میں
ن رات اپنی کوششیں جاری رکھیں جن میں قابل ذکر
سید اکبر حسینی
ہی
شاہ صدرالدین
ہاللہ حسینی ۔ مشتاق ۔ لطفی ۔ شاہ میراں جی شمس العشاق اور اداہی ہیں۔
یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا ہر دور میں اُردو کے
مت گذار پیدا ہوتے رہیں۔ یہ مقالہ جو سید محمد حسینی عرف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ
ں ادبی خدمات پر لکھا گیا ہے اب اختتام کو پہنچتا ہے۔

تابیات : دکن میں اُردو (نصیر الدین ہاشمی)
Referenc Books { دکنی ادب کی تاریخ (ڈاکٹر محی الدین قادری زور) وغیرہ

رؤف رحیم

جناب رحمٰن صدیقی، محبّ اردو

لطف کیا ہے جو ذکرِ یار نہیں
زندگی صرف کاروبار نہیں

جناب رحمٰن صدیقی ہندوستان کی مردم خیز زمین اورنگ آباد میں ۱۹۳۸ء میں پیا
اوران کی نشو نما، تعلیم و تربیت گہوارہ ادب یعنی حیدرآباد میں ہوئی۔ چودہ برس تک
میں رہے۔ جس طرح اورنگ آباد کو شرف حاصل ہے کہ اس نے ولی اسراج متی اور
شاعروں کو جنم دیا، حیدرآباد کو فخر حاصل ہے کہ حضرت امجد سے لیکر ممتاز تک کئی نامور
کئے۔ اور آج بھی آسمان ادب پر کئی ستارے جگمگا رہے ہیں۔ رحمٰن صدیقی کو بچپن سے
سے شغف رہا۔ ۱۹۵۲ء کو وہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کراچی چلے گئے۔ یہاں پر ا
تعلیم ہوئی۔ پاکستان میں انہوں نے محکمہ تعلیمات اور پھر وکالت کے پیشے کو اپنایا۔ موصو
بڑے فرزند جناب محمد رفیق الرحمٰن کی ایما پر ۱۹۸۹ء میں لاس انجلز کیلی فورنیا چلے گئے۔ جنا
"پاکستان لنک" ہفتہ روزہ نکالا کرتے تھے لیکن مغرب زدہ علاقے میں اس کی پابندی
۱۹۹۱ء سے جناب رحمٰن صدیقی پاکستان لنک، کو اپنی کوششوں سے پابندی کے ساتھ
میں ریگستان میں پھول کھلانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ امریکہ میں اردو کی بقا، تر
ترویج کا بیڑہ اٹھانا کوئی کوئی آسان کام نہیں۔ نئی نسل کو اردو سے روشناس کر

سلسلے میں ہے۔ بحد معروف ہیں کیونکہ مذہبی لٹریچر اردو سیکھ لیں تو عربی بآسانی سیکھ سکتے ہیں۔ جناب رحمٰن صدیقی سے میرا غائبانہ تعارف جناب حسن چشتی صاحب مقیم شکاگو امریکہ نے کرایا تھا۔ انھوں نے " پاکستان لنک " میں میرا کلام شائع کروا کر مجھے اس ہفت روزہ کا گرویدہ بنا دیا۔ پاکستان لنک کے اُردو صفحات صحافت کی عظیم مثال ہیں۔ مذہبیات ہو کہ سیاسیات، فلمیات ہو کہ علمیات کھیل کود ہو کہ ہنسی مذاق پاکستان لنک کے لوازمات اور ملزومات ہیں۔ جب جب نظر اس دیدہ زیب پرچہ پر پڑتی ہے پڑھنے کو جی جو چاہتا ہے۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو کے صفحات قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ جناب صدیقی سے ملاقات کی دیرینہ خواہش رہی کہ ان کی حیدرآباد آمد کے بعد ہوئی ویسے خط و کتابت سے نصف ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ پہلی ملاقات ہی میں انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ جناب مظفر مجاز کیساتھ جب وہ حلف اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں شرکت کے لیے ادارہ ادبیات اُردو کے ہال میں داخل ہو رہے تھے میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی وہ خندہ پیشانی سے ملے جبکہ ان کی پیشانی پر کئی بل ہیں مسکراتا لیکن رعب دار چہرہ، خشخشی داڑھی۔ انکے مذہبی ہونے کا ثبوت دیتی ہوئی مغربی لباس میں زیب تن مجھ کو گلے لگایا اور چند لمحات اکیلے میں گفتگو کی۔ ادبی اجلاس اور مشاعرہ میں شریک رہے۔ مشاعرہ صرف حلف اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے شعرا کا تھا اور میرا مقصد تو صرف ان سے ملاقات تھا۔ دوسرے دن جب ان کے گھر واقع پنچل گوڑہ پر ملاقات ہوئی تو ان کے کئی جوہر کھلے۔ منکسر المزاج۔ سادہ لوح شخصیت کے حامل جناب رحمٰن صدیقی نے میرے کلام نہ سنانے پر افسوس کیا۔ انہیں گروہ بندیوں کا اندازہ ہوا۔ میں نے ادبستان دکن بزم حکمت سخن اور محفل ادب میں شرکت کی دعوت دی تو انھوں نے اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر شرکت کا وعدہ کیا اور تشریف لائے۔

حیدرآباد کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ ہر بیرونی شاعر اور ادیب کا استقبال کرتا ہے

[illegible] اور دو شاعر اور ادیب جب

حیدرآباد سے جاتا ہے تو یادوں کی زنجیر اس کے گلے میں پڑ جاتی ہے۔ اور کبھی پیروں میں پڑ کر اسے روکنے لگتی ہے۔ محبت کا رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ خون کے رشتے سے بڑھ کر
رحمٰن صدیقی صاحب بہت مختصر مدت کے لیے حیدرآباد تشریف لائے اور وہ بھی
حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے فوری بعد۔ اب کراچی جائیں گے اور ایک ہفتہ کے بعد اپنے مستقل مقام یعنی امریکہ چلے جائیں گے۔ لیکن انکی باغ و بہار شخصیت اور دل کو موہ لینے والی شاعری ہمارے ذہنوں میں گونجتی رہے گی۔ پاکستان لٹک جو ایک گلدستۂ ادب ہے ان یادوں کی زنجیر میں باندھ رکھے گا۔ جناب رحمٰن صدیقی جتنی اچھی شخصیت کے مالک ہیں اتنے ہی اچھے شاعر ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی وقف دوستاں ہے مگر
ہاں کسی داؤ میں نہ ہارو مجھے

بہت بے چین ہوں کچھ ڈھونڈتا ہوں
مجھے کچھ بھی نہ دے اپنا پتہ دے

اس کو بھولا نہیں کہا جاتا
دن کو جو بھولے شام گھر آئے

غم نہ کر اس جہاں میں صدیقی
بے سہاروں کا بھی سہارا ہے

نہ وہ ناتے رہے نہ رشتے ہیں
ذات میں اپنی گم ہیں سارے لوگ

ہماری خوئے وفا رنگ لائے گی کہ نہیں
بہار بن کے فضاؤں پہ چھائے گی کہ نہیں

سپھر بی چترویدی

ہندی صحافت کی مایۂ ناز شخصیت
"یگل کشور شکلا"

ہندی صحافت کے میدان میں یگل کشور شکلا پہلے آدمی ہیں جنھوں نے پہلا ہندی اخبار "اُدانت مارتانڈ" جاری کیا۔ اس وقت تک بمبئی، مدراس اور کلکتہ سے کئی بنگالی اور فارسی اخبارات جاری ہو چکے تھے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں جیمس آگسٹس ہکی نے بنگال گزٹ یا کلکتہ اڈوائزر جاری کیا اسی زمانے میں سری رام پور سے انگریزی اور بنگالی زبانوں میں "سماچار درپن" اور کلکتہ سے "جام جہاں نما" جاری ہوتے تھے۔ بنگالی اخبار مثلاً "سمواد کومودی" اور "سماچار چندریکا" بھی اُس وقت شائع ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں چند انگریزی اخبارات بھی روزنامہ، ہفتہ وار یا ہفتہ میں دو تین بار شائع ہوتے تھے اُس زمانے میں کلکتہ بنگال کا صدر مقام تھا۔ اتر پردیش کے کئی لوگ تجارت اور دیگر سرگرمیوں کے تحت بنگال میں مقیم ہو گئے اور شکلا نے خیال کیا کہ ہندی اخبارات سے دلچسپی رکھنے والے افراد بہت سارے ہونگے۔ "اُدانت مارتانڈ" اگرچہ ہفتہ وار تھا لیکن روزنامہ کی طرح خبروں کی رپورٹ اور بازاری قیمتوں سے متعلق تفصیلات سے بھرپور رہتا تھا۔

۳۰ مئی ۱۸۲۶ء کو کشور شکلا نے اخبار جاری کرنے کے بارے میں اپنے عزائم بتاتے

کا ذکر کیا۔ "اُدانت مارتانڈ" ہندوستانیوں کی دلچسپی کا اخبار تھا جسکے بارے میں کسی نے بھی خیال نہیں کیا تھا جسطرح انگریزی، فارسی اور بنگالی سے واقف افراد اخبارات سے استفادہ کر سکتے ہیں اُسی طرح ہندی زبان میں جاری کیا گیا اخبار ہندوستانیوں کیلئے مفید تھا۔ شکلا کو جسطرح ہندی زبان میں پہلا اخبار شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا اُسی طرح دوسرا امتیاز یہ حاصل رہا کہ ہندی صحافت میں جن چیزوں کو انہوں نے اپنایا اُسکی تقلید بہت سارے ہندی اخباروں نے ہندوستان کو آزادی ہونے تک جاری رکھی۔ انہوں نے ہندی صحافت کے میدان میں خبریں وغیرہ لکھنے کا طریقہ اختیار کیا وہ آج بھی جاری ہے۔ ابتدائی زمانے میں بھی شری شکلا اہم شخصیتوں کے بارے میں معلومات بہم پہونچانے کے طریقہ کار سے بخوبی واقف تھے۔ "اُدانت" اگرچہ حقیقت میں پہلا ہندی اخبار تھا لیکن صحافیانہ نقطہ نظر سے تجرباتی انداز کا تھا۔ "اُدانت مارتانڈ" کا معیار اور خبروں کی اشاعت کا انداز دوسرے انگریزی اور فارسی اخبارات کے مماثل تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے جاری کردہ ہندی اخبار میں جنگ کے بعد لارڈ ایمرسٹ کی عدالت اور برما کے راجہ کے ساتھ معاہدات کی عکاسی والی رپورٹ پر مشتمل تھا اس اخبار میں جو زبان استعمال کیگئی تھی وہ کلکتہ کی ہندی کہ تھی لیکن منعقدہ عدالت کی تفصیلات کا اندراج شری شکلا کی صلاحیتوں پر مبنی تھا۔ اس کے ذریعہ حقائق کا بہتر اور پرکشش انداز میں انکشاف کیا گیا تھا۔ "اُدانت" کے ذریعہ ایک سفر نامہ کی کمی کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کیگئی تھی۔ جسمیں ... کے تقررات کی تفصیلات "راج کاج میں یوگ" کے عنوان سے خبروں کی اشاعت عمل میں لائی گئی تھی۔ دیگر مالیاتی رپورٹس کے ساتھ اشیا کی بازاری قیمتوں کی بات "ارتھ وارتی" کے عنوان سے شائع کیگئی۔ اخبار میں برطانیہ، کلکتہ، جودھپور اور لاہور کے مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کے بارے میں رپورٹس درج تھے۔ ایک

میں فرانسس کی خبریں بھی شائع ہوئی تھیں، شکلا نے تسلیم کر لیا تھا کہ اخبار پڑھنے والوں کو لطف اندوز کرنے والی عبارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اسلئے ایک اخبار میں فرانسس کی پُر مذاق خبریں بھی شائع کیگئی تھیں، اگرچیکہ یگل کشور شکلا خود بھی ایک وکیل تھے تاہم انہوں نے وکلا کی جانب سے عدالتی مقدمات میں کیجانے والی تاخیر کے نتیجہ میں فیصلوں کی اجرائی میں ہونے والی تاخیر کو منظر عام پر لایا اور جو کچھ انہوں نے لکھا وہ آج بھی بالکلیہ ایک حقیقت ہے ایک مشہور وکیل نے عدالتی مقدمہ کی عرصہ دراز تک پیروی کی اور ضعیف العمری کی بناء پر اس مقدمہ کو خود کے داماد کے حوالے کر دیا۔ کچھ مدت تک داماد نے مقدمہ کی پیروی جاری رکھی اور ایک دن خوشی سے گھر واپس ہو کر اپنے خسر سے کہا کہ جناب جو قدیم مقدمہ آپ نے میرے حوالے کیا تھا اُسکا آج تصفیہ ہوچکا ہے۔ ضعیف وکیل نے غصہ سے بھرپور ہو کر کہا کہ "اس نوجوان وکیل نے مقدمہ کو برباد کر دیا ہے جو عدالتی مقدمہ مجھے اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا وہ ہمیں ہماری زندگی کیلئے ممد و معاون تھا اسی لئے میں نے یہ خیال کر کے یہ مقدمہ تمہیں دیا تھا کہ تم بھی اس مقدمہ سے نقدی حاصل کرو گے اور تمہارے پوتوں تک بھی اس مقدمہ سے مدد حاصل ہوتی رہیگی مگر تم نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں اس مقدمہ کو کھو دیا ہے۔" جیمس آگسٹس ہکی کی طرح شکلاجی کو کبھی بھی اپنی لکھاوٹ کے سلسلہ میں جیل کی سزا بھگتنی نہیں پڑی اور اُن پر کوئی الزام بھی عائد نہیں کیا گیا۔ "سماچار چندریکا" بنگالی اخبار میں شمالی ہند اور مارواڑیوں کی تجارت کے خلاف کچھ الفاظ لکھے گئے تھے جسکی مخالفت میں اُدانت مارتانڈ میں اداریہ کے خلاف تحریریں شائع کیگئیں۔ سماچار چندریکا کے جواب کے سلسلہ میں شائع شدہ عبارت کی بنا پر سماچار چندریکا کے ایڈیٹر نے سپریم کورٹ میں شری شکلا کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا لیکن طنز آمیز بیانات پر بری ہوئے۔ شکلا نے جن مارواڑیوں کی تائید میں خبریں شائع کیں ان مارواڑیوں نے نہ تو شکلاجی کی مدد کی اور نہ ہی اخبار کیلئے کچھ چندہ دیا بعد ازاں

۱۴ دسمبر ۱۸۲۷ء کو اُدانت مارتانڈ اخبار کو بند کر دیا گیا چنانچہ انہوں نے "مشم
علام کا دوسرا اخبار جاری کرنے کی کوشش کی جس کو پڑھنے والوں کی کمی کی
بہت جلد ہی بند کردینا پڑا۔ تاہم شکلا جی نے ایک اور ہندی اخبار جاری کرنے کی
اُن کے اسی اخبار کے بعد کلکتہ سے "ہنگ دوت" نام کا دوسرا اخبار بنگالی،
ہندی میں جاری ہوا جو چند دوسرے ہندی اخبارات کے علاوہ تھا جس وقت ا
ہندی اخبار شائع کیا گیا تھا اُس وقت ملک کے حالات اخبار کی اشاعت
سازگار نہیں تھے۔ ۱۸۱۸ء کے آدمس قانون کی عمل پیرائی کی بنا پر "مرآت الا
۱۸۲۳ء میں بند کر دیا گیا، مشہور صحافی جیمس سلک بکنگھم کو ۱۸۲۳ء میں کلکتہ
اخبار میں تنقید کی بنا پر ملک سے نکال دیا گیا۔ ادانت مارتانڈ اخبار کو حکا
جانب سے بھی کسی قسم کی مدد نہیں ملی۔ سماچار چندریکا اور جام جہاں نما اخبا
دیگئی چھوٹی سی مدد بھی ادانت مارتانڈ کو حاصل نہیں ہوسکی۔ چنانچہ ڈیڑھ سال تک
شکلا جی نے قانونی اخبار کے تیقن پر ہی اپنے اخبار کی اجرائی کا کام جاری رکھا
ہ اخبار کی اشاعت میں ناکام ہوگئے تو انہوں نے کافی پچھتاوے کیا تھ
کو بند کر دیا۔ اس قسم کے موقف سے بہت سارے صحافی گذرتے ہیں۔ جو عوامی
جذبہ کے تحت پرجوش انداز میں اخبار کی اشاعت کا کام شروع کرتے ہیں لیکن
نے اپنے کام کو بالکلیہ طور پر ختم نہیں کیا بلکہ ۲۳ سال کی مدت گذرنے کے بعد بھی
ایک دوسرا اخبار ہندی زبان میں "سمدند مارتانڈ" نام سے کلکتہ سے جا
اعتبار سے شری یگل کشور شکلا ہندی صحافت کے بارے میں نہ صرف پرجوش
شخصیت ہے بلکہ ہندی صحافت کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں کیونکہ اگر انہوں نے ادانت
مارتانڈ ہندی اخبار کو جاری نہیں کیا ہوتا تو یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ ہندی صحافت
میں کیسا کہاں اور کس طرح سے جنم لیتی رہیں۔

پی آئی بی

نوئیڈا۔ برآمداتی منطقہ کی قابل لحاظ ترقی

معاشی اصلاحات اور آزادانہ معاشی حکمت عملی اختیار کرنے کے نتیجہ میں نہ صرف صنعتی اکائیوں کے قیام میں مدد ملی بلکہ ذاتی ملکیت کے ڈھانچے کی روشنی میں غیر مقیم ہندوستانیوں کے یونٹس کو زیادہ سے زیادہ ابھرنے کا موقعہ ملا ہے۔ نوئیڈا کے برآمداتی طرز عمل کو تیاری اسباب کے مسابقتی میدان میں ترقیاتی ڈھانچے کی ترکیب سے کافی مدد ملی جسکے نتیجہ میں غیر مقیم ہندوستانیوں کی جانب سے پراجکٹس کی تجاویز میں اضافہ اور تجسس کو بڑھاوا ملا ہے چنانچہ سال ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران منظور شدہ ۴۶ نئے پراجکٹس میں ۱۴ پراجکٹس غیر مقیم ہندوستانیوں سے وابستہ رہے ہیں اور دوران سال ۱۲ یونٹس پیداواری میدان میں داخل ہوئے۔ سال رواں اپریل ۹۴ء تا جنوری ۱۹۹۵ء ۲۹ نئے پراجکٹس منظور کئے گئے ہیں جن میں غیر مقیم ہندوستانیوں سے تعلق رکھنے والے ۱۰ پراجکٹس شامل ہیں اور رواں مالیاتی سال کے دوران ابتدائی دس مہینوں میں ۱۹ یونٹس پیداواری صلاحیت کے قابل بن چکے ہیں۔ جن میں سے آٹھ یونٹس کو غیر مقیم ہندوستانیوں کی مدد سے ترقی حاصل ہوئی ہے۔ نئے منظور شدہ پراجکٹس' ملبوسات' زیورات' جواہرات اور الکٹرانکس سے وابستہ ہیں۔ نوئیڈا کا برآمداتی منطقہ' ملبوسات' ساخت وغیرہ' الکٹرانکس' زیورات اور جواہرات کے یونٹس کے قیام کے

لئے قابل ترجیح مقام کی حیثیت کا حامل ہے۔

برآمداتی کارکردگی :- پچھلے سال منطقہ کی برآمدات ۱۴۶ کروڑ روپیہ پر مشتمل تھی
سال رواں ترقی کرکے ۲۶۳ کروڑ روپیہ تک پہونچ گئی جسکی رو سے ترقیاتی شرح
روپیوں میں ۸۰٫۷٪ فیصد اور ڈالرس میں ۴۹٫۷ فیصد برآمداتی میدان میں انتہائی ترقی کی
عکاسی کرتی ہے۔ سال کے دوران منطقہ میں عمل پیرا جملہ برآمدات میں الکٹرانک اشیاء
بشمول کمپیوٹر سافٹ ویر ۴۸٫۱ فیصد، جواہرات و زیورات ۲۴٪ فیصد، الکٹرانک اور
برآمدات میں قابل لحاظ انتہائی ترقی ریکارڈ کیگئی ہے جن میں انجینیرنگ اشیاء کیمی
ڈرگس، اور فارماسٹیکلس شامل ہیں۔ سال ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران ختم جنوری ۱۹۹۵ء تک
اس منطقہ کے یونٹس کی جانب سے کیگئی برآمدات ۲۶۶ کروڑ روپیہ پر مشتمل رہی
وزارت تجارت کی جانب سے سال ۹۵-۱۹۹۴ء کا نشانہ ۳۵۰ کروڑ روپیہ مقرر
جسکی کماحقہ تکمیل متوقع ہے۔ برآمدات میں جواہرات، زیورات کے شعبہ کو کلیدی
حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ جنوری ۹۵ء کے ختم تک ۹۶٫۳۷ کروڑ روپیہ کی برآمدات
عمل میں لائی گئی ہے۔ الکٹرانکس کی برآمدات ۱۵٫۲۸٪ فیصد رہی اور انجینیرنگ
اشیاء کو تیز رفتار ترقی کے شعبہ میں تیسرا مقام حاصل ہوا ہے نیز ملبوسات
برآمدات میں ۳۰٫۲٪ فیصد اضافہ کی توقع ہے۔

ترقیاتی ڈھانچے کی سہولتیں اور ترغیبات :- ۱۹۸۵ء میں جسے مرحلہ وار
طور پر نویڈا میں جو برآمداتی منطقہ ۲۱۰ ایکڑ اراضی پر قائم کیا گیا تھا مختصراً
ترقی کی راہ پر گامزن رہا ہے اور مزید ۲۶۰ ایکڑ اراضی کی توسیع عمل میں آئی
ہے مختلف رقبہ کے ۲۲۱ پلاٹس اور ۵ ویرہاؤس اور ۳۲ معیاری ڈیزائن کے کارخانوں
کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اور معاشی شرح کرایہ پر فراہمی کی سہولت [illegible]
رہی۔ معیاری ڈیزائن والے کارخانوں کا ایک بلاک ۱۶ یونٹس پر مشتمل ہے

باقی ص ۲۴

"وکرم دت"

"ریڈ کراس - سرچشمہ امن و یگانگت"

ہر زبان میں جنگ اور تشدد سے مراد تباہی و بربادی ہے جس کی بنا پر انسانیت سوز مظالم و مصائب و آلام کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ فوجی سپاہی مادر وطن کی حفاظت و مدافعت کیلئے میدان کارزار میں زخمی ہوتے ہیں۔ بے گناہ اور معصوم شہری بموں اور بندوقوں کی زد میں آتے ہیں۔ جنگ ایک ایسی بدترین لعنت ہے جو بلا کسی امتیاز نا پسند و تعصب، دولت یا رتبہ، افسر یا جوان، امیر یا غریب، تعلیم یافتہ یا جاہل ہر ایک کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس قسم کے تشدد کو دور کرنے کا صرف ایک ہی مثبت طریقہ انسداد ہے۔ امن کے علاوہ بیشتر سبقتی اقدام کیلئے حرکت میں آتے ہیں اور مصائب و آلام سے متاثرہ طبقہ کو راحت بہم پہونچانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ آج سے ایک ۱۲۵ سال قبل ایسے ہی حالات تھے جبکہ ۲۴/ جون ۱۸۶۹ء کو جنگ سلفرینو میں فرانس اور اٹلی کی فوجیں آسٹریلیا کے خلاف صف آرا ہو گئیں ہزاروں کی تعداد میں فوجی سپاہی۔ بلا کسی طبی امداد و تیمارداری زخمی پڑے ہوئے تھے تو اس وقت ۳۱ سال عمر کا موقعی شاہد جین ہنری جو نانٹ نامی امن پسند شخص تھا کہ وہ ان مصیبت زدہ لوگوں کی کچھ نہ کچھ مدد کریگا۔ اس نے سب پہلے وہاں قریب و جوار میں رہتے بستے والے شہری باشندوں کی ایک ٹیم تیار کی۔ جو ایمرجنسی طریقہ

عمل میں لائی اور ریلیف سوسائٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا امن کے زمانے میں بھی کا، ملک اور بیرون ملک عوام نے اسکو تسلیم کیا۔ ان ریلیف سوسائٹیوں کا کام جنگ میں زخمیوں کی مدد کرتا ہے۔ اس طرح سے وسیع پیمانے پر جو دلچسپی پیدا کی گئی اُس میں ۱۸۶۳ء میں ایک کمیٹی قائم کرنے کی راہ ہموار ہوئی نتیجتاً بعد انسان جینوا میں ایک معقدہ کیا گیا جس میں ریڈ کراس کے بنیادی اصولوں کی تدوین عمل میں لائی گئی دوسرے سال ایک سیاسی کانفرنس میں چودہ ۱۴ ممالک نے امن یا جنگ کے زمانے میں بلا لحاظ دوست یا دشمن مدد کرنے کے مسودہ پر دستخطیں ثبت کیگئیں۔ بعد کے سال اس پہلے اجلاس کا اعادہ کیا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں بحری جنگی قیدیوں کی حفاظت ۱۹۲۹ء علم جنگی قیدیوں کی حفاظت اور ۱۹۴۹ء میں جنگ کے متعلقین پر سہولت کی فراہمی اضافہ کیا گیا۔ جین ہنری ڈونانٹ نے ایک پر امن انقلاب کا آغاز کیا اور ۸ر مئی پیدائش کے دن ریڈ کراس ڈے منایا گیا۔ ریڈ کراس نام منتخب کرنے کے بارے دلچسپ تاریخ بھی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے عوام ہمیشہ اپنی غیر جانبداری کیلئے ہیں ڈونانٹ کا تعلق بھی سوئٹزرلینڈ سے ہی تھا۔ سوئٹزرلینڈ کا جھنڈا سرخ پر سفید اُمڑی پٹی کی عکاسی کرتا ہے اسی جھنڈے کی مثال لیکر ریڈ کراس کا نام کیا گیا ہے۔

اس عالمی تنظیم کا ڈھانچہ تین اہم امور پر مشتمل ہے۔

(۱) ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی

(۲) ریڈ کراس سوسائٹیوں کی لیگ یا جماعت

(۳) قومی ریڈ کراس سوسائٹیز

بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی کا مستقر جینوا ہے اور مستقل طور پر ۲۵ ممتاز جینوا کے پر یہ کمیٹی مشتمل ہے ان کا اہم کام یہ ہے کہ جن ممالک میں ریڈ کراس سوسائٹیوں

عمل میں لایا گیا ہے اور جو ممالک دوستانہ بنیادوں پر ریڈ کراس کے رکن بننے کے خواہشمند ہیں ان ممالک میں ریڈ کراس کے مقاصد اور فلسفہ کی پوری پوری عمل آوری کیجا سکے۔ انتہائی اہم بات وقت کے بدلتے ہوئے حالات اور ضرورت کی روشنی میں اُن سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے حکمت عملی میں بھی تبدیلی لانا ہے۔ پس دوسری عالمی جنگ میں ریڈ کراس نے جنگی قیدیوں اور اُن کے خاندانوں کے درمیان ایک رابطہ کا کام انجام دیا ہے۔ ریڈ کراس سوسائٹی نے ہزاروں بارکمپس کا معائنہ کیا اور لاکھوں افراد کی بروقت مدد کی ہے۔ جنگ میں ملوث ملکوں کے درمیان مواصلاتی نظام کی بحالی اور قیدیوں کے تبادلہ کا انتہائی اہم کام بھی ریڈ کراس سوسائٹی کے ذریعہ انجام پاتا ہے اسطرح فی زمانہ جنگ میں حصہ لینے والے ممالک ریڈ کراس سوسائٹی کی خدمات بطور ثالثی قبول کرتے ہیں۔ دشمنی کے ختم ہو جانے کے بعد مصیبتوں کے نشان باقی رہتے ہیں۔ ریڈ کراس کمیٹی فاقہ کشی کو دور کرنے، غربت کا انسداد کرنے، تصادم کے زمانے میں رونما ہوئی بے چینی اور مصیبت کو دور کرنے کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے، چنانچہ یہ وہ اہم کردار ہے جس کو ادا کرنے کے لیے ریڈ کراس کی توجہ ترقیاتی انداز میں خصوصیت کے ساتھ مبذول کیجاتی ہے خواہ وہ کام لوسینا، سومالیہ، یا ریونیڈا کسی بھی مقام سے متعلق ہو۔ عرصہ دراز سے یہ کمیٹی بین الاقوامی کنونشنوں کے انعقاد کے ذریعے جنگی قیدیوں اور تشدد سے متاثرہ افراد کی مدد کرنے کی کوشش ترقی یافتہ انداز میں جاری رکھے ہوئے ہے۔ ۱۹۱۹ء میں ریڈ کراس سوسائٹیوں کی ایک متحدہ جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے بانی اراکین فرانس، برطانیہ، اٹلی، جاپان اور امریکہ ہیں آج زائد از ایک سو پچاس اراکین فہرست میں شامل ہیں۔

ریڈ کراس سوسائٹیز کی لیگ کے آگے دو قسم کے مقاصد کار ہیں ایک تو قدرتی اور ناگہانی آفات کے وقت مدد بہم پہونچانا اور دوسرے قومی سوسائٹیز کی ترقی کا کام انجام دینا ہے ۱۹۲۰ء میں انڈین ریڈ کراس سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی ہے جو اب اپنی ڈائمنڈ جوبلی

منانے کے سال میں ہے۔ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے کا کافی اور زبردست
اسے حاصل ہے جو ۱۹۳۴ء میں بہار کے زلزلے، اور حال میں پیش آئے لاتور کے
کی درمیانی مدت کے دوران عمل پیرا کوششوں سے ظاہر ہے۔ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ
زلزلہ، ۱۹۴۳ء میں بنگال اور جنوبی ہند کے قحط کے زمانے کے علاوہ ہندوست
تقسیم کے نتیجہ میں پیش آئے مصائب و آلام، ۱۹۵۰ء کے زلزلہ آسام، ۱۹۷۱ء میں آز
بنا پر بنگلہ دیش سے پناہ گزینوں کی آمد ۱۹۷۲ء میں اڑیسہ کا طوفان اور ۱۹۸۴ء
بھوپال گیس کا المناک واقعہ وغیرہ چند ایسے اہم واقعات ہیں جن کے دوران انڈ
ریڈ کراس سوسائٹی نے متاثرہ افراد کو راحت بہم پہنچانے میں اپنے آپ کو ہمہ تن
رکھا۔ علاوہ ازیں یہ سوسائٹی جنگ کے دوران بیماروں اور زخمیوں کی مدد کا کا
کرتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اس سوسائٹی نے بیس ہزار بنے ہو
اونی کے ملبوسات ہر ہفتہ جنگی قیدیوں کی مدد کیلئے یوروپ کو روانہ کئے جاتے رہے
۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی ہند و پاک لڑائیوں کے دوران ہندوستان کے کیمپس میں پا
پاکستانی افراد کو بھی پابندی کے ساتھ تحفوں کے پارسل دیے گئے انڈین ریڈ کراس کے
کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر شیش کا کہنا ہے کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم قدر
انسانی وجوہات کی بنا پر پیش آئے مصائب و آلام کے اوقات مدد کرنے کے کام
تیز رفتاری سے انجام دیا ہے لیکن انتہائی خصوصیت کا حامل کام ریڈ کراس کے
اور مقصد کو مدارس اور کالجس کے طلبا میں عام کرتا ہے تاکہ مستقبل میں بہترین شہر
کو تیار کیا جا سکے۔

زمانہ حال سے وابستہ ترقی یافتہ خدمات کی کارکردگی میں خواندگی کو فروغ
کا کام بھی انڈین ریڈ کراس کا ایک اہم طرۂ امتیاز ہے۔ بچوں کی زندگی کو تازگی
علاوہ بہت ہی اہم کام ہے جس کا پراجکٹ ۱۹۸۷ء میں ہریانہ میں آغاز کیا گیا اور ...

ریاست اتر پردیش اور شہر کلکتہ میں اسکی توسیع عمل میں لائی گئی اس پراجکٹ کا مقصد قوم کو میز اور ٹیکہ کے ذریعہ محافظت کیجاتے والے امراض کے بارے میں معلومات کی فراہمی ہے انڈین ریڈ کراس سوسائٹی ماں اور بچے کی محافظت کیلئے تیس دوا خانے اور تین سو پچاس کلینک ملک بھر میں چلانے کے کام میں مصروف ہے۔ علاوہ ازیں پچیس خاندانی بھلائی کے کلینک قائم ہیں جہاں تو بیاہی جوڑوں کو خاندانی بہبود کے طریقہ کار کو روبہ عمل لانے کی ہدایات دی جاتی ہیں۔

انڈین ریڈ کراس سوسائٹی کا قیام ۱۹۲۰ء میں عمل میں لایا گیا تھا وہ آج اپنی ڈائمنڈ جوبلی منانے کے مرحلہ میں ہے اسکی ملک بھر میں قومی سطح پر چھ سو پچاس سے زاید شاخیں قائم ہیں جسکے مجموعی اراکین کی تعداد بیس لاکھ ہے جسکے علاوہ تین ملین مدارس اور کالجس کے طلباء بھی اسکے رضاکار ہیں کی۔جو بیماری فی زمانہ دنیا میں پھیلی ہوئی ہے طبی سہولتوں کے ہر پہلو کو خوف زدہ کئے ہوئے ہے چنانچہ ریڈ کراس بلڈ بنک تنقیدی نقطۂ نظر سے دوا خانوں کو خون کی فراہمی کا اہم کردار ادا کر رہا ہے خون کا عطیہ دینے والوں کی اسکیم بالکلیہ خود مختارانہ اور رضاکارانہ ہے اور مختلف گروپوں میں خون کا عطیہ دینے کی تشہیر اور صحت مند افراد کے مابین کرنے پر مبنی ہے۔

ریڈ کراس بلڈ بنک ملک کے دواخانوں کو صحت مند خون کی فراہمی کے سلسلہ میں انتہائی اہم کردار ادا کر رہا ہے دوسرا اہم کام جو انڈین ریڈ کراس سوسائٹی نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ گمشدہ افراد کی تلاش ہے۔ قدرتی آفات اور جنگی تخریبات کی وجہ سے خاندانوں میں جو بچھڑاؤ عمل میں آتا ہے اس سلسلہ میں انڈین ریڈ کراس سوسائٹی پریشان حال افراد کو راحت بہم پہونچانے ہوئے پریشان حالوں کی پریشانی حل کرتے ہیں ممد معاون ہے۔

بین الاقوامی سطح پر کام کے مختلف پہلو پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے طور سے متعلق ہوتا ہے اسلئے لبنان کے جنگی علاقوں میں طبی سہولتوں کی فراہمی کیلئے

متحرک دواخانے قائم ہیں۔ امریکہ، آسٹریلیا اور فلپائن میں مدد اور مشاورت
سابق خدمت گار موجود ہیں۔ برٹش سوسائٹی معذور بچوں کی مدد کرتی ہے
میں جسمانی اور دماغی اعتبار سے معذور بچوں کے لیے گرمائی کیمپ چلائے جاتے
آسٹریلیا کی سوسائٹی ایسے معذور افراد کی مدد کرتی ہے جو دماغ اور جسمانی
مابین ربط میں خلل واقع ہونے سے متاثر ہیں۔ مذکورالصدر سوسائٹیز کے علاوہ
مخصوص خدمات پر مشتمل سوسائٹیز بھی ہیں۔ بلجیم ریڈکراس غاروں میں پناہ گزینوں
کی مدد کرتی ہے۔ فرانسیسی سوسائٹی نرسس کی خدمات کیلئے مشہور ہے اٹلی
شاہراہی حادثات کی صورت میں امدادی خدمات کی سہولت حاصل ہے۔
والوں کے پاس قیدیوں سے ملاقات کے پروگرام میں مدد اور سوئٹزرلینڈ میں
پناہ گزینوں کی مدد کے پروگرام کا مرکز موجود ہے اور تھائی لینڈ میں سانپوں کی
اور نگہداشت کا مرکز قائم ہے۔ جہاں سانپ کے کاٹنے کے علاج کیلئے دوا
دنیا کے مختلف ممالک کو روانہ کیجاتی ہے۔ سویڈن ریڈکراس سوسائٹی
جے ہنری ڈونانٹ دواخانے کی سہولیتں موجود ہیں جہاں سماج سے بچھڑے
تنہائی میں زندگی بسر کرنے والے اور طویل بیماریوں میں مبتلا افراد کی مناسب مدد
ہنری ڈونانٹ کو بہت بڑی خوشی اس بات کی ہوگی کہ ریڈکراس نے کئی بار
انعام حاصل کیا ہے۔ جن میں پہلا انعام ۱۹۱۷ء میں، دوسرا ۱۹۴۴ء میں اور تیسرا
اور قریب زمانہ حال یعنی ۱۹۹۰ء میں حاصل کیا گیا ہے۔

ہنری ڈونانٹ کا امن اور نیک خواہشات پر مبنی آمانہ اقوام عالم کے
ہمیشہ کیلئے جاری رہیگا۔

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

جلد ۱۲ — شمارہ ۸

اگست ۱۹۹۵ء

قیمت : ۶ روپے

ایڈیٹر محمد قمرالدین صابری — جائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر : قدیر انصاری

:- زر تعاون :-

ہندستان	سالانہ	۶۵ روپے	۲ سال	۱۲۰ روپے	تاحیات ۵۰۰ ر
خلیجی ممالک	"	۲۰۰ "		۳۶۰ "	۳۷۰۰ "
امریکہ	"	۴۰ ڈالر		۷۰ ڈالر	۷۰۰ "
انگلستان	"	۲۵ پونڈ		۴۵ پونڈ	۴۰۰ "
پاکستان	"	۱۵۰ پاکستانی روپے		۳۰۰ روپے	۲۰۰۰ پاکستانی "

:- ترسیل زر کا پتہ :-

ماہنامہ "شاداب" 5-1-147 ، ریڈہلز، حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے
پبلک پرنٹرس، چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" 5-11-147 ریڈہلز حیدرآباد
اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

انسانی شرافت و عظمت

اسلام کا نوعِ بشری پر ایک بڑا احسان انسان کی شرافت و عظمت اور اس کے علوِّ منزلت کا اعلان ہے۔ بعثتِ محمدی سے پہلے انسان ذلت و نکبت کی پستی میں گر چکا تھا۔ اور روئے زمین پر اس سے زیادہ ذلیل و حقیر چیز نہیں رہ گئی تھی۔ بعض مقدس حیوان اور اشجار جن سے اساطیری (LEGENDARY) روایات اور معتقدات وابستہ تھے وہ اپنے پرستاروں کے نزدیک زیادہ مکرم و محترم تھے۔ اور انسان کے مقابلے میں انہیں حفاظت کا زیادہ مستحق سمجھا جاتا تھا خواہ اس کے لیے معصوم سے معصوم بچوں کو بھی نہ بہانا پڑے ایسے شجر و حجر کے لیے انسان کا خون اور گوشت بھی بے تکلف اور بغیر کسی خوف کے پیش کیا جاتا تھا ہم نے اس کی عبرتناک تصویریں اس بیسویں صدی میں ہندوستان جیسے بعض ترقی یافتہ ملک میں بھی دیکھی ہیں۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کو اس کی شرافت و عظمت واپس کی اور اس کا کھویا ہوا وقار و اعتبار بحال کیا اور یہ اعلان کیا کہ انسان اس کائنات کا سب سے قیمتی وجود اور گرانقدر جوہر ہے۔ اور یہاں اس سے زیادہ با عظمت اور محبت و حفاظت کا مستحق کوئی اور شخص نہیں۔ آپ نے انسان کا مرتبہ اتنا بلند کیا کہ وہ اللہ کا خلیفہ قرار پایا جس کے لیے اس نے دنیا پیدا کی اور سب کچھ مسخر کیا۔

هوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (البقرة - ۲۹)

ترجمہ: وہ وہی (اللہ) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب

قرآن نے انسان کو اشرف المخلوقات اور صدر کائنات بتایا۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰهم فی البر والبحر ورزقنٰهم من الطیبٰت وفضلنٰهم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا ہ

ترجمہ: اور ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی اور ہم نے انہیں خشکی اور دریا دونوں میں سوار کیا۔ اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں۔ اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی (الاسراء - ۷۰)

اور اس ارشاد نبوی سے زیادہ انسان کی عزت وعظمت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ (بیہقی)

الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ

خدا کی مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کو مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔

انسانی رفعت اور اس کی خدمت کے ذریعہ تقرب الٰہی حاصل کرنے کے سلسلہ میں یہ حدیث بہت بلیغ اور معنی خیز ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ سے روایت کیا ہے کہ:-

"اللہ تعالیٰ قیامت میں پوچھیں گے اے ابن آدم! میں بیمار پڑا۔ مگر تو نے میری عیادت نہیں کی، آدمی کہے گا، یارب! آپ تو رب العالمین تھے، میں آپ کی عیادت کیسے کرتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تمہیں علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اگر تم نے اس کی عیادت نہیں کی، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اگر تم اس کی عیادت کرتے تو

مجھے اس کے پاس پاتے۔

اے ابن آدم! میں نے تم سے کھانا مانگا تو تم نے مجھے کھلایا نہیں ؟ آدمی کہے گا کہ بارالٰہا! آپ تو دنیا کے پالن ہار تھے میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا۔ ؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا مگر تم نے اسے کھانا نہیں دیا۔ اگر تم اسے کھلاتے تو مجھے ۔۔۔ اس کے پاس پالیتے" اے ابن آدم! میں نے تم سے پانی مانگا مگر تم نے مجھے پانی نہیں دیا' آدمی کہے گا خدایا! آپ تو رب العالمین ہیں! میں آپ کو پانی کیسے پلاتا' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے پانی مانگا مگر تم نے اسے پانی نہیں دیا۔ اگر تم اسے پانی پلاتے تو مجھے اس کے قریب پاتے (صحیح مسلم)

کیا انسانی رفعت وعظمت کا اس سے زیادہ واضح اور صریح کسی اعلان کا تصور کیا جا سکتا ہے جسے دین توحید نے پیش کیا ہے۔ اور دنیائے قدیم وجدید کے کسی دین و فلسفہ کے تحت انسان نے کبھی ایسی عظمت ومنزلت حاصل کی ہے ؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدم زادوں (انسانوں) پر رحم کرنے کو اللہ کی رحمت کے نزول کی شرط لازم بتلاتے ہوئے فرمایا۔

الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (سنن ابی داؤد)

رحم کرنے والے پر رحمن بھی رحم کرتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحمت کرے گا۔

کرو مہربانی تم اہل زمین پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

حرمت انسانیت اور عظمت انسانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس کے بیلے بعد وجہد سے پہلے دنیا کی سیاسی و اجتماعی حالت کا کچھ اندازہ کرنا

ضروری ہے

آپ کی بعثت سے پہلے ایک ایک فرد کی مرضی پر ہزاروں انسانوں کی زندگیاں موقوف رہتی تھیں، کوئی بادشاہ اٹھتا اور ملکوں اور قوموں اور کھیتوں اور آبادیوں کو پامال کرتا چلا جاتا، اور راجپوت یا سیاسی گروہ کی خود غرضانہ جنگ دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا۔

سکندر اعظم (ALEXANDER-THE GREAT) (۳۵۶-۳۲۳ ق م)

آندھی پانی کی طرح اٹھتا ہے اور ایران، شام، ساحلی ممالک، مصر اور ترکستان کا بڑا حصہ زیر نگیں کرتا ہوا شمالی ہند پر پہنچ جاتا ہے وہ فتح و تسخیر کے اس طویل سفر میں صدیوں کی قدیم اور ترقی یافتہ تہذیبوں اور تمدنوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

جولیس سیزر (JULIUS CAESAR) (م ۴۴ ق م) اور دوسرے فاتحین اور فوجی قائدین جیسے قرطاجنہ (CARTHAGE) کا ہنی بال (HANNIBAL)

(۲۴۷-۱۸۳ ق م) اور دوسرے فوجی قائد اور کشور کشا انسانی آبادیوں میں اس طرح شکار کھیلتے ہیں، اور ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتے چلے جاتے ہیں جیسے شائق شکاری بلا امتیاز جنگلی جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔

قتل و غارت گری اور انسانی زندگی کی بے وقعتی کا سلسلہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے بعد بھی جاری رہا، چنانچہ ان کے بعد کے انسانیت پر ظلم ڈھانے والوں اور سنگ دلوں میں نیرو (NERO) (م ۶۸ء) جیسے لوگوں نے اپنے ہم وطنوں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنایا، اور اپنی ماں اور بیوی کو بھی نہیں بخشا، یہی شخص روما کی عظیم آتش زدگی کا بھی ذمہ دار ہے، جب روما آگ کے شعلوں میں جل رہا تھا تو وہ چین کی بانسری بجا رہا تھا۔

(انسائیکلوپیڈیا ولیم لینگر)

یورپ کے وحشی قبائل یعنی مغربی و مشرقی گاتھ اور ونڈال وغیرہ، جو بعثت محمدی سے ایک صدی قبل پانچویں صدی مسیحی میں سرگرم تھے، وہ دنیا کی ترقی یافتہ تمدن و آبادیوں کو تاراج کر دیتے اور ...... روئے زمین پر بڑے پیمانے پر خوف اور

وحشت پھیلاتے تھے۔ (انسائیکلو پیڈیا ولیم لینگر)

عربوں کی نظر میں انسانی زندگی کی قدر وقیمت اتنی کم تھی کہ جنگ اور خونریزی.... ان کے لیے ایک کھیل بن گئی تھی، اور معمولی سا واقعہ بھی جنگ کا محرک بن جاتا تھا، چنانچہ بنو وائل کے دو قبیلوں بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا جس میں پانی کی طرح خون بہا، بات صرف اتنی تھی کہ کلیب (رئیس معد) نے بسوس بنت منقذ کی اونٹنی کے تھن پر تیر مار دیا تھا، جس سے اس کا خون دودھ میں مل گیا تھا۔ اس کے باعث جساس بن مرہ نے کلیب کو قتل کر دیا، اور بکر و تغلب میں جنگ چھڑ گئی۔ اس خانہ جنگی کے بارے میں کلیب کا بھائی المہلہل کہتا ہے۔

"انسان فنا ہو گئے، مائیں بے اولاد ہو گئیں، بچے یتیم ہو گئے، آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے، اور مردے بے کفن و دفن پڑے رہیں۔"

اسی طرح داحس و غبرا کی جنگ کا سبب یہ ہوا کہ داحس جو قیس بن زہیر کا گھوڑا تھا، وہ قیس اور حذیفہ بن بدر کے درمیان مقابلہ میں آگے نکل گیا تھا جس پر ایک اسدی نے حذیفہ کے کہنے پر گھوڑے کو چھیڑا اور اس کے چہرہ پر طمانچہ مارا اور اس وجہ سے وہ گھوڑا پیچھے رہ گیا۔

اس واقعہ کے بعد قتل و انتقام اور قبائلی جنگ، قید و بند اور قبیلوں کے ترک وطن کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور اس میں ہزاروں آدمی مارے گئے۔ (ایام العرب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے غزوات کی کل تعداد ستائیس ۲۷ یا اٹھائیس ۲۸ ہے اور سرایا کی تعداد ساٹھ تک پہونچتی ہے ان میں جنگی تدبیروں کو دیکھتے ہوئے سب سے کم خون بہایا گیا۔ ان میں طرفین کے صرف ۱۰۱۸ آدمی مارے گئے اور ان غزوات کا مقصد انسانی جانوں کی حفاظت، انسانی مفادات کا دفاع تھا اور اسلام کی [illegible] اخلاق [illegible] اور [illegible] تعداد [illegible] کی اس طرح پابند تھیں۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

ان عائشۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت دخل رھط من
الیھود علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا السام علیکم
قالت عائشہ ففھمتھا فقلت علیکم السام واللعنۃ
قالت فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مھلا یا عائشۃ ان اللہ
یحب الرفق فی الامر کلہ
فقلت یا رسول اللہ الم تسمع ما قالوا؟
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد قلت علیکم
(صحیح بخاری۔ کتاب الادب۔ باب الرفق فی الامر کلہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک
یہودیوں کا ایک گروہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے کہا۔
السام علیکم (آپ پر موت واقع ہو)
حضرت عائشہ کہتی ہیں، میں نے ان کی یہ بات سمجھ لی تھی، چنانچہ میں نے جواب میں
تم پر موت بھی واقع ہو اور لعنت بھی۔
یہ الفاظ سن کر آنحضرت نے فرمایا۔ عائشہ ٹھہرو (خاموش رہو، بے شک اللہ

میں نرمی کو پسند فرماتا ہے

میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ نے ان کی بات نہیں سنی ؟

فرمایا : میں نے جواب میں کہہ تو دیا تھا کہ تم پر واقع ہو۔

یہ حدیث صحیح بخاری کی کتاب الادب میں بھی ہے اور کتاب الاستیذان میں بھی؛ کتاب الاستیذان میں یہ الفاظ " یا الفاظ " باب کیف الرد علی اہل الذمۃ السلام " میں بیان ہوئے ہیں۔

اپنے معنی و مفہوم میں حدیث کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث مختلف کتب احادیث میں متعدد صحابہ سے مروی ہے۔ طبرانی میں حضرت زید بن ارقم کی روایت سے بتایا گیا ہے کہ ایک دن وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اہل یہود کا ایک شخص آیا جس کا نام ثعلبہ بن حارث تھا اور وہ بڑا بدزبان تھا۔ اس نے آتے ہی آنحضرت کو " السام علیک یا محمد " (اے محمد! آپ پر موت واقع ہو) کہا۔ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا : " وعلیکم۔" (تم پر)

یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے، جہاں صحابہ کرام بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، اور اس مجلس میں بھی چند صحابہ تشریف فرما تھے، جن میں یہ واقعہ پیش آیا۔ مدینے کے قرب وجوار میں مختلف قبائل اور بستیوں میں صحابہ کی کثیر جماعت فروکش تھی۔ اور یہ وہ صحابہ تھے جو آنحضرت پر جانیں نچھاور کرتے تھے، آپ کے ہر ارشاد و فرمان پر عمل پیرا ہو اور ہمیشہ حکم دیتے اس کے ہر گوشے اور ہر شوشے کو دل و جان سے تسلیم کرتے تھے۔ آنحضرتؐ بھی ان سے بہ درجہ غایت پیار اور محبت کا برتاؤ فرماتے اور ان کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔

لفظ " سام " کے معنی ہیں موت اور ہلاکت۔ یعنی کسی کے لیے بربادی اور تباہی

[illegible]

یہودی آنحضرتؐ اور مسلمانوں سے شدید نفرت کا اظہار کرتے تھے اور اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ ان کا یا کسی اور غیر مسلم کا آنحضرتؐ کو اس انداز سے خطاب کرنا ظاہر ہے کہ نہایت گستاخانہ انداز ہے، لیکن آپؐ نے اس پر نہ کسی کی گرفت کی اور نہ کسی کو برا بھلا کہا۔ صحابہ کرام میں سے کسی کو ترش لہجے اور سخت زبان میں ان کا جواب دینے کی اجازت دی۔ بلکہ جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں صراحت فرمائی گئی ہے، آنحضرتؐ نے جواب میں سخت لفظ استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

یہ حدیث ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ جب یہودیوں کی ایک جماعت آنحضرتؐ کے پاس آئی، اس وقت حضرت عائشہؓ گھر میں موجود تھیں اور ان لوگوں کے "السام علیکم" کے الفاظ پڑھے کے پیچھے سے ان کے کانوں میں پڑے تو ان کو نہایت تکلیف ہوئی، اسی بنا پر انھوں نے آنے والے یہودیوں کو "السام علیکم" بھی کہا اور ساتھ ہی "واللعنۃ" بھی کہا، یعنی "علیکم السام واللعنۃ" کہ تم پر موت بھی واقع ہو اور لعنت بھی۔!

بظاہر یہ الفاظ کہنے میں حضرت عائشہؓ حق بجانب تھیں، اس لیے کہ وہ آنحضرتؐ کی بیوی تھیں اور کوئی وفادار اور عالی کردار بیوی اپنے شوہر کے لیے اس قسم کے غیر مہذبانہ اور بدتمیزانہ الفاظ کسی بھی زبان سے نہیں سن سکتی اور اگر کوئی اس قسم کے الفاظ زبان سے نکالے تو برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر آنحضرتؐ کو یہ منظور نہ ہوا کہ کوئی گستاخی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرے تو اسی قسم کا اسے جواب دیا جائے۔ مردانگی، تحمل، بردباری اور رحمت و رافت کا تقاضا یہ ہے کہ سختی کا جواب نرمی سے اور گستاخی کا جواب محبت سے دیا جائے۔ اگر دونوں فریق ایک ہی قسم کی زبان بولنے لگیں تو دونوں میں فرق کیا ہو!؟

قرآن مجید نے اپنے پاکباز بندوں کی جو اصل خوبی بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے۔

وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما ○ (الفرقان: ۶۳)

اور اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نہایت فروتنی اور عاجزی سے چلتے ہیں اور جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان سے بھی سلامتی کی بات کرتے ہیں۔

یعنی وہ انتہائی وقار، متانت اور امن و سکون سے زندگی گزارتے ہیں، کسی کی دل شکنی نہیں کرتے، کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے اور کسی کے درپے آزاد نہیں ہوتے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی جہالت زدہ اور اکھڑ طبیعت کا آدمی ان سے ناروا سلوک کرتا ہے تو اس کے لیے بھی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

اسلام درحقیقت امن اور سلامتی کا مذہب ہے اور لوگوں کو اسی کی تلقین کرتا ہے۔ مار دھاڑ، سختی، تشدد اور دائرہ تہذیب سے ہٹی ہوئی گفتگو، اسلام کے مزاج اور اس کی تعلیم کے قطعاً منافی ہے۔ لوگوں کے لیے ذہنی سلامتی، فکری سلامتی جسمانی سلامتی، معاشی، مالی اور معاشرتی سلامتی کے حالات پیدا کرنا اسلام کا مقصود اولین ہے۔ وہ صاف ستھری ثقافت کا بانی اور داعی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا عملی مظہر تھے۔ آپ نے اپنی حیات طیبہ کے مکی دور میں بھی اہل اسلام کی اس نتھری ہوئی تہذیب، صاف ستھری تعلیم اور بہترین ثقافت کو ملحوظ خاطر رکھا اور مدنی عہد زندگی میں بھی اپنے تمام اعلیٰ اختیارات حکمرانی کے باوصف اسے مدار عمل ٹھرائے رکھا۔ اگر کسی کی غلط بات کا بہ امر مجبوری جواب دینا فروری بھی سمجھا تو پیرایہ اظہار نہایت پر وقار اور طرز ادا انتہائی متانت اور سلجھاؤ کی آئینہ دار ہے۔

اسی حدیث پاک کے الفاظ پر غور کیجئے۔ یہودیوں نے آپؐ کو مخاطب کر کے کہا۔

السام علیکم کہ آپ (نعوذ باللہ) موت اور ہلاکت سے دوچار ہوں۔ آپ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ " علیکم السام " (تم پر بھی موت کا حملہ ہو)

بلکہ فرمایا " علیکم " " تم پر " ۔

یہ نہایت مختصر الفاظ ہیں اور بہ درجہ غایت توازن کے حامل! آپؐ نے " سام "

(موت یا ہلاکت) کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔ اور پھر "علیکم" (تم پر) کا لفظ بھی اس درجے آہستگی سے زبان مبارک سے نکالا کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی سن نہیں سکیں، جب کہ انہوں نے یہودیوں کے الفاظ اچھی طرح سن لیے تھے۔ ان کو بھی آپؐ ہی نے بتایا کہ میں نے یہ لفظ کہا ہے۔ ارشاد ہے "قد قلت علیکم" کہ میں نے کہہ تو دیا "تم پر۔"

ایک نکتہ اس میں یہ پنہاں ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی نے خفگی کے عالم میں یہودیوں سے کہا کہ "علیکم السام واللعنتہ (تم پر موت بھی آئے اور پھٹکار بھی) تو آنحضرتؐ نے یہ الفاظ پسند نہیں فرمائے۔ آپؐ نے حضرت عائشہ کو اس قسم کے الفاظ زبان سے نکالنے سے روکا اور فرمایا۔

"مہلاً یا عائشۃ (عائشہ ٹھہرو) یعنی یہ اسلوب تخاطب پسندیدہ نہیں، اس سے باز رہو۔

پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند فرماتا ہے۔ مطلب یہ کہ تم بھی نرمی سے کام لو اور بردباری کا مظاہرہ کرو۔

امام بخاری کی فقاہت ملاحظہ ہو کہ انہوں نے یہ حدیث کتاب الادب میں درج کی ہے، جس سے مقصد یہ ہے کہ ہر معاملے میں ادب و متانت کے تقاضوں کو پیش نگاہ رکھنا چاہیئے۔ اس کا ذیلی عنوان قائم کیا ہے۔ "باب الرفق فی الامر کلہ" کہ تمام مسائل و امور میں نرمی اختیار کرنے کا باب۔!

باب کے وہی الفاظ ہیں جو حدیث میں مذکور ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ہیں۔

یہاں یہ ذہن میں رہے کہ کسی موضوع کی وضاحت و صراحت کے لیے کتب حدیث میں جو "کتاب" کا لفظ لایا جاتا ہے، مثلاً کتاب الصوم، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الادب، کتاب الحدود وغیرہ، اس کے معنے میں ہیڈنگ یا چیپٹر کے ہیں۔ اس کے جو ذیلی یا ضمنی

یا سب ہیڈنگ ہیں، ان کے لیے "باب" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس حدیث کا جو ابتدا میں درج کی گئی ہے، امام بخاری نے مین ہیڈنگ (بڑا عنوان) کتاب الادب قائم کیا ہے، جس کے بہت سے ذیلی عنوانوں میں سے ایک عنوان "باب الرفق فی الامر کلہ" ہے، اور امام بخاری نے یہ حدیث اسی عنوان کے تحت بیان کی ہے۔

ادب کا مطلب ہے، قول و عمل میں اچھائی کا مظاہرہ کرنا۔ عمدہ کردار اور حسن اخلاق کا ثبوت دینا، تعظیم و تکریم سے پیش آنا اور ہر معاملے میں شرافت و نجابت کو مطمع نظر قرار دینا۔

آنحضرتؐ کی ذات اقدس سے مسلمانوں کو کس درجے تعلق و عقیدت اور محبت والفت کا اظہار کرنا چاہیے، اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ آپ کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود اپنی اطاعت و فرماں برداری کے ساتھ دیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اللہ کی اطاعت اسی صورت میں نتیجہ خیز اور ذریعہ نجات ہو سکتی ہے، جب کہ اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا دم بھرا جائے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کی جائے گی تو اللہ کی اطاعت بھی نہیں ہو سکے گی۔

(۷)

کہ نوع انسانی کے حق میں تعذیب کے بجائے تادیب کا حکم رکھتی تھیں (نبی رحمت)

اسلام ایمان اور اپنی اخلاقی تعلیمات کے ذریعہ انسان کی عظمت و شرافت کا ایسا شعور پیدا کرتا ہے جس سے ایک مسلمان اس معاملہ میں بہت زود حس ہو جاتا ہے وہ انسان کو کسی حال میں جانوروں کے درجہ میں نہیں اتارتا اور نہ وہ ان سے جانوروں جیسا سلوک پسند کرتا ہے، اور نہ انہیں اپنے ذاتی تفوق کے لیے غلام بناتا ہے وہ اپنے اور دوسرے انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھتا کہ ان سے توہین آمیز سلوک کرے۔ ○○ ماخوذ از۔ تہذیب و تمدن پر اسلام کے احسانات)

سید حامد
تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۲

اردو یونیورسٹی

اردو یونیورسٹی کا جب ذکر چھڑا تو معترضین طنز سے مسکرائے۔ سرکار اردو کے سادہ لوحوں پر ایک اور حربہ آزمانے جا رہی ہے۔ کمیٹی کی پہلی میٹنگ میں راقم السطور نے اپنے شبہات کا اظہار کیا اور اس نرالی وضع تعمیر کو ٹھنڈے طنز سے داد دی کہ چھت کو فضا میں معلق کیا جا رہا ہے اور اس کو تھامنے کے لیے نہ دیواریں ہیں نہ بنیادیں۔ اردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی طرف سے غفلت اور اس کی اعلا تعلیم کی طرف التفات۔ یونیورسٹی کو اردو کے طالب کہاں سے ملیں گے؟ آگے چل کر یہ امید پیدا ہوئی کہ جو یونیورسٹی زیر تجویز ہے وہ ان عام یونیورسٹیوں سے بہت مختلف ہو سکتی ہے جن میں اردو کی اعلا تعلیم دی جا رہی ہے۔ کمیٹی نے کثرت رجحان سے اپنی ہمت اس مقصد پر مامور کر دی کہ اردو یونیورسٹی روایتی شکنجے اور ڈھانچے سے آزاد رہے گی۔ وہ "اوپن" یا ناوابستہ اور کشادہ ہوگی۔ اس کے دفتر بہت سے ورق اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کی کتاب سے ملیں گے۔ ڈھالی وہ اسی نہج پر جائے گی؟ تاہم اردو اور اردو والوں کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے اس میں ایسی ترمیم کی جائیں گی جو درکار ہوں۔ ... کمیٹی نے بتدریج یونیورسٹی کو اس کے ابتدائی تصور سے آگے بڑھا دیا، اس میں وسعت، کشادگی اور لچک پیدا کی اور اس کے دائرہ فیض رسانی کو وسیع کر دیا۔ ابتدائی تصور کو اس نے گل کوزہ گر کی طرح استعمال کیا۔ مٹی کو خوب گوندھا،

ے پر رکھا اور کمہار کے سبک ہاتھوں نے اسے ایک نئی شکل دے دی۔

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

ناسپاشکر ہے کہ جو شے مطلوب تھی بالآخر وہی پردۂ تقدیر کے پیچھے سے نمودار ہوئی ؟

ے پردۂ تقدیر کے پیچھے تدبیر کا ہاتھ بھی تھا۔

یہ بات تو آغازِ داستان میں ہی طے ہوگئی تھی کہ اردو یونیورسٹی میں سارا زور زبان پر

کا اردو ادب اور تنقید سے اغماض برتے گی۔ وجہ ظاہر ہے اردو ادب اور تنقید بفضلہ

ہت سی یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی مان لی گئی ہے کہ بوجوہ اردو کی

علا تدریس اور تحقیق کا حق یونیورسٹیاں بالعموم ادا نہیں کر پا رہی ہیں ... . اردو زبان

صاً اردو نثر کے ارتقا پر زبان کو نظرانداز کرنے کا اثر پڑا ہے علوم کا سرمایہ جس حد تک

اردو میں منتقل ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا۔ سفارشات میں اس کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ اہم

علوم کی تدریس و تحقیق اردو میں ہو اور انگریزی اور ہندی زبانیں لازمی طور پر پڑھائی جائیں۔

اردو والوں کے لیے فاصلے سے تعلیم، خصوصاً موزوں ہے۔ ایک تو ان میں بیچ میں مجبوراً ہی

تعلیم چھوڑ دینے والوں کی کثرت ہے۔ اب وہ ڈسٹنس ایجوکیشن کی بدولت گھر بیٹھے تعلیم

حاصل کر سکیں گے۔ ڈراپ آوٹ کرنے والوں سے بھی زیادہ فائدہ ان مستورات کو پہنچے گا

جو یا تو سماجی پابندیوں یا افلاس کی وجہ سے عام اسکولوں میں داخلہ نہیں لے سکتیں۔ ایک لحاظ سے

یہ غیر رسمی وضع سے بہتر ہے کیوں کہ اس میں دیے گئے سبق ہندوستان کی تعلیمی دنیا کے بہترین

ذہنوں سے تیار کیے ہیں۔ اندرا گاندھی یونیورسٹی نے کمال فراخ دلی کے ساتھ پیش کش کی

ہے کہ اس کے تیار کیے ہوئے تعلیمی مواد کو اردو یونیورسٹی نقل زبانی کے بعد استعمال کر سکتی ہے

یونیورسٹی کی یہ اسکیم ان سروس (دوران ملازمت) تعلیم و تربیت کے بخوبی کام آئے گی۔ اس کا

فیض خاص طور پر ان لوگوں کو پہنچے گا جو زیر ملازمت ہیں اور کم خواندہ ہونے کی وجہ سے

اپنے شعبہ میں ترقی نہیں کر پائے۔

آپ دریافت کریں گے کہ جن لوگوں نے اُردو مدرسے سے پڑھی ہی نہیں یا بہت پڑھی ہے، یونیورسٹی کی سطح تعلیم ان کے لیے بہت اونچی اور بے کار ثابت ہوگی۔ اس پہ ملحوظ رکھتے ہوئے کمیٹی نے سفارش کی کہ ایک اوپن اسکول کو یونیورسٹی کا جزو لاینفک دیا جائے۔ اگر یہ سفارش منظور ہو گئی اور وزارت تعلیم نے ضروری احکام جاری کر دیے تو اُردو میں تعلیم کا تسلسل قائم کر سکے گی اور اس کے ذریعہ اُردو بولنے والوں کے ایک بڑے کو تعلیمی فیض پہنچے گا اور اگر ایسا نہیں ہوا تو یونیورسٹی کے قیوض سمٹ کر اور سکڑ کر رہ اور اُردو زبان کے فروغ پر یونیورسٹی کے قیام کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہم امید کر ملحق اوپن اسکول کی اہمیت کو ارباب اختیار محسوس کریں گے اور تھوڑا سا صرفہ بچانے کے ایک بڑے صرفے کو بے سود بنانے سے حذر کریں گے۔

یہ سوچ کر کہ اُردو بولنے والوں میں ایک معقول تعداد ان لوگوں کی ہے جو گھریلو کرتے ہیں، کاریگر یا کارخانہ دار ہیں، کمیٹی نے بہت سے شہروں میں اُردو زبان کے ذر مختلف حرفتوں یا (کرافٹس) کی تربیت کی سفارش کی ہے۔ گویا اردو کی تعلیم کو کارگزار (فنکشنل) رخ دیا گیا ہے۔ تعلیم کے مادی فوائد کا تجربہ کرنے کے بعد یہ دستکار خو کی پیروکاری کرنے لگیں گے۔

یونیورسٹی کہاں قائم ہو، اس پر بہت دنوں تک بحث ہوتی رہی۔ دراصل جہاں تک یونیورسٹی کا تعلق ہے، عوام نے اس کی ساخت اور نوعیت سے متعلق سوالات کو در نہیں سمجھا اور مقامی وفاداریوں کے زیر اثر یونیورسٹی میں طلب دلچسپی لی تو صرف اتنی کہ ان کے شہر میں کھولا جائے۔ کمیٹی نے دہلی، حیدرآباد یا بنگلور کی سفارش کی تھی۔ حکومت نے حیدرآباد کو منتخب کیا۔

یونیورسٹی میں تحقیق و تدریس کی اہمیت اس وضع کی فیصلہ کن نہیں ہو گی جو پر

ریڈروں اور لکچروں کے تقریباً معینہ تناسب پر مشتمل ہوتی ہے۔ عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ ڈھانچہ رسمی اور سطحی تعلیم و تحقیق کو فروغ دیتا ہے اور فیکلٹی بسا اوقات نامنفعل افراد کی آرام گاہ بن جاتی ہے۔ اُردو یونیورسٹی کا ڈھانچہ مختلف ہوگا۔ یونکلیس یا کورسٹاف کے علاوہ تعلیم و تحقیق کی ذمہ داری مشیروں یا (کنسلٹنٹس) کے سپرد کی جائے گی تاکہ بہترین صلاحیتیں بروئے کار آئیں اور یونیورسٹی ناموزونوں کی آماجگاہ نہ بن جائے۔ اس کا تعلق صرف ان اساتذہ سے رہے جو اپنی موزونیت اور دلچسپی ثابت کر پائیں۔

یونیورسٹی کو برائے بیت یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ بعض ایسے اداروں کو اپنے ساتھ ملحق کر سکے جس کے الحاق کی کوئی دوسری سبیل نہ ہو۔ تصور کیا گیا ہے کہ یہ اختیار شاذ ہی استعمال کیا جائے گا۔

ابھی تک آپ نے اُردو یونیورسٹی کی شانِ نزول دیکھی ہے اور اس کے خط و خال" لیکن اس کی شکل بالآخر کیا نکلے گی اس کے بارے میں آپ قیاس نہیں کر سکتے۔۔۔۔ اول تو پتا نہیں کہ بل ایکٹ بنتے بنتے، ترمیم، تنسیخ اور اضافہ کے کن کن مراحل سے گزرے پارلیمنٹ کے دروازے میں بل کے داخل ہونے سے پہلے بھی فائننس منسٹری (وزارت مالیات) پلاننگ کمیشن اور افرادی طاقت کی وزارت نے مل کر اور الگ الگ اس کا نقشہ بدل ڈالا۔ لیکن راقم السطور کی نگاہ میں وہ تبدیلیاں اگر کوئی جو ایوان کی مجموعی فراست عمل میں لائے ایک دوسرے عنصر کے مقابلے میں غیر اہم ہوں گی۔ یہ مسئلہ افرادی طاقت کا ہے۔ یونیورسٹی بنتی ہے یا بگڑتی ہے یہ بات اس کے پہلے وائس چانسلر پر منحصر ہوگی۔ اگر اس کا تقرر اہلِ سیاست کے گوشۂ خاطر کا مرہونِ منت ہے، اگر وہ اس منصب کو دوسرے تعلیمی یا انتظامی مناصب سے مشابہ یا ان کے مساوی سمجھتا ہے اگر اس کے قویٰ میں اضمحلال آ چکا ہے اگر اس کی شخصیت کے لیل و نہار نے پژمردہ، نڈھال، کم ہمت اور عافیت طلب بنا دیا ہے۔ اگر یونیورسٹی کو اس کی ضرورت نہیں، اس کو یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اگر اس میں

اور طلبہ سازی کی صلاحیت نہیں ہے، اگر وہ تنگ حوصلہ اور کم کوش ہے، اگر مقصد
کی حرارت نے اس کے دامنِ دل کو نہیں چھوا ہے، اگر وہ ٹکر لینے کی ہمت نہیں رکھتا، اگر وہ
کل معاملے کی نجابت دکھاتا ہے، ہر قیمت پر عافیت خریدنے کی لیاقت رکھتا ہے، اگر
بادِ سموم کے ہر جھونکے سے وہ کمھلا جاتا ہے۔ اگر وہ بادبان کو اثر اور اقتدار کی ہواؤں کے
رُخ پر کھولتا ہے، اگر وہ مصلحت کوشی کو حق گوئی پر ترجیح دیتا ہے، اگر وہ تقرر میں
سفارشوں اور رشتوں اور شناسائیوں اور سودا بازیوں کو دخیل ہونے دیتا ہے اگر وہ
علم اور سائنس میں تربیت یافتہ نہیں ہے، اگر وہ زبان اور ادب کے کوچوں میں عمرِ عزیز
کا بیشتر حصہ صرف کر چکا ہے اور انہی کے قابلِ احترام سانچے میں ڈھل چکا ہے اگر اس
میں قیادت اور جوڑنے اور حوصلہ بڑھانے اور ہمیز دینے کی صلاحیت نہیں ہے اگر وہ
تنگ چشم اور تنگ دل ہے، اگر وہ چھوٹی چالاکیوں اور فریب کاریوں کو بصیرت، ذہانت
اور فراست اور تدبیر کا بدل سمجھتا ہے...... اگر وہ رفقائے کار کی صلاحیتوں کو
بروئے کار نہیں لا سکتا۔ ہمیز نہیں دے سکتا ان میں [illegible] اگر کسی شخص
میں ہے تو وہ ہرگز اردو یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالنے، اسے بنانے، پھیلانے اور صحیح
خطوط پر چلانے کا اہل نہیں ہے۔ آج کل کردار اور شخصیت کے جو سانچے ہندوستان
میں بالعموم اور بنتے گئے اُردو حلقوں میں بالخصوص نظر آ رہے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے حکومت
[illegible] میں جن افراد پر غور کرے گی، ان میں سے ہر ایک کی شخصیت میں مندرجہ بالا
اوصاف میں سے ایک آدھ کسی کسی میں ملیں گے۔

یاد رکھیے کہ ایک غلط انتخاب یونیورسٹی کو برباد کر سکتا ہے۔ ہمیں دانستہ علم
صحیح انتخاب کے حق میں بنانا چاہیے۔ ایسے شخص کو چننا چاہیے جس میں ولولہ ہو، جو علوم یا
سائنس کا منتہی ہو، جس کی عمر کا زوال ابھی نہ شروع ہوا ہو، جو تنظیمی صلاحیت اور بصیرت
رکھتا ہو، جس میں جرأت ہو، جو کار گزار ہو اور جو ادارہ کے مفاد کو ذاتی مفاد پر بالا رکھتا ہو،

قدر شرمندگی نہیں دیکھتا لیکن کیا وہ آخری احتساب سے بھی دامن بچا سکیں گے۔ سوال یہ کہ تو جواب کیا دیں گے۔

بہرکیف اُردو والوں کو بے تابی اور بے دلی کے ساتھ قانون کی کتاب میں اُردو ایکٹ کے داخل ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ انہیں دو تین باتوں پر نگاہ رکھنی ہوگی۔۔۔

(۱) حکومت اپنے انتظامی اختیارات کے تحت ایک اردو اوپن اسکول کی تعلیم اردو یونیورسٹی کے تحت میں لگا دے اور فاصلاتی تعلیم کے ذریعہ اردو کے ساتھ حکومت کے ۴۸ سالہ تغافل کی کچھ گونہ تلافی کر دے۔

(۲) یونیورسٹی دستکاروں اور کاریگروں اور تعلیم یافتہ اور نیم خواندہ و دبستان گرفتہ افراد کی تعلیم کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جوڑ دے۔

(۳) اُردو یونیورسٹی کے معمار اور بانی سربراہ کا انتخاب غیر معمولی چھان بین کے بعد بغیر اثرات کو قبول کئے ہوئے اعلیٰ سیاسی اور شخصی اغراض کو خاطر میں لائے ہوئے کیا جائے ایسے شخص کو چھانٹا جائے اور راضی کیا جائے جو اس سے صداہم اور تاریخ ساز اور زبان پرور منصب کی اہلیت رکھتا ہو۔ ایک دفعہ یونیورسٹی کی بنیاد مضبوطی اور وسعت نظر کے ساتھ رکھ دی گئی اور وہ ڈھرے پر آگئی تو پھر اوسط سے کسی قدر بہتر وائس چانسلر بھی اس کے لیے کافی ہوگا۔ (بہ شکریہ ہماری زبان ۸ ر جولائی ۹۵ء)

سلام ص ۲۶ صرف لیک پیشہ ہے سب کچھ ہو سیہ چاہے سفید
علم و حکمت، آگہی، نام و نسب کچھ بھی نہیں

اس کے مجموعہ کلام "پیش رفت" میں ایسے اشعار کی کمی نہیں بلاشبہ مجیب نواز ایک اچھا شاعر ہے اور اس کا یہ تازہ مجموعہ کلام شعری ادب میں ایک خوشگوار ...

خالد رحیم

ڈاکٹر محبوب راہی
پیش رفت کے آئینے میں

ڈاکٹر محبوب راہی شعر و ادب کی دنیا کے لیے نیا نام نہیں ہے۔ اور نہ وہ محتاجِ تعارف ہے۔ اُس کی کئی تصنیفات منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ ۲۳ سال سے مسلسل وہ اپنی نگارشات کے ذریعہ اپنی تخلیقی قوتوں سے ضوفشانی کر رہا ہے۔ برصغیر کے موقر ادبی و نیم ادبی رسالوں اور اخبارات میں اس کی تخلیقات جلوہ نواز ہوتی رہی ہیں۔ [illegible] غزلوں کا پہلا مجموعہ "ثبات" منظرِ عام پر آیا تو اربابِ علم و ادب نے ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد اُس کی غزلوں کے دو اور مجموعے یکے بعد دیگرے "تردید" اور "بازیافت" منظرِ عام پر آ گئے اور اب اُس کی غزلوں کا تازہ مجموعہ "پیش رفت" زیرِ نظر ہے۔

محبوب راہی کا لب و لہجہ اپنے اندر انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ اُس کا اندازِ بیان دوسروں سے قدرے مختلف اور دل آویز ہے۔ اُس کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے تخیل کی پرواز کا دائرہ محدود نہیں ہے بلکہ اندر بے پناہ بے اتھاہ سمندر لئے ہوئے ہے۔ جو اُس کی ذات کی منزلوں کو پار ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی تخلیقات کئی جہتوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ خیال کی ندرت

محبوب راہی کی اپنی ایک الگ پہچان بن گئی ہے۔

محبوب راہی نے اپنے اردگرد کی فضا سے ابھرتی ہوئی آواز کو اپنی شاعری کا لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ ہر قدم پر پیش آنے والی شکست و ریخت، بیچارگی، اکثریت کی بالادستی اور اقلیت کی ہزیمت کو احساسات کا درجہ دیا ہے۔ اُس کے پاس زندگی کو سمجھنے اور برتنے کا ایک قابلِ قدر انداز ہے۔ جسے وہ اپنی فنی کاوشوں کے ذریعہ عوام تک لانے میں کامیاب ہے۔

ہاتھ پسارے کل سڑکوں پر مانگ رہا تھا جیسے وہ
کھیل رہا ہے آج ہزاروں اور لاکھوں میں کیسے وہ

—

اب مدارس میں پڑھایا نہیں جاتا شاید
کس کو کہتے ہیں ادب حفظِ مراتب کیلئے

—

بکھری پڑی ہیں شہر میں لاکھوں کہانیاں
قسمت کے پیچ و خم کی عروج و زوال کی

—

لمحہ لمحہ آج کے انساں کو درپیش ہیں
بدنصیبی، یاسیت، افسردگی، محرومیاں

—

چند لمحات کو پُرکیف بنانے کے لیے
اپنے اسلاف کے ناموس کا سودا مت کر

مستقل سوچ ہر اک لمحہ مسلسل احساس
کر کے چھوڑے گا کسی دن مجھے پاگل احساس

محبوب راہی حیات، ماحول، حقائق، حوادث کو ایک نئے زاویے سے دیکھتا اور پرکھتا ہے اور اپنے تاثرات کے اظہار کے نئے نئے پیکر میں سمونے کی سعی کرتا ہے محبوب راہی کی غزلوں میں کرب و درد، رنج و غم کی پُر اثر کیفیت ذہن و دل کو متا کی ہے۔ سماجی، سیاسی، اور معاشی حالات کی عکاسی قدم قدم پر جلوہ گر ہے۔ حالا کی پیچیدگیوں اور ناآسودگیوں کو اپنے محسوسات سے ہم آہنگ کر کے شعری پیکر میں پیش اُس کا ایک خوشگوار کارنامہ ہے۔

محبوب راہی، شاد عارفی اور مظفر حنفی کی طرح ایک منفرد لب و لہجہ کا مالک ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ محبوب راہی بھی اُسی ڈگر پہ گامزن ہے جس شاد عارفی نے اپنا سفر طے کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اپنے تاثرات کو کس سے الفاظ کے پیکر میں سجا کر پیش کیا جائے۔ اپنی شاعری میں الفاظ کو نئی تخلیقی عطا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے مثال کے طور پر محبوب راہی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

جو پیش آتا رہا مجھ سے مہربان بن کر
رہا وہی پس پردہ حریف جاں بن کر

حالات کا چکر یونہی چلتا ہے مرے یار
سورج کبھی چڑھتا کبھی ڈھلتا ہے مرے یار

ایثار، وفا، دوستی، اخلاص، مروت
[illegible]

تردید کر رہا تھا، تعمیل کر رہا ہوں
میں آج اپنا لہجہ تبدیل کر رہا ہوں

کینہ دلوں میں رکھنا ہونٹوں پہ چاہ رکھنا
ایسے منافقوں سے کیا رسم و راہ رکھنا

پانی کبھی پانی سے جدا ہو نہیں سکتا
اس قول میں اب کوئی صداقت بھی نہیں ہے

تم اقتدار کے پاتے ہی بھول جاتے ہو
تمہیں یہ رتبہ ہمارے سبب سے ملتا ہے

محبوب راہی زبان و بیان کی باریکیوں کو خوب اچھی طرح جانتا اور پرکھتا ہے۔ اسے فنِ عروض پر بھی غیر معمولی دسترس حاصل ہے اشعار میں روایتی، انداز اور جدیدیت کی ملی جلی لطیف جھلک ہے اس نے شعری تخلیق میں نئے عصری تقاضوں کو بھی ہمیشہ مد نظر رکھا ہے۔

محبوب راہی خود ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ جہاں قدم قدم پر ناانصافی، ظلم و تشدد ہے، قتل و غارت گری اور استحصال ہے گندی سیاست اور مایوسی، ناکامی اور محرومی کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے آج کا انسان وہ نہیں ہے جو بظاہر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں رہ کر بھی اپنائیت کا متلاشی ہے بھیڑ میں احساسِ تنہائی کا مارا ہوا ہے

کوئی علامتِ وابستگی اِدھر نہ اُدھر
میں اپنے گھر سے ہوں بیزار مجھ سے گھر میرا

کم ہیں کیا کوچہ و بازار ہی ذلت کے لیے
گھر میں تو عزت و توقیر سے رہنا چاہوں

—

تسلیم کہ گھر گھر ہے جہنم نہیں ہرگز
لیکن یہ مرے واسطے جنت بھی نہیں ہے

—

اے زندگی سانس سانس تجھ کو
ادا کیا ہے لگان جیسا

—

اس دور کا ہے فیشن اس دور کا چلن ہے
اپنوں سے بیر رکھنا غیروں سے چاہ رکھنا

—

بڑے خلوص سے وہ یوں تو سب سے ملتا ہے
جو ہم سے ملتا ہے غیظ و غضب سے ملتا ہے

—

گلی محلے والے لیکن راہی سے ناواقف ہیں
کہنے کو تو شہروں شہروں اس کی ہے پہچان بہت

—

زندگی غم کا سمندر ہے تو پھر یونہی سہی
ڈوبنا اپنا مقدر ہے تو پھر یونہی سہی

عمران خان (کرکٹ چیمپئن)

مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

چودہ سو سال پہلے عرب میں ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا، انسانی تاریخ میں ایسی تابناک مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اس عہد میں بھی دو سپر پاورز تھیں، ایک رومن اور دوسری پرشین۔ سپر پاور جس میں سے ایک مشرق اور دوسرا مغرب میں حکم آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ ان میں سے کسی سپر پاور کے نزدیک صحرائے عرب اور اس کے قعر مذلت میں گرے ہوئے بدوؤں کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ غریب اور پسماندہ تھے اور قیصر و کسریٰ کے لیے کسی خطرے کا باعث بننے کی اہلیت سے مکمل طور پر عاری تھے اور جب محمدؐ نے مدینہ منورہ میں اپنے مختصر سے ساتھیوں کے ساتھ ایک مختصر سی پہلی اسلامی ریاست کی تشکیل و تعمیر کا آغاز کیا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ آئندہ چند عشروں میں یہی مختصر سی ریاست قیصر و کسریٰ کو روند کے رکھ دے گی، دونوں سپر پاورز کو تاخت و تاراج کر دے گی اور تعداد سے لے کر تکنک، تعلیم، تجربے اور اسلحے کی کمی کے باوجود ان پر غلبہ حاصل کرے گی۔

نبی پاکؐ کے وصال کے بعد سو سال کے اندر اندر مسلمان اپنے عہد کی عظیم ترین تہذیب کے طور پر میدان جنگ سے لے کر سائنس، طب، فلکیات، ہندسہ، جیومیٹری غرضیکہ ہر شعبہ میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔

اس خیر العقول اور ناقابلِ یقین کامیابی کا راز کیا تھا؟ یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ وہ صحرائی بدو جنہیں کوئی درخورِ اعتنا تک نہ سمجھتا تھا جو کسی کھاتے میں نہ تھے۔ جس کی جہالت، درماندگی، پسماندگی اور بے چارگی مسلمہ تھی ایک مختصر سے عرصہ میں دنیا بھر پر کیسے چھا گئے؟ انسانی تاریخ کی عظیم ترین تہذیب کی بنیاد رکھنے کا باعث کیسے بن گئے؟ کیا یہ کسی غیر ملکی سرمایہ کاری کا کمال تھا؟ کیا یہ بیرونی امداد یا قرضوں کا اعجاز تھا؟ یا وہاں سونے کی کانیں اور تیل کے ذخائر نکل آئے تھے؟ یا بدوؤں نے اپنے عہد کی سپر پاورز کی نقالی شروع کر دی تھی؟ (جیسے اتاترک نے ترکی کو جدید ترکی بنانے کے جنون میں یورپ کی نقالی شروع کر دی تھی)۔

یقیناً مندرجہ بالا عوامل میں سے کسی ایک کا وجود بھی نہ تھا۔

مسلمانوں کی عظمت و سربلندی فقط ایک نظریہ کا کمال تھا۔ اللہ کے ایک ہونے کو دل سے حقیقی معنوں میں تسلیم کرنے اور عملاً بھی اس کا اعتراف کرنے کا اعجاز تھا انسان کی انسانی غلامی سے نجات ہی انسانیت کی نجات دہندہ ثابت ہوئی۔ یہ مساواتِ محمدی، عدل اور انصاف کی فتح تھی۔ بقول سعدیؒ بت پرستی اور شرک گناہ ہے لیکن انسان کا انسان کو پوجنا اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں ایک ایسا عظیم الشان معاشرہ تشکیل پایا جس میں انصاف اور عدل کی حکمرانی تھی انسانوں میں تفریق روا رکھنے کا تصور تک ختم ہو چکا تھا۔ انسان کا استحصال اور اس کی اہانت قتل سے بھی سنگین جرم تھا کیونکہ اس سے انسانی صلاحیتیں اور خصوصاً اس کی تخلیقی قوت تباہ و برباد ہو جاتی ہے، انسان کے اندر "امکانات" موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں

کے لیے ظہور اور نشو ونما کے مواقع ختم ہوجاتے ہیں ۔ دین فطرت اور دین کامل نے نہ صرف انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلائی بلکہ انسان کو خود اس کے اندر چھپے سہم سے بھی چھٹکارا دلایا۔ موت کے خوف سے آزمائش کے ساتھ ساتھ اسے ذلت و عزت سے بھی بالاتر کر دیا کہ ... "عزت و ذلت صرف اللہ کے اختیار میں ہے"۔ یہی نہیں بلکہ مسلمان کو بتایا گیا کہ اگر وہ اپنی نفسانی اور جسمانی جبلتوں پر قابو پالے تو پھر وہ اشرف المخلوقات کے درجات تک بھی جاسکتا ہے۔

یہی وہ فکری اور روحانی انقلاب تھا جس نے مختصر ترین مدت میں لاتعداد عظیم فتوحات اور شخصیات کو جنم دیا۔ جینز کی تازہ ترین سائنس کے بہت سے مفروضے ماضی میں غلط ثابت ہوچکے ہیں کہ مسلمانوں اور افتادگان خاک نے عظیم الشان سپہ سالاروں اور دانشوروں کو جنم دیا۔ صرف ... لشکریوں کے ساتھ ساحل پر کشتیاں جلا کر اسپین فتح کرنے والے طارق بن زیاد سے لے کر قطب الدین ایبک تک کون لوگ تھے؟ لیکن کشتیاں تو وہی جلا سکتے ہیں جنہیں سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں اپنے اکاؤنٹس کی فکر نہ ہو۔

علامہ اقبال اس المیہ کی نشاندہی کرتا ہے کہ کس طرح انگریز سامراج نے جسمانی ہی نہیں فکری طور پر بھی ہمیں زنجیروں میں جکڑ دیا۔ وہ مسلمان، انسلی جنیشیاں، کو ان کی ذہنی غلامی سے خبردار کرتے ہوئے پوچھتا ہے۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے۔

اس ایک شعر میں ہمارے لیے بہت بڑا پیغام اور اشارہ ہے کیونکہ آج قوم کو بت پرستی کے مرض میں دھکیل دیا گیا ہے جس کی بے شمار شکلیں ہیں۔

جدید بت پرستی کی ایک شکل تو غیر ملکی سرمایہ کاری ہے، جسے پا لینے کے بعد ہم سمجھے ہیں کہ فلاح اور نجات کے دروازے کھل جائیں گے اس، اخلاقی انحطاط اور کرپشن کی انتہا پر کیا واقعی غیر ملکی سرمایہ کاری ہوگی اور اگر ہوگی تو اس کے کوئی مثبت اور

تعمیری نتائج بھی نکلیں گے ؟

بعض کے نزدیک "غیر ملکی / بیرونی امداد" ایک ایسا بت ہے جس کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے ہمارے حالات سنور جائیں گے۔ آج تک کی اربوں ڈالرز کی بیرونی امداد نے ایک عام آدمی کے لیے کیا کیا ہے جو آئندہ کرے گی ؟ عہد جدید کے بتوں میں سے ایک کا نام "مغرب" اور دوسرے کا "امریکہ" ہے۔ یہ عہد جدید کے لات منات ہیں۔ ملکہ ایلزبتھ اور جیکولین کینیڈی کے دوروں کے بعد حال ہی میں ہلیری کلنٹن کے دورہ پاکستان کے دوران جو کچھ ہوا، دردناک بھی تھا، شرمناک بھی کیونکہ روایتی مشرقی مہمان نوازی اور تملق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور کیا واقعی ہم اتنے ہی "چالاک" تھے کہ ہلیری کلنٹن جیسی باشعور اور باخبر خاتون اول کو بے وقوف بنا سکتے ؟ اس سے حقائق چھپا سکتے ؟ اور سوقیانہ طریقے سے اپنی بجلی چکا چوند سے متاثر کر سکتے ! ہماری کوتاہ نظر اور خود فریبی میں مبتلا مصنوعی اشرافیہ کیا واقعی ہلیری کلنٹن کو اپنی "شان و شوکت، دولت" پر قائل کر سکتی ہے ؟

اس کمپیوٹر اور سیلائٹ کے عہد میں امریکی خاتون اول کے لیے UNICEF کے ان اعداد و شمار تک رسائی کتنی مشکل ہوگی کہ ان "غریب ملک" کی ۵۴ فیصد دیہاتی آبادی کو تو پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں۔ صرف ۱۰ فیصد دیہی آبادی کو سینی ٹیشن کی سہولیات دستیاب ہیں۔ ملک کی ۳۰ فیصد آبادی خط غربت سے بہت نیچے قیام پذیر اور اسی نظام پر نوحہ خواں ہے۔ ۱۰۰۰ نوزائیدہ بچوں میں سے ۱۰۰ بچے اپنی زندگی کی پہلی بہار بھی نہیں دیکھ سکتے اور موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ تقریباً ۷۰ فیصد عوام تعلیم کے بنیادی حق سے محروم ہیں، صرف ۳۰ فیصد پرائمری اسکولوں کو سینی ٹیشن کی سہولتیں میسر ہیں اور بے روزگاری کا عفریت جرائم کو جنم دے رہا ہے !

بے روزگاری نسلوں کو برباد کر رہی ہے۔

ایک طرف ہم ہلیری کلنٹن سے اپنے تیں وہ حقائق چھپا رہے ہیں جن کے بارے میں آمد سے پہلے بخوبی بریف کر دیا گیا ہوگا۔ دوسری طرف ہم اسٹریٹ بزدوں کی قطاریں، قصر صدارت اور وزیر اعظم کے محلات کے ساتھ ساتھ شیش محلوں میں مغلیہ تہذیب اور رقص دکھا رہے ہیں اور تیسری طرف ان کی جانب کاسہ گدائی لے کر بھیک مانگنے کے لیے لپک رہے ہیں۔
یہ لوگ کس کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، امریکہ کو ؟ اپنے آپ کو ؟ یا اپنے عوام کو ؟؟؟

صـ۳۳ طور پر علیحدہ نوعیت سائینٹفک ریسورس مینجمنٹ سسٹم خلائی ٹکنالوجی سے ڈاٹا کی امداد حاصل کرتے ہوئے اسکو زیر زمین آبی وسائل، زراعت، جنگلات، سیلابی نقشوں کی تیاری سمکیات اور آفات سماوی کی قبل از قبل انتباہ کے متعلق استعمال کرتا ہے۔
مالی موقف : محکمہ خلا کے لئے گزشتہ چار سالوں کے درمیان بجٹ کو دگنا کر دیا گیا ہے۔
۹۳-۱۹۹۲ء کے ۹۲۔ ۹۵۸ کروڑ روپیہ کے بجٹ کے مقابلے میں اسکو ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران بڑھا کر ۷۶۔ ۱۶ ۹ کروڑ روپیہ کر دیا گیا ہے۔

سلسلہ صـ۱۸

ثاقب کے دردِ دل کا اک تصویر تو جاتی ہے اس کے ہر ایک نقطہ کے سینے میں اک کہانی ہے
والئے زمین۔ بوسنیا والئے زمین بوسنیا

***

حیدرآباد میں بوسنیا کونشن، منعقدہ ۶ اگسٹ ۱۹۹۵ء کے موقع پر

پریس انفارمیشن بیورو۔

محکمۂ خلاء کی کارکردگی

پی ایس ایل وی D2 کے داغنے سے ہندوستان خود ریموٹ سینسنگ سیٹلائٹ چھوڑنے میں کامیاب۔

سیٹلائٹس اور لانچنگ :۔

انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن ۱۹۶۰ء میں آر ایچ ۷۵ جیسے چھوٹے راکٹ سے اپنی ابتدا کے بعد سے گذشتہ سالوں سے ابتک خاطر خواہ ترقی کرتے ہوئے اکتوبر ۹۴ء میں کامیاب طریقے پر پی ایس ایل وی (D2) کے ذریعہ ۸۰۴ وزنی انڈیا ریموٹ سینسنگ سیٹلائٹ پی ۲ کو داغا۔ گذشتہ چار سالوں کے دوران ۴ لانچ گاڑیاں اور ۶ سیٹلائٹس تیار ہوئے جو حسب ذیل ہیں۔

اے۔ ایس۔ ایل۔ وی :۔

۲۰ رمئی ۱۹۹۲ء کو اے ایس ایل وی ڈی 2 کو داغا گیا اور ۴ مئی ۱۹۹۴ء کو اے ایس ایل وی ڈی ۴ کی لانچنگ کامیاب رہی۔

پی۔ ایس۔ ایل۔ وی : ۲۹ ستمبر ۱۹۹۳ء کو پی ایس ایل وی ڈی ۱ کا اور پندرہ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو پی۔ ایس۔ ایل وی۔ ڈی ۲ کی کامیاب اڑانیں مکمل ہوئیں۔ اور ایس ایل وی اور اسی ایس 2 جیسے دو سیٹلائٹس کو اے۔ ایس۔ ایل۔ وی ڈی 3 اور اے ایس ایل وی ڈی ۴ کے ذریعہ

انڈین ریموٹ سنسنگ سیٹلائیٹس : آئی۔آر۔ایس۔آئی۔اے اور آئی آر پی۔ سیٹلائیٹس کو تیار کرنے کے بعد پی۔ایس۔ایل وی، ڈی ۲ کے ذریعہ آئی آر۔ایس پی ۲ کو کامیاب طور پر داغا گیا۔

انڈین نیشنل سیٹلائیٹس : ۱۰/جولائی ۱۹۹۲ء کو اور ۲۳/جولائی ۱۹۹۳ء کو علی الترتیب انسیاٹ A 2 اور انسیاٹ B 2 سیٹلائیٹس کو کامیاب طریقے پر خلاء تک پہنچایا گیا۔

کرایوجینک پراجیکٹ : اپریل ۱۹۹۳ء کے دوران کرایوجینک ٹکنالوجی کے متعلق روس کے ساتھ دوبارہ بات چیت کے بعد حکومت نے اندرونی ملک کرایوجینک اپر اسٹیج بنانے کے لیے منظوری دی۔

جی۔ایس۔ایل۔وی : اس صدی کے اختتام تک جی۔ایس۔ایل۔وی کے مکمل طور کام کرنا شروع کر دینے کے بعد ای۔ایس آر او خود سے سائنٹفک اور ریموٹ سنسنگ سیٹلائٹ خلاء میں بھیجنے کی صلاحیت پیدا کریگا۔

پی۔ایس۔ایل۔وی۔ڈی 3 : ۱۹۹۵ء کے دوران پی۔ایس۔ایل۔وی۔ڈی 3 کو داغنے کا پروگرام ہے اس کے بعد ہر سال ایک کے حساب سے پی۔ایس۔ایل۔وی کی تین اڑانیں رکھی جائینگی۔

ہندوستانی خلائی پروگرام کی عالمی مارکٹ میں شمولیت :

عالمی مارکٹ نے خلائی ریموٹ سنسنگ ٹکنالوجی کی طرف توجہ کی ہے امریکی کمپنی ای او ایس اے ٹی کمپنی نے حکومت ہند کے انٹرکس کارپوریشن کے ساتھ معاہدہ کیا ہے تاکہ آئی۔آر۔ایس سیٹلائیٹس کے ذریعہ ڈاٹا حاصل کرتے ہوئے اسکو مارکٹ کیا جائے اسکے علاوہ کئی اور ترقیاتی کنٹس مارکیٹ اور سروس کے لیے حاصل ہوئے ہیں

ورکسٹر کارپوریشن انٹرنیشن کا ادارہ :

پریس انفارمیشن بیورو

محکمہ الکٹرانکس کی چارسالہ کارکردگی

الکٹرانکس ہندوستانی صنعت کا سب سے تیزی سے ترقی کرنے والا شعبہ ہے۔ اس کی موجودہ پیداواری رفتار ۱۸ فیصد ہے۔ ۱۹۹۱ء کے دوران الکٹرانکس اشیاء کی پیداوار کی مالیت ۹۰،۲۵ کروڑ روپے تھی جو ۱۹۹۴ء میں بڑھ کر ۱۵،۶۰۰ کروڑ روپے ہو گئی اس طرح برآمدات میں بھی اضافہ ہوا۔ الکٹرانکس برآمدات کی مالیت ۱۹۹۴ء کے دوران ۲۰۲۰ کروڑ روپے تھی جبکہ ۱۹۹۱ء میں اس شعبہ کی برآمدات سے ۹۰۰ کروڑ روپے حاصل ہوئے تھے پچھلے پانچ سال کے دوران کمپیوٹر سوفٹ ویر کی برآمدات میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ فی الحال ۱۰۰ کروڑ روپے مالیت کی سافٹ ویر برآمدات کا ہدف ہے

کنزیومر الکٹرانکس انڈسٹری نے ۱۹۹۳ء کے دوران ۴،۴ کروڑ روپے کا مال تیار کیا جبکہ ۱۹۹۳ء کے دوران پیداوار کی مالیت ۳۰۸۵ ملین تھی اس طرح پیداوار میں ۱۱ء۲ فیصد اضافہ۔ ٹی وی انڈسٹری نے اپنی مستحکمانہ پیداوار کی رفتار جاری رکھی۔ الکٹرانکس کی پیداوار نے سوسال کے وقفہ کے بعد ۱۹۹۴ء میں بھی ترقی کی۔

محکمہ الکٹرانکس نے ہندوستانی کونسل برائے زرعی تحقیقات دیگر

محکموں کیساتھ تفصیلی مشاورت کے لیے زرعی شعبہ میں الکٹرانکس کے استعمال کے لیے زمین کی جانچ، درختوں کی نگہداشت اور زرعی پروسسنگ انڈسٹری کی نشاندہی کی۔ جواہر لال نہرو کرشی (ودھیا پیٹھ) جبلپور میں زرعی الکٹرانکس کے لیے مائکرو پروسیسر ایپلیکیشن انجینئرنگ پروگرام سنٹر قائم کیا گیا۔ جس نے کئی زرعی الکٹرانکس آلے تیار کئے اور کسانوں کے لیے توسیعی خدمات انجام دیئے۔

دیہی علاقوں میں بالخصوص خواتین اور درج فہرست اقوام و قبائل کیلئے فراہمی روزگار کے مقصد سے محکمہ الکٹرانکس اور کھادی ویلیج انڈسٹریز کمیشن نے (کے وی۔ آئی سی) مشترکہ طور پر الکٹرانکس کے ذریعہ روزگار کے لیے ایک پائلٹ اسکیم شروع کی ہے۔ جسے تمام ریاستی محکمہ الکٹرانکس و کھادی ویلیج انڈسٹریز بورڈز کو روانہ کیا گیا ہے تاکہ اس اسکیم کو رائج کیا جائے۔

محکمہ الکٹرانکس نے محکمہ پروگرام عمل آوری کی مشاورت سے الکٹرانکس کے شعبہ میں پانچ نئے پراجکٹس تیار کئے ہیں۔ یہ پراجکٹس پارلیمنٹ لوکل ایریا ڈیولپمنٹ (پی ایل اے ڈی) اسکیم کے تحت رائج کئے جائیں گے۔ یہ نئے پروجکٹس تعلیمی شعبہ میں کمپیوٹر کا استعمال، پرائمری اسکول میں کمپیوٹر، ہائی اسکول میں امیچر ریڈیو کلب۔ سٹیزن بانڈ ریڈیو اور ٹیلو گرافی ڈاٹا بیس ہیں۔ یہ پروجکٹس دیہی اور شہری ترقی کے لیے پیداوار اور بنیادی سہولیات فراہم کریں۔

ہندوستانی صنعت اور اہم شعبہ جات جیسے ریلویز، برقی، مواصلات اور صحت وغیرہ کی جدید اور موزوں ٹکنالوجی ایجاد کئے گئے ہیں جس میں بھی کا ای۔ ایم یو ٹرینس کیلیے اختراع کردہ چاپر کنٹرول اکوپمنٹ ٹکنالوجی قابل ذکر ہے جس سے ۲۵ فیصد توانائی کی بچت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان چار رسوں کے دوران اس سسٹم میں کئی اہم کامیابیاں حاصل کی گئی ہے۔ جیسے وقتاً فوقتاً سنبلیزیشن ...

کمپیوٹر خلائی موسمی تحقیقات۔ سائنس و انجینیرنگ کینسر کے علاج۔ مجرموں کے کھوج کے لیے انگلیوں کے نشانات کی جانچ وغیرہ الکٹرانکس کا استعمال اہمیت کا حامل ہے
ہندوستان کے سافٹ ویر پارکس بنگلور۔ حیدرآباد تمرو وننتاپورم اور نوئیڈا کے صنعت کاروں کے لئے بیرونی ممالک میں مقیم اپنے گاہکوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے تیز رفتار مواصلاتی سہولت فراہم کر رہے ہیں۔

تیز رفتار اعداد و شمار پر مبنی مواصلاتی جال دہلی، بمبئی اور مدراس میں قائم کیا ہے بنیادی طور پر کمپیوٹر سافٹ ویر برآمدات کے لیے بین الاقوامی طور پر تیز رفتار اور قابل بھروسہ اعداد و شمار پر مبنی مواصلاتی رابطہ فراہم کرنے میں محکمہ الکٹرانکس غریب اور ضرورت مند خواتین کو الکٹرانکس اور کمپیوٹر کے شعبوں میں ملازمت فراہم کرنے کے لیے انہیں تربیت بھی دے رہا ہے۔

اکزم پالیسی کے تحت سرمائے کنندہ الکٹرانکس اشیا بیشتر الکٹرانکس ساز و سامان آزادی کے ساتھ درآمد کیا جا رہا ہے۔ برآمدات کے فروغ کے لیے اہم الکٹرانک حصوں کی برآمدات پر عائد کردہ محصول میں رعایت کی گئی ہے۔ چنانچہ ۹۶-۱۹۹۵ کے بجٹ میں کسٹم ڈیوٹی کو ۶۵ فیصد سے گھٹا کر ۵۰ فیصد کر دیا گیا سافٹ ویر اشیا کی کسٹم ڈیوٹی کو ۶۵ فیصد سے گھٹا کر ۱۰ فیصد کر دیا گیا ہے۔ مصنوعات کے لئے کام آنے والی خام اشیا کل پرزوں، اسپیر پارٹس اور سرمایہ اشیا کے لیے برآمدات ڈیوٹی معاف کر دی گئی ہے

محکمہ الکٹرانکس کے لیے پیش کردہ بجٹ ۹۱-۱۹۹۰ میں ۱۱ کروڑ روپے کا ۹۶-۱۹۹۵ میں بڑھ کر ۱۰ کروڑ روپے ہو گیا آٹھویں منصوبہ کیلئے محکمہ کا منصوبہ جاتی مختص ۸۸۸ کروڑ روپے تھا جبکہ ساتویں منصوبہ کے دوران ۱۷۴ کروڑ

بہ انفارمیشن بیورو

کول انڈیا ترقی کی راہ پر

کول انڈیا لمیٹڈ نے پچھلے چار سال کے عرصہ میں مسلسل منافع حاصل کیا ہے۔
سال ۹۵-۹۴ء میں کول انڈیا نے ۵۴۰ کروڑ روپے کا ریکارڈ نفع حاصل کیا ہے جبکہ
سال ۹۴-۹۳ء میں منافع کی رقم ۴۰۰ کروڑ روپیہ ہی تھی۔ سال ۹۳-۱۹۹۲ء میں
۲۹۱ کروڑ اور سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں صرف ۱۶۷ کروڑ روپیہ منافع رہا۔ مالیاتی
کارکردگی کی روشنی میں جہاں اس کا ٹرن اور ترقی کی راہ پر گامزن رہا وہاں کول انڈیا
لمیٹڈ نے خود منافع حاصل کرنے کے علاوہ سرکاری خزانہ کو بھی رقومات مہیا کرنے کا موجب
ہوا ۹۱-۱۹۹۰ء میں سی آئی ایل کی جانب سے حکومت کو ۱۹۸ کروڑ روپیہ حاصل ہوئے
اور سال ۹۵-۱۹۹۴ء میں سی آئی ایل نے حکومت کو ۵۲۸ کروڑ روپے ادا کئے۔
سی آئی ایل کی بڑھتی ہوئی پیداوار کی روشنی میں اس کا ٹرن اور بھی قابل لحاظ سطح
تک پہونچ گیا۔ چنانچہ یہ ٹرن اور ۹۲-۱۹۹۱ میں ۷۶۰۴ کروڑ روپیہ تھا تو ۹۵-۱۹۹۴ء
میں انتہائی ترقی کرکے ۱۱۸۹۷ کروڑ روپیہ ہو گیا اس طرح سے سالانہ اضافہ ۲۰ فیصد
سے بھی زائد رہا۔ ایسی یادگاری کارکردگی کی اصل وجہ بہتر پیداوار اور آلات کے
استعمال کے ساتھ ساتھ قیمت میں تعین کرنے کی حکمت عملی رہی ہے ان ترقیات کی
بنا پر گھریلو سرمایہ کاروں کے علاوہ بیرونی سرمایہ کاروں کو بھی اس فی ذرع حاصل ہو ایسا

مدد سے کول واشریز اور پاور پلانٹ قائم کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔ کوئلہ کی درآمد اور نان کوکنگ کول پر کسٹمس ڈیوٹی میں ۸۵ فیصد سے ۳۵ فیصد تک گھٹاؤ کوئلہ کی صنعت کے لیے ایک چیلنج بن گیا چنانچہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے جو اقدامات عمل میں لائے گئے ان میں تھرمل اسٹیشنوں کو مفید کوئلہ کی فراہمی کول واشریز کو نجی طور پر قائم کرنے اور انہیں چلانے کے لیے حوصلہ افزائی اور معیاری پیداوار کے حصول کے لیے زور دینا جیسے امور شامل رہیں۔

ملک میں کوئلہ کی جملہ پیداوار کا ۸۸ فیصد حصہ سی آئی ایل کی کارکردگی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ سی آئی ایل کے تحت آٹھ معاون تنظیمیں بشمول ایک انجینئرنگ ڈیزائن اور کوئلہ کی کھوج کرنے کا ادارہ موجود ہیں جو کہ سی آئی ایل کی کمپنیوں کو فردی منصوبے کی تیاری کے ذریعہ مدد کرتے ہیں اس کے علاوہ ترقیاتی کنٹرول اور شمالی ریاستوں میں کوئلہ کی کانوں کا استعمال بیچا اور ملک بھر میں کوئلہ کی مارکٹوں میں رسدات کی فراہمی جیسے امور کی نگرانی کرتے ہیں۔

سال ۱۹۹۲ء سے ۹۵-۱۹۹۴ء تک پچھلے چار سال کے دوران کوئلہ کی پیداوار کے لیے مقررہ نشانہ اور حاصل کردہ حقیقی پیداوار حسب ذیل رہا ہے

سال	مقررہ نشانہ	حقیقی پیداوار
۹۲-۱۹۹۱ء	۲۰۴.۲۰ ملین ٹن	۲۰۴.۲۰ ملین ٹن
۹۳-۱۹۹۲ء	۲۱۰ ” ”	۲۱۱/۳ ” ”
۹۴-۱۹۹۳ء	۲۱۶ ” ”	۲۱۶/۱ ” ”
۹۵-۱۹۹۴ء	۲۲۳ ” ”	۲۲۳/۲ ” ”

یکساں سول کوڈ کا مشورہ

جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس آر ایم سہائے پر مشتمل ڈویژن بنچ نے سارے ملک میں تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا حکومت کو مشورہ دیتے ہوئے ایک تازہ تنازعہ کھڑا کر دیا ہے اس کے ساتھ ہی حسب توقع تمام فرقہ پرست جماعتیں ان ججز کے مشورہ کا حوالہ دیتے ہوئے حکومت سے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہی ہیں ان جماعتوں کی جانب سے اس قسم کا مطالبہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہ جماعتیں اپنی فرقہ پرستی کی شناخت برقرار رکھنے کے لیے کچھ دیگر مخالف مسلم مطالبات کرتی رہتی ہیں۔ لیکن فاضل ججز کا یہ مشورہ بالکلیہ غیر ضروری اور بے وقت کی راگنی ہے یہ ججز جو کہ ایک ہندو شخص کے اسلام قبول کرتے ہوئے دوسری شادی کر لینے کے واقعہ میں اس کی پہلی بیوی کی جانب سے دائر کردہ مقدمہ میں فیصلہ سناتے ہوئے یہ مشورہ دیا ہے کہ اور یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ چونکہ اسلام میں ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ہے اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے یہ دوسری شادی کی۔ اپنی پہلی بیوی کو طلاق بھی نہیں دی۔ اب پیچیدہ صورتحال یہ ہے کہ شوہر کے مسلمان ہو جانے اور بیوی کے ہندو برقرار رہنے کے باوجود ہندو میریج ایکٹ ۱۹۵۵ کے تحت دونوں میاں بیوی برقرار رہتے ہیں۔ یہ شادی خود بخود ختم نہیں ہوجاتی اور دوسری شادی ہندو قانون کے مغائر ہے جبکہ قبول اسلام کے بعد وہ دوسری شادی کرے تو یہ قانون دوسری شادی کی

یت کرتا ہے۔ ان حالات میں کسی نومسلم کی دوسری شادی کو قانوناً درست قرار دیا جائے
یہ روح قانون کے منافی ہوگی اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے فاضل محرر یہ چاہتے
ہیں کہ ملک بھر میں تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ نافذ کیا جائے اس سلسلہ میں
لوک بات یہ ہے کہ مسلمان کسی بھی صورت میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ یا مسلم پرسنل لا
ں مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے اور اس قسم کے کوڈ کا نفاذ ان مسائل کا حل
ہا ہے اس قسم کے چند ایک واقعات کے تدارک کے لیے اعلان علماء سے مشورہ
ے اندر کوئی راہ نکالی جاسکتی ہے۔ جیسے پہلے تو کوئی ہندو دوسری شادی کرنے
لیے یا اسلامی قانون کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اسلام قبول کرے تو وہ اسلام
کے دائرہ ہی میں شامل نہ سمجھا جائے گا اس قسم کے اکا دکا مقدموں میں فیصلہ کے لیے
یقی حالات کے لحاظ سے فیصلے کئے جاسکتے ہیں اس قسم کے مخصوص اکا دکا واقعات کے
ے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوئی ضرورت نہیں ہے خصوصیت سے متذکرہ بالا مقدمہ
ہ ہندو شخص جس نے صرف دوسری شادی کے لیے اسلام قبول کیا ہے اسے مسلمان ہی
صور نہیں کیا جائے گا کیونکہ اسلام کا سارا دارومدار نیت پر ہے اگر مسلم علماء ایسے
خص معاملات کے لیے فتویٰ جاری کریں تو اس سلسلہ میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے
سلہ کی گنجائش ختم ہو جائے گی اس کے باوجود مخالف اسلام اور فرقہ پرست جماعتیں
ساں سول کوڈ پر اصرار کریں تو اس کی اہمیت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

(منصف حیدرآباد سے ماخوذ)

اطلاعات یونٹ بیورو

۴۲ ویں قومی فلم ایوارڈز کی تقسیم

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی تقریر

۴۲ ویں قومی فلم ایوارڈز تقسیم کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے
۔ ۴۲ ویں قومی فلم ایوارڈز تقسیم کی آج کی شام آپ سب کے درمیان خود کو پا کر
ت ہو رہی ہے ۔ میں ایوارڈ حاصل کرنے والے اُن تمام افراد کو مبارکباد پیش کرتا
۔ صلاحیت، لگن اور کامیابیوں کا آج اعتراف کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۵ء کی اہمیت
می طور سے ہے کہ یہ بھارتی سینما کا سوواں برس ہے۔

بھارت میں فلموں کی شروعات جولائی ۱۸۹۶ء میں تب سے ہوئی جب
واٹسن ہوٹل میں سینما ٹوگراف فلم دکھائی گئی تھی۔ بھارت میں ہم نے گذشتہ
دوران فلم کی ایک مربوط روایت کو فروغ دیا ہے ۔ میں اس موقع پر فلم صنعت
شخصیات کے تعاون کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ نام متعدد ایسی اہم فلموں کی یاد
ہے جنہوں نے فلم کے تیری اظہار کو نئی بلندیوں سے روشناس کرایا ۔ ان عظیم
دن کے کام حسن اور تکنیکی عظمت کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کا تعاون مستقل
افعال ہے۔ ہمیں انہیں خراج عقیدت ادا کرنا چاہئیے جنہوں نے اُسے دنیا کی

سب سے بڑی فلمی صنعت بنانے میں تعاون دیا ہے۔ اُن کا تعاون اسلئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ کیونکہ عملی طور سے فلم صنعت کو ریاستوں سے کوئی مدد نہیں ملتی۔

درمیانی برس کے دوران بھارت میں صرف سب سے زیادہ تعداد میں فلمیں ہی نہیں بنائی گیئں، بلکہ اُس نے بہت سے ناظرین بھی تیار کئے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ ہمارے ملک کے تین کروڑ افراد روزانہ سینما دیکھتے ہیں۔

مجھے پنڈت جواہر لعل نہرو کے ۴۰ برس قبل کہے ہوئے الفاظ یاد آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔" میں سوچتا ہوں کہ یہ کہنا پوری طرح صحیح ہے کہ بھارت میں فلموں کا اثر اخبار اور کتب کے ملے جلے اثر سے کافی زیادہ ہے۔" سچ پوچھئے تو فلم ہمارے اس دور میں ترسیل کا سب سے قوی ذریعہ ہے۔ بیداری پیدا کرنے، اطلاعات فراہم کرانے اور تفریح فراہم کرنے کے معاملے میں اسکی برابری کرنے والا شاید کوئی نہیں ہے۔ ناظر کو مسحور کرنے اور عرصے تک اُسے اپنے آپ میں غرق رکھنے کی صلاحیت، اس کے کبھی نہ کم ہونے والے اثرات اسکی معقولیت کے راز ہیں۔ پیغام کی ترسیل اور سماجی تبدیلی کے ذریعہ کی شکل میں فلم کا بہت زیادہ اثر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اطلاعات کی تکنک کی توسیع اور دوردرشن اور ویڈیو کے تعاون کی وجہ سے فلموں کی اہمیت لگاتار بڑھتی گئی ہے۔

اس لیے یہ فطری بات ہے کہ فلموں کو ہماری قومی کوششوں سے قریبی طور پر وابستہ رہنا چاہیئے۔ چاہے یہ کوشش لوگوں کو ترغیب دینے کی ہو، تعمیر نو کا ہو، قومی سالمیت کو استحکام بخشنے کی ہو، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بڑھانے کی ہو یا پھر سماج کے وہ اہم معاملات ہوں جو ہماری تشویش کا باعث رہیں۔ سینما کا لوگوں کے ذہن پر جسقدر زبردست اثر پڑتا ہے اسکی وجہ سے یہ ذریعہ ایک جدید اور ترقی یافتہ بھارت بنانے کی ہماری کوشش میں نمایاں شریک بن جاتا ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ بھارت میں سینما کی کردار کے بارے میں ہمیں

ہمارا خود احتساب کرنا چاہیئے۔ ہم سوچیں کہ فلم میں سماج کے داخلی جذبات رجحانات اور عوامی بیداری کو اختیار کرنے کی صلاحیت ہی اُسے ایک خصوصی وصف بخشتی ہے۔ جب اہم موضوعات کو اسطرح پیش کیا جاتا ہے کہ ناظر اُن سے براہ راست وابستہ ہو جاتا ہے تب فلم اور زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ ہماری فلم صنعت کی عظیم شخصیات حقیقت سے دور کبھی نہیں ہوئیں خواہ وہ اندوہناک یا متنازعہ رہی ہو۔ لیکن ان کے فن میں نا قابل قبول پہلو ایک سنجیدہ شہری کے ذائقہ سے وابستہ رہے۔ صحیح معنوں میں اس عظیم نصب العین کے حصول کے جذبے کو بھارتی فلموں کی رہنمائی کرنی چاہیئے۔

بھارتی فلموں کا ہمارے معاشرے کی نشو نما کو تیز کرنے کے علاوہ کچھ تعاون ہے۔ ہماری متعدد فلمیں ایشیا، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے متعدد حصوں میں مقبول ہوتی ہیں اب بھارت میں بنی فلموں کی دیگر ممالک میں مانگ بڑھنے کی بنیاد تیار ہو گئی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہمعصر فلموں کے طرز اور متن کا تعین کرتے وقت یاد رکھا جانا چاہیئے۔

دوستو آج ہمارا معاشرہ تبدیلی کے عمل کے وسط میں ہے تکنیک کی ترقی نے پوری دنیا کو قریب کر دیا ہے اور مختلف رکاوٹوں کو کم کیا ہے۔ متعدد معاشروں میں باہمی ربط وضبط میں اضافہ ہو رہا ہے اور مختلف معاشرے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ اس ضمن میں فلمیں ہماری ثقافتی وراثت کی ازسر نو تصدیق کرنے میں اہم رول نبھا سکتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ دنیا کے عناصر کو اختیار کرنے میں ہماری مددگار ہو سکتی ہیں تاکہ ہماری اپنی ثقافت اور زیادہ مالا مال ہو سکے۔ جب ہم اقدار پر مبنی سینما کی بات کرتے ہیں تب ایسا لگتا ہے کہ تشویش کے کچھ اہم نکات پر گہرائی اور عام طور سے توجہ مرکوز کی جانی چاہیئے۔ مجھے انسان کی بہیمیتوں کی مبالغہ آمیز پیشکش یا بیرونی مناظر یا موضوعات کو مشینی انداز سے اختیار کرنے کی بات تشویشناک محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ عناصر

ہماری ثقافت کی نوعیت اور حسین خوبیوں کو متاثر کرتے ہیں۔

ہماری فلمی صنعت آج نئی تکنیک، بڑھتے ہوئے مقابلے اور ثقافتی گوناگونی جیسی مختلف چنوتیوں کا سامنا کر رہی ہے فلم سازی سے وابستہ ساری سرگرمیوں پر ان دقیق عناصر کا اثر پڑے گا۔ عظمت کی مثال قائم کرتے ہوئے یہ فلم ایوارڈ بھارتی سینما کی حوصلہ افزائی طویل قابل فخر روایت کو بنائے رکھنے کا کام کرتے ہیں

خصوصی موضوعات کے لیے ایوارڈز کی توصیف اب ایک روایت بن چکی ہے۔ بچوں کی فلم کا ایک خصوصی مقام ہے۔ یہ دیکھا ہی ہے جیسا کہ ایسے ہونا چاہئے فلمیں ہمارے نوجوانوں کی کردار سازی کا موثر ذریعہ ہیں اور بچوں کے لیے بنائی گئی اچھی فلمیں اس ضمن میں قابل ذکر تعاون دے سکتی ہیں اس طرح سماجی موضوعات، ماحولیات، علم الانسان، آرٹس اور سائنس، تاریخ تعمیر اور قومی یکجہتی جیسے موضوعات پر مبنی فلموں کے لیے دیئے گئے۔ ایوارڈز زندگی کے ان پہلوؤں پر ہماری توجہ مرکوز کرائیں گے جو ہماری ترقی کے لیے اسقدر اہم ہیں۔

دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سینما کے شعبے میں ہمارے ملک کا اعلیٰ ترین اعزاز ہے۔ اس برس یہ ایوارڈ ایسے اداکار کو حاصل ہوا ہے جس نے درحقیقت گذشتہ پچاس برسوں میں ہندوستانی سینما کی ترقی کو ایک شکل عطا کی ہے۔ اپنی حیات میں ہی حکایت بن جانے والے یوسف صاحب کا کلاسیکی سینما میں تعاون غیر معمولی رہا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ پہلی مرتبہ پھالکے ایوارڈ حاصل کرنے والی دیویکا رانی ہی انہیں فلموں میں لائی تھیں۔ میں انہیں اپنی جانب سے خصوصی مبارکباد دیتا ہوں اور آپ سبھی کی جانب سے انہیں نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں کہ وہ آئندہ متعدد برسوں تک تعمیری و بامعنی کوششیں جاری رکھیں۔ ان یادگار لمحات میں آپ نے مجھے شامل کیا اس کے لیے میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ آنے والے برسوں میں بھارتی فلمی صنعت دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

غزلیں

محسن جلگانوی
ریلوے کوارٹرس نلہ کنٹہ سلاگوڑہ
حیدرآباد ۱۷

خس وخاشاک سا مٹی میں سمو دے گا مجھے
تجھ کو پانے کا نشہ جاں سے کھو دے گا مجھے
پار اتر جانا بھی تو اب اس کے مقدر میں نہیں
گو وہ منجدھار میں لے جا کے ڈبو دے گا مجھے
ساتھ لے جائے گا احساس کے بازاروں میں
جنس کی طرح دوکاں میں کسی کھو دے گا مجھے
تحفتاً اس کو ملیگا مرے "ماتھے کا تلک"
پیاسے صحرا میں انی، نیزے کی چبھو دے گا مجھے
کل مرے سائے کی خوشبو کو سپنے گا محسن
دشت میں آج زمیں کھود کے بو دے گا مجھے

○

جاگے ہوئے سے ہم ہیں دھلے ہوئے سے ہیں
کیفِ نگاہِ مست میں ڈوبے ہوئے سے ہیں
برسی ہے روم روم، تری یاد کی پھوار
[illegible] تمام چہروں کے بھیگے ہوئے سے ہیں
شہرِ خلوص مند میں قاتل چھپے کہیں
چہرے سبھی نقابوں میں الجھے ہوئے سے ہیں
رل جائے مجھ کو گر کوئی معبد تو سونپ دوں
پیکر حسیں منظر نے تراشے ہوئے سے ہیں
محسن متاعِ لوح و قلم کو سنبھالیے
لفظوں کے جسم خوں میں لتھڑے ہوئے سے ہیں

زمین بوسنیا پر ہولناک مظالم کی داستانِ الم

محسنِ ملت غم گسارِ انسانیت جناب ہوشدار خان صاحب کے جذبات و احساسات سے ہم آہنگی کے ساتھ

منظوم ترجمانی : ثاقب صابری حیدرآبادی

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

لت کا اب نہیں کوئی غم خوار اور پاسباں   میدانِ کربلا کا اب منظر ہے زیرِ آسماں

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

یوبی شان کا نہیں اب کوئی اپنا راہبر   جور و جفا کے درمیاں ہیں اہلِ ایماں سربسر

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

نسانیت پہ ظلم اب اس سے بڑا نہیں کوئی   عورتیں، بچے، بوڑھے اور نوجواں کٹتے ہیں سبھی

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

یماں والے بندے اب ہیں غرقِ بحرِ ابتلا   مقتل بنے ہوئے ہیں حیف چپہ چپہ بوسنیا

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

غربی طاقتوں کا اب مردہ ہوا ضمیر ہے   اسلام دشمنی کی کیا ایسی کوئی نظیر ہے

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

قہ ہے بے بسوں پہ کیوں ظلم و ستم کی انتہا!   انسانی عصمتوں کا داں، جو [illegible] لٹ گیا

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

نسانیت کے دل بھی زخموں سے چور چور ہیں کمزور ہم جو ہوگئے اپنے بھی یہ قصور ہیں
واسے زمین بوسنیا واسے زمین بوسنیا

رم ضعیفی مرگ ہے اقبال کا خیال ہے بات یہ واقعی بجا ہے اور اپنے حسب حال ہے
والے زمین بوسنیا والے زمین بوسنیا

نے بڑی تباہی کو دیکھا ہے آسمان کب طاقت سے ہم مٹائیں گے ظلم کا یہ نشان کب
والے زمین بوسنیا والے زمین بوسنیا

بز اور ہلاکو اور ہٹلر کے ظلم سے سوا! اپنے وجود پر بپا دیکھ رہا ہے بوسنیا
واسے زمین بوسنیا والے زمین بوسنیا

پ و تفنگ کے بغیر کب تک وہ لڑسکیں گے یوں اسلامی ملکوں کا ضمیر سویا ہوا ہے اب بھی کیوں
واسے زمین بوسنیا واسے زمین بوسنیا

ف دشمنوں کا اب یہ پول سارا کھل گیا اٹھ گیا اعتبار بھی اقوام متحدہ کا
واسے زمین بوسنیا واسے زمین بوسنیا

وم کے حمایتی ہونے کے وہ ڈھونڈورچی آتی نہیں نظر انہیں انسانوں کی یہ درندگی
والے زمین بوسنیا والے زمین بوسنیا

دختران ملت اسلام بے قرار ہیں سن کر یہ داستان ظلم بچے بھی اشکبار ہیں
واسے زمین بوسنیا والے زمین بوسنیا

تمام کا وجود ہے مثل ایک جسم کے تکلیف ایک عضو کی دیگر کو بے سکون کرے
واسے زمین بوسنیا واسے زمین بوسنیا

اب فضاؤں میں مظلوم کی پکار ہے عزم جہاد کیلئے ہمت کردگار ہے
واسے زمین بوسنیا والے زمین بوسنیا

اسلام کی حیات کا سامان خون سے کریں سرشاری جہاد سے دامانِ زندگی بھر لیں

وائے زمینِ بوسنیا وائے زمینِ بوسنیا

اسلام کے جیالوں کی عزت کو آج کیا ہوا اسلام دشمنوں کا اب بڑھنے لگا ہے حوصلہ

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

اسلام کے وقار کی بن جائیں نگہدار ہم ایثار و اتحاد کا بن جائیں کوہ ہمالہ ہم

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

مظلوم کی حمایت اب ہم پر ہوتی ہے لازمی قرآن میں بھی دیکھئے حکم الٰہی ہے یہی

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

غیرت قوم کو جگاؤ احساس کو حیات دو اپنا نفاق چھوڑ دو دشمن کو بڑھ کے مات دو

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

ظلم کو روکنا جہاد ظالم کو ٹوکنا جہاد اس کو برا سمجھنا بھی گویا ہے اک کھلا جہاد

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

دیکھ کے حال زار یہ بے چین ہو گئے اہل دین ان کی صدا پہ آ گئے دیکھئے غمگسار ہیں

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

انسان سارے عالم میں انسانیت کا کام ہے واقعی جرم کا یہی حد بھرا پیام ہے

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

اربابِ اقتدار اب جذبات کی قدر کریں تیغِ جفا وجود کے وار کو بے اثر کریں

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

مظلوم جو شہید ہوئے ذکر بھی جو شہید آئے باغِ خلد میں اے خدا ان کو حسیں مقام

وائے زمین بوسنیا وائے زمین بوسنیا

سلسلہ صفحہ ۳۱ پر

نامہ شاداب حیدرآباد جلد: ۱۲
شمارہ: ۹

بت: ۶ روپے ستمبر ۱۹۹۵ء

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر: رشید الدین

ینجنگ ایڈیٹر: قدیر انصاری

-: زر تعاون :-

ندوستان	سالانہ	۶۵ روپے	۲ سال	۱۲۰ روپے	تاحیات	۱۵۰۰ روپے
لیجی ممالک	"	۲۰۰ "	"	۳۶۰ "	"	۳۷۰۰ روپے
ریکہ	"	۴۰ ڈالر	"	۷۰ ڈالر	"	۷۰۰ ڈالر
نگلستان	"	۲۵ پونڈ	"	۴۵ پونڈ	"	۴۰۰ پونڈ
کستان	"	۱۷۵ پاکستانی روپے		۳۰۰ روپے	"	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

-: ترسیل زر کا پتہ :-

ماہنامہ "شاداب" 1-5-147 ریڈ ہلز - حیدرآباد

یڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل پرنٹنگ پریس کیلئے پبک پتھر
تہ بازار میں چھپواکر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

قمر صابری
مدیر شاداب

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝ (۴/۶۹-۷۰)

(اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا سو وہ اُن کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید اور نیک بخت ہیں۔ اور اچھی ہے ان کی رفاقت یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کافی ہے علیم ہے۔)

نبی وہ ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی آئے یعنی فرشتہ ظاہر میں آ کر پیغام الٰہی دے۔ صدیق وہ ہیں کہ جو پیغام اور احکام اللہ کی طرف سے رسولوں کو آئے۔ ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور بلا دلیل اس کی تصدیق کرے۔ شہید وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں کے حکم پر جان دینے کو حاضر ہیں۔ اور صالح اور نیک بخت وہ ہیں جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوتی ہے اور بری سے اپنے نفس اور بدن کی اصلاح اور صفائی کر چکے ہیں۔

ان چار قسم کے لوگوں کو بزرگی اور فضیلت حاصل ہے۔ باقی مسلمان درجہ میں ان کے برابر نہیں، لیکن جو لوگ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری میں مشغول ہیں۔ وہ بھی انہی چار قسموں کی ذیل میں سلئے جائیں گے اور ان چار قسموں کے لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوبی اور فضیلت

کی بات ہے۔

اور اللہ اور رسول کے حکم ماننے والوں کو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت کا ملنا اللہ کا بڑا انعام اور اس کا محض فضل ہے اُن کی اطاعت کا معاوضہ نہیں ہے۔ اللہ کافی ہے، جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔ وہ ہر ایک مخلص اور منافق اور ہر مطیع کی طاعت اور اس کے اصلی استحقاق اور مقدارِ فضل کو بالتفصیل جانتا ہے اور اللہ کا انعام کرتا ہے۔ ہمارا کام بس یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولوں کی اطاعت کرتے رہیں اور اللہ کے فضل سے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے گروہ میں شامل ہو جائیں۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ج (۴۔ ۸۰)

(جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا)

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ط وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (۴-۸۱)

(اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی ہے کارساز)

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ط وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴- ۸۲)

(کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوا اللہ کے تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت)

منافق اور مخالفِ اسلام یہ سوچتے کہ یہ کیونکر معلوم ہو کہ قرآن اللہ کا کلام اور کسی بشر کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ تو حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ لوگ قرآن میں غور کرتے جس سے صاف معلوم ہو جائے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ قرآن اگر اللہ کا کلام نہ ہوتا تو قرآن میں بہت سے مواقع اور مقامات پر اختلافات ملتے۔ آدمی ہر حالت میں حالت کے موافق کلام کرتا ہے جو حالت پیش ہوتی ہے۔ ایسے وقت اُسے دوسری

دھیان نہیں ہوتا۔ غصہ میں مہربانی کا دھیان نہیں ہوتا۔ ادھر بانی میں غصہ والی کا خیال نہیں رہتا۔ دنیا کے بیان کا آخرت کا خیال نہیں رہتا اور آخرت کے بیان میں دنیا بھول جاتے ہیں۔ غرض ایک حال کا کلام دوسرے حال کے کلام سے مختلف ہوتا ہے۔ مگر قرآن حکیم چونکہ اللہ کا کلام ہے یہاں ہر چیز کے بیان میں دوسرے پہلو پر بھی نظر رہتی غور و فہم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ایک خاص انداز پر ہے جس میں کوئی اختلاف یا تفاوت نہیں ہے۔ نیز آدمی جب کوئی طویل کلام کرتا ہے تو یکساں نہیں ہوتا بلکہ کوئی جملہ فصیح کوئی غیر فصیح، کوئی صحیح کوئی غلط، کوئی سچا کوئی کاذب کوئی باہم موافق کوئی متناقض ضرور معلوم ہوتا ہے۔ اور قرآن اتنی بڑی کتاب ان جملہ اختلافات سے پاک ہے۔ ایسا کلام طاقت بشر سے باہر ہے۔ یہ حقیقت تدبر میں غور و تدبر ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ اور ہر صاحب فہم و فراست قرآن میں غور و فکر سے اس حقیقت کو پا سکتا ہے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝ (۴/۸۶)

(اور جب تم کو دعا دیوے کوئی تو تم بھی دعا دو اس سے بہتر یا وہی کہو الٹ کر۔ بیشک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔)

کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا درحقیقت اللہ سے اس کی شفاعت کرنا ہے حق تعالیٰ شفاعت حسنہ کی ایک خاص صورت کو صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ جب مسلمانوں کو دعا دے۔ اسلام کرے تو مسلمان بھی اس کا جواب فرما دیں یا تو وہی کلمہ کہیں یا اس سے بہتر۔ اگر کسی نے کہا "السلام علیکم" تو واجب ہے کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جائے۔ زیادہ ثواب چاہیں تو "رحمۃ اللہ" بھی بڑھا دیں، اگر اس نے یہ لفظ بھی

چھا دیا ہو تو اس کے بعد "برکاتہ" زیادہ کردیں۔ اللہ کے یہاں ہر چیز کا حساب ہو
اور اس کی جزا ملیگی۔ گویا شفاعت حسنہ کی ترغیب کے ساتھ حسن سلوک اور مکافات
کا حکم بھی ہے۔ کہ ہر چیز کا حساب ہوگا اور اس کی جزا ملے گی۔ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ
حَدِيثًا (۴/۸۷) اور کس کی بات اللہ کی بات سے زیادہ سچی ہے؟ اللہ کی بات
کو ہرگز سرسری خیال نہیں کرنا چاہیئے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (۴/۹۴)
(اور جو اس شخص کو جو تم سے سلام علیک کرے کہ تو مسلمان نہیں۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج کو ایک قوم پر جہاد کے لیے بھیجا، اس
میں ایک شخص مسلمان تھا اور اپنا مال واسباب اور مواشی ان میں سے نکال کر علاحدہ
ہو گیا تھا اس نے مسلمانوں کو دیکھ کر السلام علیکم کہا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کافر ہے ا
جان اور مال بچانے کی غرض سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے اس کو مار ڈالا
اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ اور تاکید فرمائی گئی کہ جب جہاد کے لیے نکلا
تحقیق سے کام لو۔ بے سوچے سمجھے کام مت کرو اور جو تمہارے سامنے اسلام ظاہر کر
اس کے مسلمان ہونے کا ہرگز انکار مت کرو۔

گویا کسی کا سلام کرنا بادی النظر میں اس کے مسلمان ہونے کا اعلان ہے۔ اُسے
مان لینا چاہیئے تاکہ تحقیق میں اس کے خلاف ثابت نہ ہوجائے۔

رحمٰن جامی

خدوخال

جناب صادق نوید کے مجموعۂ کلام کا تنقیدی جائزہ

تیسری قسط

صفحہ ۶۴ پر صادق نوید نے اپنی سہل پسندی اور کاہلی کا اعتراف خود ہی بڑی صدق دلی اور ایمانداری سے کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خدمتِ شعر و ادب کیلئے فرصت تو نہ تھی
پھر بھی یہ کام کیا ہے کسی کاہل کی طرح

میں خود بھی اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ صادق نوید کو اپنی برتنوں کی دوکان چلانے سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ شاعری کی طرف توجہ دے سکتے۔ مال خریدنے کیلئے بھی انہی کو عثمانیہ بازار، پتھر گٹی اور چار مینار وغیرہ خدا جانے کہاں کہاں پڑتا تھا۔ شام میں عموماً میں اپنے دفتر سے واپسی میں ان کی برتن ویئر (باورچی خانہ کا سازو سامان) کی دوکان جو یک مینار کی مسجد کے نیچے نامپلی میں مرینہ کراکری کے نام سے موسوم ہے کچھ دیر رک کر گھر لوٹتا۔ وہیں ہمارے مرحوم دوست صلاح الدین سلیم بھی ہمارے منتظر رہتے صادق نوید ہمارے لیے چائے منگواتے۔ شعر و شاعری کا دور چلتا۔ ادبی بحثیں ہوتیں۔ عروض پر گفتگو ہوتی۔ اس تمام عرصے میں صادق نوید بیشتر وقت

اپنے گاہک کے ساتھ مصروف رہتے۔ کبھی کبھی ہماری طرف بھی متوجہ ہوتے مگر پھر کوئی گاہک آجاتا تو ان کی توجہ ہماری طرف سے پھر منقطع ہو جاتی اور وہ گاہک کے ہو کر رہ جاتے۔ صادق نوید کی دوکان پر جمع ہونے والے احباب میں ہمارے کامریڈ دوست برق یوسفی بھی تھے۔ تقاضہ کرکے تازہ کلام سُنا جاتا۔ لیکن ہم لوگ ہمیشہ صادق نوید سے تازہ کلام سُننے سے محروم رہتے۔ وہ ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال جاتے کہ "بھئی یہاں تجارت سے فرصت نہیں ملتی تو شاعری کیلئے وقت کہاں سے نکالیں آپ لوگ سُنائیے۔ میں سنتا ہوں۔ آخر سامع کی بھی تو بڑی اہمیت ہے" ان کے اس "عذرِ لنگ" کے باوجود ہم لوگ صادق نوید کو شعر کہنے کی ترغیب دلایا کرتے اور کبھی کبھی اس ترغیب میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن اکثر ناکامی ہی ہاتھ آتی۔ یہ صادق نوید نے اپنے اس شعر میں

"خدمتِ شعر و ادب کے لیے فرصت تو نہ تھی
پھر بھی یہ کام کیا ہے کسی کاہل کی طرح"

جگر اپنی سہل پسندی اور کاہلی کا اعتراف بڑی صدق دلی اور ایمانداری سے کیا ہے چنانچہ میں اس اعتراف پر جناب صادق نوید کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح سچ بولتے رہیں تو کم از کم ان کی شخصیت اور فن پر لگے داغ دھبے کچھ تو دُھل جائیں گے۔

صفحہ ۶۵ پر ایک نہایت پامال موضوع پر شعر ملاحظہ کیجئے اور سوچئے کہ کیا آج اس قسم کی شاعری کی ضرورت ہے جبکہ ہماری قوم کو جگانے اور ملت تعمیری اقدار کو اُبھارنے کی شدید ضرورت ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

رونقِ بزمِ طرب وہ ساقیٔ گلفام ہے
ہر ادا مستانہ جس کی ہر نظر اک جام ہے

بقول عزیز بھارتی 'عصری ادب کے دعویدار اور شاعری ایسی از کار رفتہ معاذ اللہ۔

صفحہ ۶۶ پر مطلع ہے ؎

اپنے بل پر زندگی بھر آپ کیا چلتے رہے
آپ کے پیچھے کئی صبح و مسا چلتے رہے

یہاں لفظ "کئی" وضاحت طلب ہے کہ "کئی لوگ" یا "کئی مسافر" یا "کئی قافلے" یا کیا۔ بات ادھوری ہے۔

اسی غزل کا دوسرا شعر ہے ؎

مانگ کر چہرہ کسی کا مطمئن بے چہرہ لوگ!
شاعری کے دشت میں بے دست و پا چلتے رہے

پہلے مصرع میں بے چہرہ لوگ کسی اور کا چہرہ مانگ کر باچہرہ ہو گئے لیکن فوری دوسرے مصرع میں کہا گیا کہ شاعری کے دشت میں بے دست و پا چلتے رہے یہاں "بے دست و پا" چلتے رہنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر شاعر یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ غیر شاعر لوگ اوروں کی شاعری خرید کر یا مانگ کر یا چرا کر اپنے نام سے موسوم کرتے رہے جیسا کہ بعض لوگ آج بھی ایسا کر رہے ہیں تو شاعر کو یوں کہنا چاہئے تھا۔

مانگ کر بیساکھیاں کچھ بے ہنر بے چہرہ لوگ
چہرہ شاعر لگا کر جا بجا چلتے رہے

ایسی جرأت بے جا کو سرقے ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی جرأت بیجا حضرت صادق نوید نے صفحہ ۸۰ پر مشہور شاعر و نقاد جناب ریاست علی تاج کا پورے کا پورا مصرع اڑا کر کی ہے جسکی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تیسرا شعر ہے ۔

منتظر تھے راہ میں کتنے حسینانِ جہاں !
سر جھکائے ہم بھی مثلِ پارسا چلتے رہے

" مثلِ پارسا " کیا معنی ؟ گویا دل میں چور چھپا ہوا ہے اسیدھے سیدھے پارسا کیوں نہیں کہتے مثلِ پارسا کہہ کر پارسائی کا بھرم کیوں کھوتے ہو

چوتھا شعر ہے ۔

رہبری کا جن کو دعوی تھا نہ چلنے کا شعور
جانبِ منزل وہی بے آسرا چلتے رہے

جب چلنے کا شعور ہی نہ تھا تو بے آسرا منزل کی طرف کیونکر چلتے رہے یہ معلوم نہ ہو سکا اس پر لطف یہ کہ بے آسرا بھی ہیں ۔

پانچواں شعر ہے ۔

دل کے ہاتھوں زندگی میں ہم لٹے تھے ایک بار
اپنی بربادی کے قصّے بارہا چلتے رہے

یہ الگ بات ہے کہ بربادی کے قصّے کہاں کس کی محفل میں چلتے رہے شاعر نے یہ بتلانے کی زحمت گوارا نہیں کی البتہ EXAGGERATION کا نہایت عمدہ مثال سامنے آئی ۔

چھٹا شعر ہے ۔

یہ ہمارا حوصلہ تھا کود کر طوفان میں
ناخدا کے آگے آگے باخدا چلتے رہے

پہلی بات تو یہ کہ دوسرے مصرع میں اگر " باخدا " کے معنی " خدا کی قسم " کے لیے جائیں تو شعر ہی مہمل قرار پاتا ہے جیساکہ شارح کو حق ہے لیکن اگر رعایت

م لے کر باخدا کے معنی "خدا رسیدہ" یا "اللہ والے" کے لیے جائیں تو بھی اس
ریں شتر گربہ (ایک سقم) کی ایک اور شاندار مثال سامنے آتی ہے۔
پہلے مصرع میں "ہمارا" FIRST PERSON ہے تو دوسرے مصرع
"باخدا" THIRD PERSON ہے۔ اس سقم کو دور کرنے کے لئے
پہلے مصرع کے آخر میں "ہم" کا اضافہ کر لیا جائے تو یہ سقم دور ہو جاتا ہے
ہم" کا تعلق "باخدا" سے ہو جاتا ہے یعنی ؎

یہ ہمارا حوصلہ تھا کود کر طوفان میں ہم
ناخدا کے آگے آگے باخدا چلتے رہے

: پہلے مصرع میں طوفان کے نون کو فتحہ کرنا پڑے گا جس سے معنی میں کوئی
رسیں پڑے گا اور سقم بھی دور ہو جائے گا۔
کا مقطع ہے ؎

ہم کسی اک دائرے میں قید کیا ہوتے نوید
ہر جگہ آزاد مانندِ ہوا چلتے رہے

ف کی بات یہ ہے کہ نیوٹن کا کلیہ ہی "ہوا" کی قید پر مشتمل ہے۔ شاید
نوید کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ہوا کو بھی قید کر کے اس سے بڑے بڑے
لیے جاتے ہیں۔ مثلاً جو سڑکوں پر چھوٹی بڑی اور قوی ہیکل گاڑیاں
دوڑتی پھرتی ہیں یہ ہوا کی قید ہی کا (ٹائر کے اندر ٹیوب میں) معمولی کرشمہ
لہذا آزادی کے لیے ہوا کی تشبیہ یہاں یکسر غلط ہو گئی۔
: ۶۷ پر مطلع ہے ؎

ازل سے شکوۂ پیہم رہا ہے آنکھوں میں
غم حیات کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

حیرت ہے کہ صادق نوید کو شکوی کا صحیح املا بھی نہیں معلوم جس کے معنی شکایت کے ہیں۔ شکایت والے شکوی کا املا یائے مقصورہ کے ساتھ ہے نہ کہ ہائے ہوز کے ساتھ جس کے معنی شان و شوکت کے ہیں مطلب یہ کہ "شکوہ" کے معنی "شکایت" کے ہرگز نہیں ہیں۔ اب اس غلطی (جو کم علمی کی وجہ سے سرزد ہوگئی) کا ازالہ اسی طرح ممکن ہے کہ آئندہ صادق نوید اس غلطی کو نہ دہرائیں۔

حسن مطلع ہے ؂

وہ دلربا جو بہت کم رہا ہے آنکھوں میں
اسی کا نقش مجسم رہا ہے آنکھوں میں

"نقش" پتھر، لکڑی یا کسی اور ٹھوس چیز پر ہو سکتا ہے لیکن آنکھوں میں ممکن نہیں۔ البتہ "نقش" کی جگہ "عکس" کہتے تو ابہال دور ہو جاتا اور معنویت بڑھ جاتی۔

اس کے بعد کا شعر ہے ؂

وہ ایک حرف تمنا جو لب پہ آ نہ سکا
رہا اگر تو یہی غم رہا ہے آنکھوں میں

متذکرہ بالا شعر دو لخت ہے۔ پہلے مصرع میں لب کی بات کہی گئی ہے تو دوسرے مصرع میں آنکھوں کی۔ دونوں مصرعوں میں دو الگ باتیں، دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں۔

اس کے بعد والا شعر یوں ہے ؂

تری نگاہ سے جب جب نگاہ ٹکرائی
حیات و موت کا عالم رہا ہے آنکھوں میں

شعر مہمل ہے اس لیے کہ جب نظر سے نظر ٹکراتی ہے تو جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔

مدلبتی ہے برخلاف اسکے شاعر نے موت کی بات کہہ کر شعر کو مہمل بنا دیا۔ اگر
یہ شعر یوں ہوتا ؎

عجب حیات کا عالم رہا ہے آنکھوں میں
تو اہمال سے بچا جا سکتا تھا

۶ یہ اسی غزل کا ایک اور شعر ؎

لبوں پہ حرفِ وفا دل میں خوف رسوائی
کمالِ ضبط کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

مصرع میں "کمال ضبط کا ماتم" کی ترکیب محل نظر ہے "کمالِ ضبط کا ماتم"
ایک وقت کمال بھی اور ماتم بھی۔ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے خود اسے پتہ
بعد فوری بعد والا شعر بھی مہمل ہے ؎

یہ انتظار کی گھڑیاں یہ ہجر کا عالم!
اب آ بھی جا کہ مرا دم رہا ہے آنکھوں میں

اسے دوسرے مصرع میں "مرا دم رہا ہے آنکھوں میں" کا جواب نہیں۔
اظہار کا نمونہ یہی ہے
اس غزل کا مقطع بھی مہمل ہے ؎

نوید سوزِ محبت کا یہ اثر تو نہیں!
جگر سے اٹھ کے دھواں جم رہا ہے آنکھوں میں

کسی مادہ کے جلنے سے ممکن ہے لیکن محبت کا جلنا کیا معنی محبت کی
بیان تو نہیں جس کے جلنے سے دھواں اٹھے گا۔ جگر سے دھواں اٹھنے
سمجھ ہے تو پھر جگر ہی کو جلا دیجئے

۶۹ یہ غزل کا مطلع ہے ؎

رہتا ہوں میں جس میں وہ نگر ڈھونڈ رہا ہوں
خوابیدہ تمناؤں کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں

لے تو مطلع میں "شائگان" کا نقص موجود ہے۔ پہلے مصرعے میں "نگر"
ے مصرعے میں "گھر" علاوہ ازیں "خوابیدہ تمناؤں کا گھر" کی ترکیب
بانظر ہے خوابیدہ تمناؤں کا گھر کیا ہوتا ہے ؟
ہے ۔

آپ اپنی انا سے مجھے ٹکرا کے رلا گیا !
آخر ہے وجود اپنا کدھر ڈھونڈ رہا ہوں

مندرجہ بالا شعر دو لخت ہے۔ پہلے مصرعے میں یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ اپنی انا سے
مجھے کیا ملا۔ لیکن دوسرے مصرع میں ایک الگ ہی بات کہی گئی یعنی شاعر
رہ ڈھونڈ رہا ہے کہ کدھر ہے ۔ اس دو لختگی کا بھی جواب نہیں اسی صفحہ پر
ہے ۔

افکار کے شعلوں کی تمازت سے نکل کر
احساس کے آنگن میں شجر ڈھونڈ رہا ہوں

ہے کیونکہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے افکار کے شعلوں کی تمازت سے کیوں نکل کر احساس
ن میں شجر ڈھونڈ رہے ہو۔
صفحہ ۴۹ پر پانچواں شعر ہے ۔

یاد اتنا تھا ہے عزم سفر لے کے چلا تھا
رہبر ہے کہاں راہ گزر ڈھونڈ رہا ہوں

بات تو یہ ہے کہ پہلا مصرع ساقط البحر ہے دوسری بات یہ ہے کہ دوسرے
ں راہ گزر کا املا غلط لکھا گیا ہے راہ گزر میں "فعلاتُ" نہیں بلکہ "زے"

ہے۔ زوال سے کم جہالت ہے۔ ویسے بھی مذکورہ شعر عدم قدرت اظہار کا نمونہ ہے
اب اسے اتفاق ہی کہنا چاہیئے کہ کہیں کہیں ایک آدھ شعر اچھا بھی مل جاتا ہے
مثلاً صفحہ ۰۷ پر مطلع عمدہ ہے ؎

اسقدر ہے اہتمام زندگی
زہر پیتے ہیں شام زندگی

لیکن فوری بعد مہمل شعر پڑھ کر مطلع کا سارا لطف غارت ہو گیا۔ ؎

لے رہے ہیں زندگی کے نام پر
زندگی سے انتقام زندگی

اس شعر میں تین جگہ لفظ زندگی برتا گیا لیکن افسوس ہے کہ اسکے باوجود بھی شعر میں
زندگی نہ آپائی ۔ زندگی کے نام پر زندگی سے زندگی کا انتقام لیا جارہا ہے
کیا بات ہوئی ۔ انتقام کون لے رہا ہے واضح نہیں کیا محض لفظوں کے الٹ پھیر
یا پھر محض لفظوں کی تکرار سے شعر ہو جاتا ہے ؟ شاعری کے نام پر ایسی تک بندی
یقیناً قابلِ رد قرار پاتی ہے۔
اسی صفحہ پر چوتھا شعر ہے جو مہمل ہے ؎

ہم کو مغضوبِ جہاں برباد زیست
دیتے آتے ہیں پیام زندگی

شعر مہمل اسطرح سے ہے کہ جو خود مغضوبِ جہاں اور برباد زیست ہو وہ کیونکر
دنیا کو پیام زندگی دے سکتا ہے۔
پانچواں شعر ہے ؎

وقت کے تور سے اندازہ کرو
کتنا برہم ہے نظام زندگی

بظاہر یہ شعر بڑا سیدھا سادہ اور متاثر کن معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت تجزیہ کریں تو بات کچھ اور ہی معلوم ہوتی کہ زندگی کا نظام کس قدر برہم ہے۔ اس انداز وقت کے تیور سے کرد۔ گویا وقت کا تیور ہی نظام زندگی کی برہمی کا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کے نظام کی گڑبڑ کا ذمہ دار وقت کا تیور نہیں بلکہ صفحہ ۱۷ پر شعر درج ہے ؎

ہم جیالوں کی طرح زندہ رہے
بن کے کیا رہتے غلام زندگی

یہاں غلام زندگی کی ترکیب نے چونکایا۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی دو طرح جی جاتی ہے یعنی ۔ آدمی زندگی کو جیتا ہے یا پھر زندگی خود آدمی کو جیتی ہر دو صورت میں زندگی کی غلامی بہرحال ضروری ہے۔ آپ جیالے ہی کیوں اس غزل میں ایک اور اچھا شعر بھی آگیا ہے ۔ جیسے سخت گرمی پڑ رہی اور ایسے میں یکایک پانی برسنے لگے کچھ ایسی ہی کیفیت اس شعر کو پڑھ

سب پر کب کھلتے ہیں اسرار حیات
کیا کہیں کیا ہے مقام زندگی

اسکے باوجود شاعر نے اپنی زندگی کے اسرار سے ناواقفیت کا کھلا کیا ہے اور مقام زندگی کے تعین سے اپنے آپ کو قاصر بتایا ہے ۔ اس مقطع تضاد بیانی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے ؎

چلتی پھرتی لاش ہیں گویا نوید
ہے برائے نام نام زندگی

پہلے مصرع میں صاف طور سے Declare کر دیا کہ زندگی کی زندگی کی ہے پھر دوسرے ہی مصرع میں کہنے لگے کہ زندگی ہے مگر برائے نام۔

مصرعہ ثانی میں بجائے تمام تمام زندگی دو دو جگہ تمام تمام کی تکرار بڑی کھٹکتی ہے۔
صفحہ ۲۷ پر غزل کا پہلا شعر ہے جو حسب ذیل ہے

پیالہ زہر غم پیا ہم نے
تازگی رخ جہاں کے لئے

زہر، مردنی کا باعث ہوتا ہے نہ کہ تازگی کا۔ محض لفظ و معنی سے ہٹ کر الفاظ کو موزوں کر دینا ہی کافی نہیں ان کے معانی و مطالب بھی شعر کی تخلیق کیلئے بے حد ضروری ہیں۔
اسی غزل کا پانچواں شعر ہے ۔

مرہم چشم صد مسیحائی
بک رہا ہے زخم جاں کے لئے

یہ "چشم صد مسیحائی" کیا ہوتی ہے پہلا مصرع اپنی ترکیب کی وجہ سے مہمل ہو کر رہ گیا ہے۔
مقطع سے پہلے والا شعر ہے ۔

بن گیا ہوں چراغ راہ گزر
اپنے گم گشتہ کارواں کے لئے

اے کاش یہاں "اپنے" کی جگہ "تیرے" ہوتا تو شعر کی معنویت کہاں سے کہاں پہنچ جاتی
صفحہ ۵۳ پر مطلع میں دو لختی ہے ملاحظہ ہو ۔

آنکھیں پرنم زلفیں برہم
پچھلی شب برسات کا موسم

مصرعہ ثانی میں برہم کا قافیہ موسم نہیں ہو سکتا اسلئے کہ "برہم" میں "ہا" [illegible]

تیسرا شعر ہے — دل کے اشارے کوئی نہ جانے
ہلکے ہلکے مبہم مبہم

مبہم کا املا غلط ہو گیا ہے اس طرح سے بھی شامل ہو گیا ہے شاعر نے پروف ریڈنگ پر توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے مجموعے میں املا کی کئی غلطیاں در آگئی ہیں، جنہیں راقم الحروف نے اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا ہے۔ پھر بھی املا کی غلطیاں بری طرح کھٹکتی ہیں۔

اسی صفحہ پر چوتھا شعر ہے — زیست کی راہیں ایسی راہیں
جیسے زلفوں کے پیچ و خم

اس شعر میں اسقدر پامال خیال پیش کیا گیا ہے کہ گھن آنے لگتی ہے یہی ایسی نازک تشبیہات کسقدر غلو کا باعث بنتی ہیں۔ کہاں زندگی کی کٹھن دشوار گزار راہیں اور کہاں نرم و گداز زلفیں جن کے پیچ و خم بھی کنگھی کے رہین منت ہیں۔ ویسے بھی ایک مولوی کے لیے اس قسم کے نسخے محض رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔

پانچواں شعر ہے — میری دنیا غم کی دنیا
میرا غم ہے دنیا کا غم

غم کی اس الٹ پھیر نے شعر کا مفہوم ہی خبط کر کے رکھ دیا ہے۔ چلو یہ مان لیا شاعر کی دنیا غم کی دنیا ہے لیکن یہ کیسے مان لیں کہ شاعر کا غم سب دنیا کا غم ہے؟ موجودہ حقیقت پسند دور میں اس غلو کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد کا شعر بھی اسی درجہ کے غلو کا مثالی نمونہ ہے۔

ہو گئے آخر دریا دریا
ہے پھر دو سر قطرہ قطرہ اشکِ پیہم

مبالغہ کی آخر کوئی حد بھی ہے

اس غزل کا مقطع بھی دو لختگی کا شکار ہے

عشق نوید اک تلخ حقیقت

حسن کا جادو عالم عالم

پہلے مصرعے میں کہا گیا ہے کہ عشق اک تلخ حقیقت ہے بات ختم ہو گئی دوسرے مصرع میں اس حقیقت سے ہٹ کر ایک الگ ہی بات کہی گئی کہ عالم حسن کا جادو ہے۔

صفحہ ۴۷ پر تیسرا شعر ہے

ہر ایک کو یکساں بہ نظر دیکھنے والے

ہم پر بھی کبھی چشم کرم کیوں نہیں کرتے

پہلے مصرع میں "بہ نظر دیکھنے والے" کہنا یکسر غلط ہے "بہ نظر دیکھنا" "روزمرہ" نہیں بلکہ صحیح روزمرہ تو نظر سے دیکھنا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں "چشم کرنا" نہیں کہا جاتا۔ اگر کوئی کہتا ہے تو وہ اسکی جہالت ہے اسکی جگہ فصیح روزمرہ ہے "نظر کرنا" جیسے نظرِ کرم کرنا وغیرہ۔

چوتھا شعر ہے

بے وجہ غم دل کی حکایات نہ پوچھو

غم خوار ہو اندازۂ غم کیوں نہیں کرتے

اس شعر میں "بے وجہ" حشو ہو گیا ہے۔ اسکے بجائے مصرع یوں ہوتا تو حشو سے بچا جا سکتا تھا

"رہ رہ کے غم دل کی حکایات نہ پوچھو"

اس کے بعد کا شعر ہے

یہ کالی گھٹا اور یہ موسم کے اشارے
پھر تشنگیٔ ساغر و جم کیوں نہ سہیں کرتے

کالی گھٹا سے ساغر و جم کا کیا علاقہ جبکہ ساغرِ جم کی تلمیح یہاں بے معنی ہو گئی۔ دوسرے مصرع میں ساغرِ جم کی ترکیب اضافی کی جگہ ساغر و جم کی ترکیب عاطفہ استعمال کی گئی ہے جو شعر کو اور بھی مہمل بناتی ہے۔

صفحہ ۷۶ پر مطلع ہے ۔

جس کو دیکھو اپنے اپنے فن میں یکتا ہو گیا
آج ہر فنکار کو ایسا ہی دھوکا ہو گیا

قطعیت کے ساتھ یکتا ہو گیا کہنے کے بعد دھوکا ہو گیا کہنا کہاں تک درست ہے یہ بھی عدم قدرتِ اظہار کی مثال ہے
اسی غزل میں چوتھا شعر ہے ۔

بے سبب ہم بھی مزاجِ دہر سے نالاں نہیں
زندگی کے پیچ و خم کا تجربہ سا ہو گیا!

" یہ تجربہ سا " کیا ہوتا ہے ۔ اس قسم کا اظہار " عدم قدرتِ اظہار " کے زمرے میں آتا ہے ۔

صفحہ ۷۸ پر مطلع ہے ۔ جو بے وزن ہو گیا ہے ۔

عشق رسوا کو جنونِ فتنہ ساماں مل گیا
خیر ہو اب دستِ وحشت گریباں مل گیا

دوسرے مصرع میں دستِ وحشت کے بعد لفظ " کو " غالباً کتابت ہونے سے رہ گیا ہے ۔ لہٰذا مصرع ساقط البحر ہو گیا ہے ۔
اسی غزل کا پانچواں شعر ملاحظہ ہے ۔

ماورائے کہکشاں ہے منزلِ ذوقِ نظر
دیدۂ بینا کو نورِ ماہِ تاباں مل گیا

پہلے مصرع میں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ذوقِ نظر کی منزل ماورائے کہکشاں ہے اور دوسرے مصرع میں ایک بالکل ہی الگ بات یعنی دیدۂ بینا کو نورِ ماہِ تاباں کے مل جانے کی اطلاع بہم پہنچائی جاتی ہے جبکہ دوسرا مصرع مہمل بھی کیونکہ چاند از خود روشن نہیں ہے بلکہ اسکی روشنی مستعار ہے یعنی چاند سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ دیدۂ بینا کو نورِ ماہِ تاباں مل گیا نہایت لغو اور غلط بات ہے۔

اسی غزل کا چھٹا شعر ہے ؎

آخرِ شب کے سسکتے ماہ و انجم کی قسم
اک بجھے دل کو چراغِ داغِ ہجراں مل گیا

مہمل شعر ہے۔ پچھلی شب کے سسکتے ہوئے چاند تاروں کی قسم کھا کر بتایا جا رہا ہے کہ ایک بجھے ہوئے دل کو داغِ ہجراں کا چراغ مل گیا اگر داغِ ہجراں کو دل کا چراغ کہتا یا دل کو داغِ ہجراں کا چراغ کہتا تو کم از کم معنویت تو پیدا ہو جاتی۔ بجھا ہوا دل کہکر شاعر نے ساری بات پلید کر دی۔ اس بجھے ہوئے دل کو چراغ کہیں تو کس منہ سے کہیں۔

اس غزل کا مقطع یوں درج ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

چونک اٹھا ہوں خود اپنے دل کی دھڑکن پر تو یہ
زندگانی کو مری خوابِ پریشاں مل گیا

پہلے مصرع میں دل کی دھڑکن پر چونک اٹھنے کی بات کہی گئی ہے اور دوسرے

رل گیا ہے۔ واہ کیا کہتے اس دولختگی کا بھی جواب نہیں۔

صفحہ ۷۹ پر ایک اور دولختہ ہے جو مطلع ہے ؎

حیاتِ بیکراں ہے اور میں ہوں

یہ قیدِ جسم و جاں ہے اور میں ہوں

پہلے مصرع میں شاعر حیاتِ بیکراں کا ذکر کر رہا ہے اور دوسرے مصرع میں اپنکو جسم و جاں کا قیدی قرار دے رہا ہے۔ یہ شعر اہمال گوئی کی بھی شاندار ہے۔ اِسی غزل کا پانچواں شعر ہے ؎

ستم ہے برق کی نظروں کا مرکز

مرا ہی آشیاں ہے اور میں ہوں

یہ شعر اسقدر پامال خیال پر مشتمل ہے کہ شاعر برق و آشیاں حضرت سے شہیدی بھی شاید اس پامالی پر اظہارِ خیال پسند نہ فرمائیں۔

صفحہ ۸۰ پر مطلع ہے ؎

بے سبب دل بجھا بجھا تو نہیں

شکوۂ آہ نارسا تو نہیں

اول تو یہ کہ مطلع دولختہ ہے پہلے مصرع کا مفہوم کچھ اور ہے تو دوسرے مصر مفہوم کچھ اور۔ علاوہ ازیں شکوہ کا املا بمعنی شکایت غلط ہے صحیح املا مقصود ہے یعنی شکوئی ہے جیسا کہ قبل ازیں بھی تفصیل سے صراحت کی گ

دوسرا شعر ہے ؎ بات کیا ہے کہ کھوئے کھوئے ہو

زندگی میں کوئی خلا تو نہیں

اس شعر میں ردیف ساتھ نہیں دے رہی ہے

یہ آ ش ہو ر ۃ

" آدمی آدمی کا دشمن ہے
یہ جہالت کی انتہا تو نہیں

حیرت اور افسوس ہے کہ اس شعر کا پہلا مصرع مال مسروقہ ہے
ع " آدمی آدمی کا دشمن ہے" پورے کا پورا مصرع مشہور شاعر حضرت ریاست علی تاج کا ہے۔ ملاحظہ ہو " نگارِ حیات" صفحہ ۱۵۷ مطبوعہ ۱۹۸۶ء
ریاست علی تاج کا قطعہ یوں ہے ؎

کیوں ہمارا دیس نردھن ہے
کیوں یہیں زندگی اجیرن ہے
کیوں ہمارے ہی ملک میں آخر
آدمی آدمی کا دشمن ہے

یہ پورے کا پورا قطعہ مشہور محقق و نقاد ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب " اردو کا نیا عروض " میں بھی شامل کیا ہے۔ بہرحال عرض کرنا ہے کہ اگر مصرع اچھا لگا تھا اور آپ اس پر طبع آزمائی کرنا چاہتے تھے تو کم سے کم مصرع کو واوین (   ) میں رکھتے۔ لیکن مصرع بھلا کا توں اڑا لینا سرقہ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر شاہد جمیل
(بی۔اے آنرس، ایم اے، پی ایچ ڈی)
محکمۂ حیات، پٹنہ سکریٹریٹ
بہار سرکار، پٹنہ

ڈاکٹر محبوب راہی کے شعری مجموعہ پیش رفت پر تبصرہ

نام کتاب : پیش رفت (شعری مجموعہ)

شاعر و ناشر : ڈاکٹر محبوب راہی

سنہ اشاعت : ۱۹۹۴ء

صفحات : ۱۶۰

قیمت : پچاس روپے مجلد

پتہ : مفیض احمد خان، ایم۔ایم۔ اجنی بارسی ٹاکلی (مہاراشٹر) و دیگر

مبصر : ڈاکٹر شاہد جمیل، پٹنہ

ثبات، تردید، اور بازیافت، کے بعد ۱۹۹۴ء میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنو کے مالی اشتراک سے منظرِ عام پر آنے والا، پیش رفت، ڈاکٹر محبوب راہی کا چوتھا شعری گلدستہ ہے، جسے انھوں نے غزلوں، نظموں، قطعات و رباعیات اور نظمیں بحسن و خوبی سجایا ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف ...

کے باوجود بیشتر شعری مجموعوں نے اس طرح اپنا وقار و اعتبار کھویا اور شائقین شعر و ادب کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے کہ وسیع المطالعہ، بالغ النظر اور عدیم الفرصت قارئین بھی اب انتخاب اور ردّ و قبول کے عمل میں احتیاط سے کام لینے لگے ہیں جس کے سبب گندم نمائی جو فروشی کا کاروبار مشکل تر ہو گیا ہے۔ دوسری جانب معتبر شاعر کو بھی شکایتاً بلکہ بطور احتجاج کہنا پڑا کہ

ہم بھی ایسے دور میں شاعر ہوئے راہی کہ جب
قدرِ شاعر، قیمت شعر و ادب کچھ بھی نہیں

'پیش رفت' کے مطالعہ کے بعد مسرت و اطمینان کا احساس ہوا کہ یہ شعری مجموعہ دیدہ زیب طباعت اور عمدہ گٹ اَپ کے ساتھ ساتھ فکری بلندی، فنی رکھ رکھاؤ، موضوعات کی ندرت، الفاظ و بیان کی خوبصورت ادائیگی کے علاوہ دعوت مطالعہ کی بے پناہ کشش بھی رکھتا ہے ان کے اسباب بالکل واضح ہیں کہ راہی نے زندگی کو صرف قصے اور کہانیوں میں پڑھا اور نہ فلموں اور ڈراموں میں فقط دیکھا ہے بلکہ انہوں نے اس کی رعنائیوں اور نیرنگیوں سے حظ حاصل کیا اور کرب و اذیت کی صلیب کو کندھوں پر لیے طویل مسافت طے کی ہے۔ یعنی انہوں نے زندگی کو بغور دیکھا و پرکھا اور بہ شدت محسوس کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا مشاہدہ عمیق، تجربہ پختہ تر اور بیان میں تاثیر و اثر انگیزی ہے۔ معاملات عشق و محبت، تہذیب و اقدار کے انحطاط و زوال، فرقہ وارانہ فسادات، غربت و معاشی بدحالی، عدم مساوات و احساس عدم تحفظ اور عریانیت و بے حیائی جیسے پامال موضوعات میں بھی وہ جدت و ندرت پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ فکر کو اس طرح فن کے سانچے میں ڈھالتے ہیں جس طرح ماہر فن کمہار مٹی کے بے وقعت لوندے کو خوبصورت صراحی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

جناب محمود سعیدی نے سچ لکھا ہے کہ

"محبوب راہی کا کلام جہاں ایک طرف جدید شاعری کے قاری کے لئے اپنے اندر دلچسپی کا پورا سامان رکھتا ہے وہیں دوسری طرف ان لوگوں کو بھی مایوس نہیں کرتا جو شاعر سے ایک خاص قسم کے فن رکھ رکھاؤ کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

بخوفِ طوالت اپنے بیان کی تائید میں چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

رکھ دیئے تھے گھر کے سارے بھید اس پر کھول کر
میں نے سوچا تھا' وہ میرا اپنا ہم سایہ تو ہے

آ! تیری خستگی کا مداوا ہے میرے پاس
میرا لہو حلال ہے تجھ پر میرے عزیز

شہر بھر میں صرف بڑوں کی کٹا کٹ کے سوا
لوریاں' کلکاریاں' سنگیت' نغمے بند ہیں

ہر خونی کے' ہر قاتل کے !!
جسم پہ خاکی وردی کیوں ہے

ذرا سی چھاؤں تھوڑا سا اجالا !
ہمارے واسطے اتنا بہت ہے

تردید کر رہا تھا۔ تعمیل کر رہا ہوں
میں اس طرح اپنا لہجہ تبدیل کر رہا ہوں

کچھ عجب انداز سے وہ گفتگو کرنے لگے
آپ سے تم تک پہنچ کر تم سے تُو کہنے لگے

ایک پرچھائیں ہے مفلس کا جوانی ایک خواب
جانے کب آتی ہے کس طرح گزر جاتی ہے

نمازی سو رہے ہیں مسجدوں میں
فقط محراب و منبر جاگتے ہیں

گاؤں کی اونچی حویلی کے مکیں
بیشتر شہروں کی سڑکوں پر ملے

خلوص اور دورِ حاضر میں راہی
یقیناً آپ کو دھوکا ہوا ہے

نظموں میں جانِ غزل' اور زندگی کیا ہے۔ قابلِ ذکر ہیں۔

میں یقین و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شعری ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات 'پیش رفت' کے مطالعے سے محظوظ و متاثر ہوں گے۔ سرورق اور کتابت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔

سرتاج معانی (بمبئی)

انشائیہ

کنکر بولتے ہیں

اگر یہ مقولہ رشید احمد صدیقی نے کہا ہوتا تو ارباب سخن "صدقت یا رشید"
کہکر نہ صرف اسے قبول کر لیتے بلکہ اسے کلیہ سمجھ کر ادب کی کھونٹی پر لٹکا دیتے
ہندوستانی ادب میں ایک ایک بڑی خاص بات ہے وہ یہ کہ اگر کوئی دانشور
مثلاً نقاد کسی اسٹیج پر یا اپنے ڈائیننگ ٹیبل پر بیٹھ کر بھی کوئی بات کہدیتا ہے
واہ اسمیں اسکا تجربہ یا مشاہدہ شامل ہو یا نہ ہو تب بھی ہمارا ادب لبیک کہہ کر
اسے صفحۂ قرطاس پر رقم کر لیتا ہے۔ لیکن یہ مقولہ "کنکر بولتے ہیں" چونکہ
راقم الحروف کا ہے۔ ظاہر ہے ارباب سخن کے پاس اتنی گھاس کہاں ہو گی اور اگر
ہو گی بھی تو کم از کم ایک غیر معروف آدمی کیلئے وہ قطعی فضول خرچی پر آمادہ نہیں ہونگے۔
لیکن راقم الحروف میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک ادیب اور شاعر میں
ہوتی ہیں۔ لہذا وہ انہیں نہ صرف گھاس ڈالنے پر مجبور کر دیگا بلکہ انہیں اس حد تک
مرعوب بھی کر دیگا کہ وہ راقم الحروف کی بھینس کے آگے بین بجانے پر مجبور ہو جائیں
گے ..... لیکن اس معاملے میں نگاری کو راقم الحروف سے نہ صرف
ہضم کرنا پڑیگا۔ بلکہ راقم الحروف کی تحقیقی سرگزشت پر ایمان لانا

بھی ضروری ہے نیز اس مقولے کی معنویت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے قاری کو ہمت سفر بھی مددگار ہے۔ اگرچہ قاری راقم الحروف پر اعتماد کر لیتا ہے تو ممکن ہے چند اصطلاحوں اور علامتوں کا وہ ذکر کریگا اُن سے اظہار و ابلاغ میں کافی مدد ملے اور راقم الحروف کو یہ دعویٰ کرنے کا موقع بھی ملے گا کہ حیدرآباد کے ادیب پر یہ مقولہ پوری طرح صادق بھی آتا ہے۔ تو آیئے شروع کرتے ہیں اپنا یہ تحقیقی سفر "کنکر بولتے ہیں"

ع طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں۔۔

میں آپکو ایک ایسی شخصیت سے ملاتا ہوں جس کے نام کے آگے آٹھ ڈگریاں ہیں (چونکہ یہاں کی حکومت ڈگری ہولڈرس حضرات کی افزائش نسل پر کافی توجہ دے رہا ہے جس نیچے یہاں ڈگری ہولڈرس زیادہ قابل اور باصلاحیت کم جنم لیتے ہیں۔)

یہ موصوف چونکہ شاعر بھی ہیں اسیلئے اپنا تخلص کاذب لکھتے ہیں۔ ویسے اس نام پر آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ آپ جانتے ہیں ایسے نام ترقی پسند مصنفین کی مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ اور پھر ہائیکو۔ ترائیلے۔ سانیٹ جیسے نام گوارا کرکے آپنے اسے ادب میں شامل کر لیا تو پھر کاذب کیا بُرا ہے۔ صفت پر غور نہ فرمائیں آپ۔ کیونکہ شاعر کی ہر صفت ہمارے ادب کیلئے قابل قبول ہوتی ہے۔ جیسے کہ نظم آزاد ہوکر بھی پابند ہوتی ہے۔ اسکی اس چال کپٹ فطرت کو بھی آپنے گوارا کر لیا لہٰذا کاذب کی فطرت کو بھی آپکو قبول کرنا ہوگا تو جناب، کاذب صاحب کے نام کے آگے فیڈ ایشین، فلاسفر، لیگل ایڈوائزر۔ ایجوکیشنلسٹ، سائنٹسٹ، لٹریرین ہسٹورین، آرکیالوجسٹ اور استاد الشعراء کی ڈگریاں ثبت کی گئی ہیں۔ موصوف کی ساری قابلیتیں عثمانیہ یونیورسٹی سے منسوب ہیں۔ بےشک عثمانیہ یونیورسٹی تعلیم کا ایک صداقت نامہ ہے لیکن پتہ نہیں کیا بات ہے کہ یہ صداقت نامے موصوف

یت کی نہ تطہیر کرتے ہیں اور نہ تشہیر۔ ! جبکہ موصوف کی شخصیت اِن
ت ناموں سے لبریز ہے سوائے شاعری کے۔ ویسے شاعر ہونے کیلئے کسی
نت نامے کی ضرورت نہیں شاید اسی لیے میرے شہر کے رکشا اور آٹو ڈرائیورس بھی
صنفِ سخن میں کافی طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ شناخت کیلئے اپنی غزل کا حاصلِ غزل
پنی رکشا اور آٹو رکشا کے پیچھے رقم کر لیتے ہیں۔ ابھی پرسوں کی ہی بات ہے کہ
کے رکشا اسٹانڈ پر کھڑی ایک آٹو رکشا کے پیچھے رقم کئے ہوئے علامہ اقبال کے
شعر کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ علامہ کی روح کانپ اُٹھی ہوگی۔
نے اُن آٹو ڈرائیور صاحب سے دریافت کیا کہ جناب یہ شعر میرا خیال ہے آپکے اپنی
طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ نہایت ہی طمطراق سے کہنے لگے۔ جناب دراصل
شعر کو ماڈرنائز کیا گیا ہے۔ تب میں نے پوچھا کہ جناب کس قبیلے سے تعلق ہے
۔؟ بیچارہ بڑی سعادتمندی سے کہنے لگا جی وہ۔۔ ترقی پسند مصنفین سے
سب ملتا ہے ہمارا۔۔۔ " ہماری زبان اور ادب کا یہ المیہ رہا ہے کہ زبان
لہجہ کی شکار اور ادب تجاہلیوں کا شکار۔۔ بہرحال رکشا والے نے علامہ
کے شعر کو کیسے ماڈرنائز کیا تھا وہ ملاحظہ فرمائیے۔ ع

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہمالہ کی چوٹی پہ چڑھ جا
خدا بندے سے تب پوچھے کہ بچو اب اترے گا کیسے

ترقی پسند ادب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ لفظی لن ترانیوں کو بھی انہوں نے
کا ایک حصہ بنا لیا ہے۔ خیر صاحب میں کاذب صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں
ر کر رہا تھا اور آپ کو یہ یاد کروا رہا تھا کہ اِن کی قابلیت پر اعتراض کرنے
کو بالکل گنجائش نہیں کیونکہ صنفِ شاعری یکساں رول کو کسی طرح اہم ہے۔ یہاں
خدا نے اپنا نشانہ یہ مسئلہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ شاعر چھوٹا ہو یا بڑا بہرحال شاعر

ہوتا ہے۔ جیسے کہ اگر جوش ملیح آبادی کے ساتھ پاشو میاں رکشا والے نے بھی مشاعرہ
پڑھا ہوگا۔ تو وہ ایک ہی صنف کے شعرا کہلائیں گے۔ دیکھئے شاعری میں واقعی کتنا
سیکولرزم ہے کہ پاشو میاں کو جوش کے ساتھ پڑھنے کا لطف حاصل ہے اور جوش
کو پاشو میاں کے ساتھ اردو شاعری قومی یکجہتی کی ایک ایسی اعلیٰ مثال ہے
جہاں کعبے کا برہمن گوشت خور ہوتا ہے اور کاشی کا ملا میرا جی کی نظموں میں تصوف
کی معراج پاتا ہے۔ ایسی سیکولر صنف سخن میں میں سمجھتا ہوں کاذب صاحب
کی صلاحیتوں پر رشک کرنا گناہ کبیرہ ہوگا۔ لیکن ایک بات کہنے پر زبان
مجبور ہے۔ وہ یہ کہ اتنی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے والے شاعر کی غزل میں ہمیشہ ایک
یا دو شعر وزن سے گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ خیر گرنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ادبی
حادثے ہیں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میرے شہر میں تو کوئی اخبار کے دفتر کی سیڑھیوں
سے ہی گر جاتا ہے۔ کوئی نظروں سے گر جاتا ہے۔ اور کوئی تو اپنے معیار سے ہی
گر جاتا ہے۔ خود میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔ اکثر اپنی بیوی کو دیکھ کر میرا
درجۂ حرارت گرنے لگتا ہے۔ اجی اک میں ہی کیا ہماری سرکار کی روش کو دیکھ کر
ہمارے عوام کا اخلاقی معیار دیکھئے نا؟ کتنا گرتا جا رہا ہے۔ یہ کوئی خاص بات
نہیں ہے۔ دنیا ہے یہ۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ گرنے سنبھلنے کا سلسلہ آج سے
نہیں صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اب اک کاذب صاحب کی غزل کے چند اشعار وزن
سے گرتے ہیں تو کونسی قیامت آجائے گی۔ اجی اتنا گرنے کے باوجود بھی
دیکھئے نا شاعر کی شخصیت کھڑی کی کھڑی ہے۔ ہاں افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان کی
غزل میں جو اشعار وزن سے گرے ہوئے نہیں ہوتے وہی ان کی شخصیت پر رشک
و حسد کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی شعر و سخن میں یہ "بلا گو" کہلاتے
ہیں۔ بہر حال صاحب کا یہ کہنا کہ جب بولنے لگتا ہے تو بڑی بڑی چٹانیں بھی اس کا

نے تکنے لگتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کنکر بولتا کیوں ہے ۔ ؟
تا یہ تو فطری بات ہے۔ اتنی ٹھوکروں کو اپنے سر لیے یہ تو بولے گا ہی ۔ اور
۔ بولتا رہے ۔ !!!

اب آئیے ایک اور کنکر کی طرف میں آپکی توجہ دلاؤں ۔ یہ بھی ایک شاعر
یا۔ چونکہ شہر کے ایک روز نامے میں بحیثیت پروف ریڈر فائز ہیں جس کی وجہ
سے ان کے ایک دو نہیں بلکہ مارکیٹ میں پورے نو مجموعے آچکے ہیں۔ چونکہ کتابت
شاعت کا بل روزنامے کے کھاتے میں جاتا ہے لہٰذا انہوں نے اور دس مجموعے
شائع کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کا ایک شعر بھی کسی کو
نہیں ان کے تعلق سے ایک بات بہت مشہور ہے جس طرح مسلمانوں کے گھروں میں
ب بچہ پیدا ہوتا ہے تو گھر کے بزرگ اس کے کان میں اذان دیتے ہیں ٹھیک اسی
رح جب یہ پیدا ہوئے تھے۔ تب ان کے والد بزرگوار نے بجائے ان کے کان میں
ان دینے کے یہ کہدیا کہ بیٹا جب بھی کسی روزنامے میں ادبی صفحہ دیکھنے پر فائز
ہو تو شعراء اور ادیبوں کے نام کو بگاڑ کر شائع کر دینا اور الزام کاتب کے سر
دینا ۔ اس حرکت ناروا سے تمہارا معیار تو گر ہی جائے گا لیکن اخبار کا معیار
ند ہو جائے گا ۔ یہ موصوف آج تک اس اذان کے حقوق ادا کر رہے ہیں خود
یار گھٹاتے جا رہے ہیں اور اخبار کا معیار بڑھاتے جا رہے ہیں۔ ویسے اپنی
س موروثی صنعت پر بڑا فخر ہے انہیں۔ چونکہ ان کا تخلص "خنجر" کا ہم قافیہ
ہے لہٰذا یہ اپنے ہم قافیہ تخلص کے معیار پر پورے اتر رہے ہیں۔ اور پھر روزنامے
کے ایڈیٹر کی جوتیاں سیدھی کرتے کرتے بے چارے شہر کے بہت بڑے نقاد،
نشاپرداز، محقق اور نہ جانے کیا کیا ہو گئے ہیں۔ ادب کا یہ کنکر اتنی گری ہوئی
لیتی کرنے کے باوجود بھی اپنے حلقے میں کافی مشہور ہے ۔ ان کی ایک معشوقہ

ہمیر انگمیرے پیچھے " دیکھئے نگر تو آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے شعر کو کہتے ہیں۔
ب آپ ذراسا "پیچھے" پر غور کیجے۔ لغوی معنوں میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنوں میں
پیچھے چلنے لوگوں کو کہتے ہیں بلکہ آپ تا اہل شہر کو کہتے ہیں جنہیں صرف اخبار میں
چھپنے کا ہوکا ہوتا ہے۔ جس کیلئے وہ دام درم سخن بانی انجمن کی خدمت میں لگے
رہتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو چھپیں گے کیسے۔ لہٰذا کبھی آپکو وہ "روزنامہ"
دیکھنے کا اتفاق ہو تو آپ محسوس کریں گے کہ جتنے بھی شعرا اس میں چھپتے ہیں وہ سب مضافاتی
علاقے کے ہوتے ہیں۔ جہاں ہمیشہ ادبی قحط پڑا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ ادب کے
مدرج جو "خچر" کے ہم قافیہ ہیں اسی طرح کی نامعقول حرکتیں کر کے مسند معلیٰ
بیٹھے ہوتے ہیں۔ شہر میں کوئی اتنا غیرت مند بھی نہیں کہ اس خچر کا کان پکڑ کر
نیچے اتار دے۔ شاید ارباب سخن ایسا اس لیے نہیں کرتے ہونگے کہ وہ اچھی طرح
جانتے ہیں کہ اخبار سے یہ شخص ہٹا تو اسکی حیثیت صفر کے برابر بھی نہیں ہے ادب
میں — ! لیکن فی الوقت جہاں یہ ایستادہ ہے۔ وہاں سے تو بہت بولتا ہے!
آئیے ایک اور کنکر ملاحظہ فرمایئے۔ یہ بھی شاعر ہے ویسے شہر میں
"نجیب الطرفین شاعر" کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نجیب الطرفین سن کر
چونکے ہونگے۔ چونکئے نہیں۔ میں وضاحت کر دیتا ہوں۔ یہ شاعر نجیب الطرفین
اس لئے ہو گیا کہ اسکے نیچے بڑی اعلیٰ شخصیتوں کے مالک ہیں۔ اب آپ ان نیچوں کا
اندازہ لگا لیں گے۔ جو ہمیشہ شاعر کے کندھوں پر سوار رہتے ہیں۔ پہلے میں بتا چکا
ہوں۔ اسکے دائیں طرف "خچر" کے ہم قافیہ شاعر کا دست حمایت رہے تو
دوسری طرف شاعر کی اپنی بیوی سوار ہے۔ ایسے شاعر کو میرے شہر میں
"نجیب الطرفین" کہا جاتا ہے۔ ویسے کاذب جدید کے نام سے اس نے بھی
شہرت پائی ہے۔

اس کے "خدوخال" کے بارے میں منکرانِ شعر یہ بتاتے ہیں کہ یہ بالکل ساؤتھ افریقہ کے حبشیوں کی طرح سیاہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ساؤتھ افریقہ کے حبشیوں کا صرف ظاہر سیاہ ہوتا ہے۔ اسکا ظاہر باطن دونوں سیاہ ہیں۔ اب آپکو اس کے نکیلے پن پر اعتراض ہوگا کہ اس شاعر کے ایک طرف تو "نجمہ" کا ہم قافیہ شاعر ہے جو ادب کا سورج بنا پھرتا ہے لیکن اس کی ساری تمازت اور تمکنت کاذب جدید کی بیوی کی ضیا خوشی کی مرہونِ منت رہتی ہے تو دوسری طرف کاذب جدید کی اپنی بیوی اس پر سوار ہے۔ آپ معترض نہ ہوں ادب میں ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ ویسے کچھ اربابِ سخن نے ایسے شاعر کو ادب کا "مسلمان رشدی" مان کر اسکے خدوخال پر موت کے فتوے کا اعلان کر دیا ہے۔ بس اسی دن اس کی موت بھی واقع ہو گئی۔

اس کے مجموعۂ کلام کا نام ہے "خدوبال"۔ آپ "خدو" پڑھ کر ہنس رہے ہونگے۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے صاحب۔ ندا فاضلی کا مرغا چونچ میں سورج کو لیے جب بانگ دے رہا تھا تب آپنے مرغے کو بھی قبول کیا۔ اسکی چونچ کو بھی قبول کیا اسکے سورج کو بھی قبول کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ مرغ کی بانگ پر Theoress لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی حاصل کر لیں تو پھر "خدوبال" پر آپکو کیا اعتراض ہے۔ یہ تو ایک فلسفہ ہے۔ ہاں خدا نعایت فرسودہ ہے مگر فلسفہ ہے تو سہی۔ دیکھیے۔ جسطرح اردو شاعری میں ایک زمانے میں متروک اور متروک قافیوں پر ٹاٹ لگا دیا گیا تھا اسی طرح نثر میں بھی "غلط العام" پر ٹاٹ لگا ہوا تھا لیکن خدا بھلا کرے ترقی پسند مصنفین کا بالخصوص سجاد ظہیر اور ندا فاضلی کا کہ انہوں نے ادب سے نہ صرف ٹاٹ کو ہٹا کر ادب پر یہ بات الم نشرح کر دی کہ مکروہاتِ ادب دراصل متعہ سخن

کی وہ TEST TUBE BABIES ہیں جنہیں قطعی ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی لیے ترقی پسند مصنفین کی ٹسٹ ٹیوب بے بی کا نام نثری شاعری رکھا گیا ہے۔ تو جناب اصناف کی دنیا حالی اپنی جگہ اور نئی صنف سخن کی ایجاد اپنی جگہ ۔ ہر نئی چیز پہلے عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے بعد میں آدمی اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ شروع میں نثری شاعری پر مجھے بھی بہت شک ہوا کرتا تھا جیسے شروع شروع میں مائیکل جیکسن کی جنس پر شک کیا جاتا تھا۔ لیکن آج مائیکل جیکسن ہمارا آئیڈیل بن چکا ہے۔ غزل اور نظم کے شغلی عمل سے ہم جس دن باہر آئیں گے اس دن نثری شاعری ہم سب کا آئیڈیل بن چکی ہو گی۔ میں تو صاحب اس کا عادی ہو چکا ہوں ۔ ابھی حال ہی میں مجھے ایک شعری نشست میں مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے پہنچنے میں ذرا سی تاخیر ہو گئی مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک شاعر اپنی نظم کے یہ مصرعے بالکل فلمی انداز میں پڑھ رہا تھا۔

تم اپنے درختوں کو
جب چھوڑ کر جا رہے تھے
تو دریا نے اپنے ہی پانی سے
پانی نے دریا سے سرگوشیاں کیں ۔

ہال واہ واہ واہ کے نعروں سے گونج اٹھا ۔ میں نے بھی خوب واہ واہ کی۔ لیکن میری واہ واہ میں ایک ایسا بھی پوشیدہ تھا جو شاعر کی کم مائیگی پر ماتم کر رہا تھا لیکن ایک میرے ایڑیاں رگڑنے سے کیا ہو گا۔ ادب کے اصطلاح تو ایسی شاعری کے حق میں نہ صرف اپنا عندیہ دیا ہے بلکہ سند اس کی بھی دی ہے۔ خیر صاحب بات ہو رہی تھی کاذب صاحب کی ۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ موصوف خدوخال اور حق دونوں "نثر" کی طرح واضح ہوتے ہیں۔

لیکن پھر بھی فن پر "نحر" بول رہے ہیں۔ یہ تو خیر لغوی معنٰے ہوا۔ اصلاحی معنوں میں "نحر" کنکر ہے۔ اور کنکر بول رہے ہیں۔ کیوں نہ بولیں گے کیوں کر کنکر بولتے ہیں۔ بورڈ

اب آیئے ایک اور کنکر اچھالتے ہیں۔۔۔۔ یہ بھی شاعر ہیں۔ ان کا نام خبیث ابتر ہے۔ یہ نام انہیں ورثے میں ملا ہے لہٰذا اس نام پر ان کا موروثی حق بھی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام کا نام ہے "دھاندلی کے پھول" آپ حیران نہ ہوں بڑے شاعروں کے مجموعہ کلام کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پاکستان سے ایک صاحب آئے تھے انہوں نے یہاں ادبی سروے کیا تو پتہ چلا کہ شہر میں یہ تین نفوس ہیں نحر، کاذب جدید اور خبیث ابتر یہ تینوں ادب کا وہ نجس مادہ ہیں جو ہمیشہ گروپ ازم کے سبب پسیجتا رہتا ہے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ فی الوقت ہمارا ادب علیل ہے۔ ادب کو ایک نہیں تین کینسر ہو چکے ہیں۔ اور ان کا آپریشن بے حد ضروری ہے۔ خیر تو صاحب بات ہو رہی تھی خبیث ابتر کے مجموعہ کلام "دھاندلی کے پھول" کی۔۔۔۔ ابھی حال ہی میں خبیث ابتر کا تہنیتی جلسہ شہر کے عظیم الشان ہال میں منعقد ہوا۔ ہمارے ایک ادبی نمائندے نے بتایا کہ اس عظیم الشان جلسے کے عظیم الشان ہال میں کل آٹھ شاعر اور چھ سامعین تھے۔ آپ سوچیں گے کہ اتنے کثیر الآبادی والے شہر میں صرف چھ سامعین۔ جناب سیدھی سی بات ہے۔ جس جلسے میں نحر کاذب جدید اور خبیث ابتر ہوں وہاں سامعین کیسے جا سکتے ہیں۔ آخر ان کا اپنا بھی کچھ معیار ہے کہ نہیں ہاں ایسے لوگوں کا جلسہ قالین نواز ہال میں کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ 12×8 کی مکانیت والے کمرے کو ہال کہہ کر اور اسے باوزن ہال بنا کر یہ اپنے آپ کو کامیاب سمجھ سکتے ہیں۔

"مشاعرہ کامیاب رہا" کہہ کر کم از کم کچھ تسلی تو ہوتی ہو گی۔ بیچاروں کو ــــ!

* دراصل ایک گروپ ہے شاعروں کا بلکہ کنکروں کا اور اس کی قیادت اُس

بے عمل اور بدکردار شاعر کے ہاتھوں میں ہے جس نے اپنے اُستاد پر جوتا اُٹھایا تھا۔
ان لوگوں کو تنقید کا بھی بڑا شوق ہے۔ ایک دن اتفاق سے میں بھی ان کے چنگل
میں پھنس گئی۔ میرے بارے میں انھوں نے ایک اعلان بھی کیا کہ وہ سرتاج معانی تنقید
کے شکنجے میں "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ میں تو خوش ہو رہا تھا کہ اس
بہانے کم از کم ان کا قد تو ناپا جائے گا اور پھر کسی شاعر یا افسانہ نویس پر
نقد و تبصرہ کرنے کے لیے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں کافی تھیں۔ غالب
کے پاس کہاں اتنی ڈگریاں تھیں۔ پھر بھی انھوں نے فارسی لغت کی مشہور کتاب
"برہانِ قاطع" پر زبردست تنقید کی تھی یہی نہیں بلکہ "برہانِ قاطع" کے مقابل
"قاطع برہان" بھی مرتب کی تھی۔ ادھر مرزا غالب کے کلام میں مولانا نظم طباطبائی
نے بھی بہت ساری فنی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور دوسری طرف غالب کی
سبھی آبرو پر یگانہ چنگیزی نے بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ بلکہ یہ عمل چونکہ [illegible]
تھا جس کی وجہ سے وہ "غالب شکن" کہلانے پر سرتاج معانی چہ معنی دارد۔ لیکن
یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ [illegible] شہر میں تنقید کا مطلب تنقیص کے اور کچھ
نہیں بلکہ میں اسے تنقیص کہہ کر تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہا ہوں۔ در اصل یہ ہے کہ
یہاں تنقید دشنام طرازی کا نام ہے۔ شاید اسی لیے رشید احمد صدیقی نے تنقید نگاری کو
سفلی عمل کا نام دیا تھا۔ اس طرح کے تنقیدی ادب کا نمونہ آپ کو دیکھنا ہو تو آپ
بڑے شہر چلے جائیے یہ شہر ایسے ہی ادب کا گہوارہ کہلاتا ہے۔ ایک ہی مذاکرہ
میں شرکت کر کے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ ادب کا انسائیکلو پیڈیا کیا ہوتا ہے
[illegible] کہتا ہے ہمارے ادب میں جمود ہے۔ قطعی غلط بات ہے۔ پرانا شہر اس
صنفِ سخن میں بہت آگے ہے۔ تو جناب یہ گروپ مجھ کو تنقید کرنے کا ایک
بہانا ہے حالانکہ علم و فن یہاں بھی فقدان ہے لیکن [illegible]

"لندن کی ایک ریالی"

برطانیہ کے دارالحکومت لندن میں جہاں کے لوگوں کا ایمان
ہے کہ دنیا کو چلانے والا ایک انگلش باشندہ ہے، ان دنوں اسلام تیزی کے ساتھ
پھیل رہا ہے اور ملکہ الزبتھ اور وزیراعظم برطانیہ پر کھلے عام زور دیا گیا ہے کہ وہ
مشرف بہ اسلام ہوجائیں۔ اسلام کو پھیلانے اور عوام کو اسلام میں لانے کی مہم "حزب
التحریر" اور اسلامی انقلابی پارٹی نے شروع کر رکھی ہے اور انہوں نے سارے برطانیہ
کے عوام کو مشرف بہ اسلام ہونے کی دعوت دی ہے اس سلسلہ میں ایک ریالی ٹرافیلگر
اسکوائر پر منعقد ہوئی تھی۔ اس ریالی میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی اور اس
کا فوری اثر بلجیم کی ایک خاتون پر ہوا۔ جو فوری اس ریالی کے منتظمین کے پاس آئی اور
اسلام قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ وہ برطانیہ کو ایک عیسائی کی حیثیت
سے آئی تھی اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے ملک بلجیم واپس جارہی ہے، جس کے لئے
وہ اللہ جل شانہ کی مشکور ہے کہ اس کو راہ حق کا راستہ دکھایا۔ اس کے ساتھ ہی یورپی
روایات کے اس مرکز ٹرافیلگر اسکوائر کی فضا "اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھی۔ اس
کے بعد یکے بعد دیگرے کئی افراد نے قبولیت اسلام کا اعلان کیا۔ اس ریالی میں شرکت کیلئے
برطانیہ کے مختلف شہروں سے مسلم مرد و خواتین آئے تھے اور انہوں نے اسلام قبول کرنے والا

مبارکباد دی اور اظہارِ یگانگت کیا۔ اس ریالی میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے
اد شریک تھے۔ بیجوڈا بیر وراج نامی ایک نوجوان لڑکی نے جذبات سے مغلوب انداز
یں قبولیت اسلام کا اعلان کیا ایک اور سابق سکھ لڑکی نے بھی اسلام قبول کر لیا۔
گ راہ حق کا راستہ نصیب ہونے پر بے انتہا خوش نظر آرہے تھے۔ اس کے علاوہ
ند افریقیوں اور انگریزوں نے بھی اعلان کیا کہ وہ "جئیں گے تو ایک مسلمان کی حیثیت
اور ایک مسلمان کی حیثیت سے مریں گے" شمالی مشرقی ایشیا کے ایک اور
شندے نے اعلان کیا کہ وہ بدھ ازم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر رہا ہے ان تمام کے
ے اسلامی نام رکھے گئے۔ اس ریالی میں نہ صرف اسلامی روایات و اقدار کا پروپیگنڈہ
یا گیا بلکہ بوسنیا، کشمیر، چیچنیا اور فلسطین میں مسلمانوں کے حالات کا تذکرہ بھی
کیا۔ اس ریالی میں ایک قرار داد منظور کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ برطانوی
سلمان مسلمانوں کی مقبوضہ اراضیات، بوسنیا، کشمیر، چیچنیا اور فلسطین کو آزاد
رانے کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ برطانوی شہری بعد میں
پہلے صرف ایک مسلمان رہیں۔ "حزب التحریر" کے کئی قائد میاں متورین نے اس
قع پر زبردست تقاریر کیں۔ یہ تنظیم برطانیہ کے کئی کالجوں میں سرگرم عمل ہے۔ ایک
رنے کہا کہ عیسائی عوام جن یسوع مسیح کو مانتے ہیں، وہ خود ایک مسلمان تھے۔ انھوں
نے تمام برطانیہ کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح ۱۴ سو
سال قبل مکہ شریف میں غیر مسلموں کا عروج تھا، وہی حال آج انگلستان کا ہو رہا ہے
یہاں بھی آئندہ برسوں میں مسلمانوں کا ایک بڑا مرکز بن جائے گا۔ جناب عمر باقری محمد
اس موقع پر اپنے خطاب میں کہا کہ اسلام میں نسل پرستی کی گنجائش نہیں ہے
انھوں نے کہا کہ ایسے افراد جو اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں لیکن ہراساں کئے جانے
خوف سے تذبذب کا شکار ہیں، انہیں مسلم برادری کی جانب سے ہر قسم کا تحفظ

فراہم کیا جائے گا انہوں نے اور دوسرے کئی مقررین نے دعویٰ کیا کہ مسلمان ہونا ایک قابلِ فخر بات ہے۔ انہوں نے خلیفہ تحریک کی پرزور تائید کی اور کہا کہ اسی طرز کے اصولوں سے دنیا میں امن و سکون قائم ہو سکتا ہے۔ اس ریالی کے مقررین نے مغربی طرزِ تہذیب سیکولرازم اور دوسری صیہونی طاقتوں کے علاوہ کلنٹن اور جان میجر کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے اسلامی اصولوں کی نفی کرنے والے مسلم ممالک پر بھی تنقید کی

سلسلہ ۴۷

تو اب ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ آج وہ دور بھی تو نہیں کہ " ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا " پر آنسو بہائے جاتے تھے۔ آج کل تو ادب کی مسندِ معظما پر ایسے ہی "اُلّوؤں" کا چلن ہے۔ یہ پنجر۔ یہ کاذب جدید۔ یہ جنیشِ ابتر یہ کنکر اتنا بول رہے ہیں آج کل کہ ادب گونگا ہو چکا ہے۔ لیکن انہیں اس کا کوئی احساس نہیں۔ یہ بولتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ بولنا تو ان کی سرشت میں لکھا ہے۔ کنکر جو ہیں۔ اور۔ کنکر بولتے ہیں۔ اِرا۔ اِرا

بلا تبصرہ

سپریم کورٹ نے ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی سفارش تو کر دی
۔یہ نہیں دیکھا کہ) ہندوستان ایک رنگا رنگ ملک ہے، جہاں مختلف تہذیبیں پائی
تا ہیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں، اس لیے یہاں یکساں سول
کا نفاذ بہت مشکل ہے (اس میں بہت ساری دشواریاں پیش آئیں گی) یہ قانون تمام
وقوں کو ہی گوارہ نہیں ہوگا۔ جہاں ایک طرف شمالی ہندوستان میں خونی رشتوں میں
لک افراد کے درمیان شادی معیوب سمجھی جاتی ہے وہیں کرناٹک میں قدیم برہمن
ندانوں میں ماموں کی شادی بھانجی سے نہ صرف جائز ہے بلکہ اسے انتہائی قدر کی نگاہ سے
ما جاتا ہے۔ بعض فرقوں میں ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کا رواج آج بھی موجود ہے
سی صورت حال میں ہندو، مسلمان اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے یکساں
ل کوڈ کا تصور بھلا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ سماج کے غلط رسم و رواج کو قانون کے ذریعہ
کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ کیا آج جہیز، بچپن کی شادی وغیرہ سے متعلق قوانین
علی خلاف ورزی نہیں ہو رہی ہے، قانون اپنی جگہ موجود ہوتا ہے مگر کوئی فرق نہیں
ا۔ اگر یکساں سول کوڈ بنانا ہی ہے تو قومی فساد کو ٹھیس پہونچانے والے حساس
ملات کے سلسلہ میں یکساں قانون بنایا جائے۔ استحصال جیسے اہم موضوعات پر
کیا جانا چاہیئے۔ ہندو کوڈ بل یا مسلم پرسنل لا کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ودھت پرکاش موریہ - وارانسی
نو بھارت ٹائمز - ۳۰ مئی ۱۹۹۵ء
(دعوت مورخہ ۱۴ جون ۹۵ء سے ماخوذ)

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشاؔ
اندرا پرستھار کی کالونی ناگپور

غزل

ہر گھڑی خوفِ زیاں سر پر سوار ایسا بھی کیا
چار دن کی زندگی کا کاروبار ایسا بھی کیا

دن میں ڈستے ہیں اجالے رات میں تاریکیاں
کرب زا ہو عالمِ لیل و نہار ایسا بھی کیا

چند لوگوں ہی کے دامن پھول سے بھرپور ہوں
اسقدر محدود ہو فیضِ بہار ایسا بھی کیا

بے ضمیری کی ندامت جس میں ہوجائے نصیب
مال کی خاطر ہو انساں بے وقار ایسا بھی کیا

ہر نفس ہو رنج و غم کی یورشوں سے واسطہ
خون رلائے صبحِ نو کا انتظار ایسا بھی کیا

لذت و لطفِ محبت ہے محبت کا صلہ
اک تجارت کا گماں جس پر ہو پیار ایسا بھی کیا

قلب کو حاصل سکوں ہے اور نہ ہے جاں کو قرار
منشاؔ نازل ہو عذابِ انتشار ایسا بھی کیا

رحمٰن جامی

غزل

ہمیں تو سلسلۂ نیک و بد میں رہنا ہے
ہم اہلِ فن ہیں تو چشمِ حسد میں رہنا ہے

روایتیں تو ہیں ہی جدیدیوں کو بھی!
قدامتوں سے بگڑے لب و جد میں رہنا ہے

اگرچہ روح ہے بے چین تجھ سے ملنے کو
مگر ابھی اسی خاکی جسد میں رہنا ہے

تری خوشی کیلئے ہے قیام اپنا بھی
ازل میں رہ چکے آگے ابد میں رہنا ہے

ہماری حد ہمیں معلوم ہے کہ بے حد ہیں
مگر ہمیشہ محبت کی حد میں رہنا ہے

یہ زلزلے یہ تلاطم یہ مضطرب لمحے!
نہ جانے کب تک انکی جد و مد میں رہنا ہے

اسی تضاد میں جینا کمال ہے شاید
جنوں کے ساتھ ہی شہرِ خرد میں رہنا ہے

ترقی کہتے ہیں ننیانوے کے پھیر کو ہم!
جہاں بھی جائیں اسی اک عدد میں رہنا ہے

اک امتیاز ہے جامی تمہارا اونچا قد!
ادب کے ساتھ اسی اپنے قد میں رہنا ہے

○

اقبال جہاں قدیر
دبیر پورہ حیدرآباد

غزل

ہم بھی رسم وفا نبھائیں گے
تیرے غم کو گلے لگائیں گے
جن کے سائے میں زندگی گزری
وہ سہارے نہ لوٹ آئیں گے
خود زمیں بھی نہ پاؤں تھامے گی
ہم ذرا بھی جو ڈگمگائیں گے
حوصلہ چاہیئے مسافر کو
راستے راستہ دکھائیں گے
ظالموں تم یہ دیکھنا اکدن
زخم دل میرے رنگ لائیں گے
انکے عکس جمال کی خاطر
ہم کئی آئینے بنائیں گے
اپنی اقبال پاسبانی کو
قافلے رحمتوں کے آئیں گے

○

محسن جلگانوی
۲۷/۲، ریلوے کوارٹرس نارتھ لالہ گوڑہ
سکندرآباد ۵۰۰۰۱۷

غزل

زندگی گر نہیں ملتی ہے فقط چاہیں گے
تو کسی طرح نہ ہو ہم سے خفا چاہیں گے

بدگمانی میں محبت رشتۂ جاں ٹوٹ گیا
اس نے پوچھا ہی نہیں ہم سے کہ کیا چاہیں گے

خون میں میرے بڑے لمس کی خوشبو ہے بہت
لوگ سب میرے ہی زخموں کا مزا چاہیں گے

بے خطا ہم ہیں صلیبوں کو اٹھائے لیکن
تیری مرضی سے ملیگی جو سزا چاہیں گے

بے ضمیری جہاں جینے کی روایت ٹھہری
ٹوٹ جائے نہ وہاں اپنی انا چاہیں گے

آئینہ توڑ دیں، سورج کو ڈبو دیں، ہنس لیں
تم نے چاہیں گے تو کیا اس کے سوا چاہیں گے

○

ڈاکٹر مسعود جعفری

غزل

عجیب خواب سا دیکھا تو ڈر گئے شب میں
مرے رُمال کو آنسو سے بھر گئے شب میں

خیال ذہن میں اُن کے نہ جانے کیا آیا
بغیر آئینہ دیکھے سنور گئے شب میں

ہماری ناؤ تو دریا میں رہ گئی آخر
ہوا کے سارے ارادے بکھر گئے شب میں

وہ لوگ جن کے لبوں پہ حسین فسانے تھے
سروں پہ خاک اُڑا کر کدھر گئے شب میں

حسین یاد کی چلنے لگی جو پُروائی
بہت سے گھاؤ پُرانے نکھر گئے شب میں

وہی اندھیرا مقدر رہا ہمارا بھی
کئی ستارے چمک کر اُتر گئے شب میں

گھڑی وصال کی آئی تو یوں لگا مسعود
زمین و آسماں جیسے ٹھہر گئے شب میں

○

غزل

حفیظ انجم
کشمیری۔ کریم نگر

دل میں سیہ سیاہ تو چہرے شفق شفق
دنیا کی عشرتوں پہ اِن ہی کا ہے آج حق

جی چاہتا ہے اسکو کتابوں کی شکل دوں !!
ہر آدمی سے مجھکو ملا جو نیا سبق

چہرے کی جھریاں ہی نہیں تجربہ آسے دوست
تاریخ زندگی کے مضامین ہیں ادق

آؤ کہ زندگی کو نئے ساز پر سنیں !
شاید طناب دل کا یہ ہو جائے کم قلق

اے دوست، دوست کہنا تو آسان ہے بہت
کیا آپ کر سکیں گے ادا دوستی کا حق

غربت کی کھیتیوں میں سدا بھوک ہی اُگے
غربت کی سرزمین ہے یہ کتنی لق و دق

بے معنی لگ رہی ہے یہ سبح و شام جہان کی
انجم لہولہان ہے دل کا ورق ورق

شبیر احمد اختر
عادل آباد

غزل

رہتے ہیں کتابوں میں جو، قانون بنائے جاتے ہیں
وقت آتا ہے جب تو سولی پر، مظلوم چڑھائے جاتے ہیں

محنت کو یہاں دہقانوں کی، دھنوان ہی کھائے جاتے ہیں
فصلوں کی کمی کا دھرتی پر، الزام لگائے جاتے ہیں

غلے کو چھپایا جاتا ہے، گودام میں سڑتا رہتا ہے
مہنگائی اور گرانی کے، پھر ڈھونگ رچائے جاتے ہیں

اک سادہ سے کورے کاغذ پر، لکھوا کے سب ان کے کھیتوں کو
اس دنیا میں یوں بھی بھوکوں پر، احسان جتائے جاتے ہیں

ہے ایسی غضب کی مہنگائی، اور ایسی غضب کی غربت ہے
انسان تو اپنے چہرے بھی، اب بیچ کے کھائے جاتے ہیں

بھولی بھالی کلیاں چن کر، گاؤں سے لائی جاتی ہیں
پھر ان کلیوں سے شہروں کے، بازار سجائے جاتے ہیں

دیکھا ہے یہ ہم نے جھوٹوں پر، پھولوں کی جو بارش ہوتی ہے
اس شہر میں کہیں سچوں پر، پتھر برسائے جاتے ہیں

یہ شہر ہے انسانوں کا مگر، اس شہر کی ریت نرالی ہے
جب ہوتا ہے قتلِ عام یہاں، تہوار منائے جاتے ہیں

تھیں دیپ جلانے کی رسمیں، کل دیپ جلائے جاتے تھے
اور آج ہمارے شہروں میں، انسان جلائے جاتے ہیں

اس شہر میں جائے امن و سکوں، جو ڈھونڈتا ہے وہ ناداں ہے
اس شہر میں سر انسانوں کے، نیزوں پہ چڑھائے جاتے ہیں

تم تو ہو بہت ناداں اختر، کیوں آئے ہو ایسی بستی میں
اس بستی میں کیسے کیسے ہی، انسان ستائے جاتے ہیں

ماہنامہ **شاداب** حیدرآباد

جلد : ۱۲

شمارہ : ۱۰

قیمت 6/- روپے

اکتوبر ۱۹۹۵ء

زر تعاون

	سالانہ	۲ سال	تاحیات
ہندوستان	۶۵ روپے	۱۲۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۲۰۰ "	۳۶۰ "	۳۷۰۰ "
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب ۱۰-۵-۱۴۷ پیٹلہ برج حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل عاتق پرنٹنگ پریس کیلئے

پبلک پریس چھتہ بازار سے چھپوا کر دفتر شاداب ۱۱-۵-۱۴۷ پیٹلہ برج

حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

مولانا ابوالکلام آزاد

قرآن کا مقصد

قرآن کہتا ہے دنیا میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے۔ الگ الگ کر دینے کے لیے نہیں ہے۔ پس ایک پروردگار عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔

وان ہذا امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون

(المومنون ۵۲)

اور دیکھو یہ تمہاری اُمت فی الحقیقت ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں۔ پس میری عبودیت و نیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ (اور) نافرمانی سے بچو

قرآن کہتا ہے کہ خدا نے تمہیں ایک جماعت بنایا تھا لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لیے اور رشتہ انسانیت کی وحدت سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی تمہاری نسلیں بہت سی ہیں اس لیے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہو۔ تمہارے وطن بہت سے ہو گئے ہیں اس لیے اختلاف وطن کے لیے ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمہاری قومیں بے شمار ہیں اسلئے ہر قوم دوسری سے نفرت کرتی ہے تمہارے رنگ یکساں نہیں اور یہ بھی باہم نفرت و عناد کا بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ تمہاری بولیاں مختلف ہیں اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا رہنے کی بڑی حجت بن گئی ہے پھر ان کے علاوہ امیر غریب، نوکر و آقا، وضیع و شریف ضعیف و قوی، ادنیٰ اور اعلیٰ بے شمار اختلافات پیدا کئے گئے ہیں اور سب کا منشا یہ ہے ایک دوسرے سے جدا رہو اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی صورت میں بتلاؤ وہ رشتہ کونسا رشتہ ہے جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا از سر نو آباد ہو جائے۔

مسلمان کہتا ہے صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے اور وہ خدا پرستی کا
مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو لیکن تمہارے خدا الگ الگ نہیں ہو سکے
تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو۔ تم سب کی بندگی و نیاز کے لیے ایک ہی معبود کی
چوکھٹ ہے۔ تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، تم
کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سرنیاز
جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا۔
تمہارے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے۔ تم محسوس کرو گے کہ
تمام دنیا تمہارا وطن ہے۔ تمام نسل انسانی تمہارا گھرانا ہے اور تم سب
ایک ہی رب العالمین کی عیال ہو۔ (ماخوذ)

موعظت حضرت اقبال

به بند صوفی و ملا اسیری
حیات از حکمت قرآں نگیری
بایاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین آساں بمیری

ترجمہ:

تو صوفی و ملا کی غلامی پر اعتقاد رکھتا ہے لیکن قرآن کی عقل و دانش کی باتوں
کو اپنی زندگی کا دستور العمل نہیں بناتا۔ قرآن کی آیتوں سے صرف یہ معلوم کیا
ہے کہ سورۃ یٰسین (سورہ قرآن) پڑھوا کر سن لیا جائے تاکہ جان کنی کی تکلیف
نہ ہو۔

محمد شمس الدین صابری
ایڈیٹر شاداب

سیدنا فاروق اعظم

رحمٰن ورحیم رب العلمین نے اپنے حبیب پاک کو رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجا اور دو عظیم صحابہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم کو آپ کے ساتھ کر دیا۔ یار غار حضرت ابوبکر کی بے حساب فضیلتوں کے ساتھ ایک بے مثال فضیلت یہ ہے۔ کہ آپ نے آنحضرت ؐ کی زبان مبارک سے۔ جو بھی سنا اس پر فوری یقین کیا اور تصدیق کی، مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ ہی تھے آنحضرت جب معراج میں بیت المقدس اور آسمانوں کی سیر کر کے تشریف لائے تو لوگوں سے بیان کیا، حضرت ابوبکر اپنے باغ میں تھے کسی نے انہیں خبر دی، لو اب حضرت محمد ایک ہی رات میں بیت المقدس جانے اور آسمانوں کی سیر کا دعویٰ کرنے لگے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ اگر میرے حضور یہ کہتے ہیں تو یہ یقیناً ممکن ہے اور ضرور ایسا ہوا ہے۔ آنحضرت کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ ؐ نے حضرت ابوبکر کو صدیق اکبر کا لقب عنایت فرمایا۔

اسی طرح فاروق اعظم کا لقب حضرت عمر کو بھی اسی دربار رسالت سے عطا ہوا ہے۔ حضرت عمر ہجرت نبوی سے ۴۰ سال قبل پیدا ہوئے۔ جوانی میں سپہ گری، پہلوانی مقرری، اور نسب دانی میں ایسا کمال پیدا کیا کہ قریش نے اسلام لانے سے قبل ہی انہیں سفارت کا اعلیٰ منصب دے دیا۔ بہادری میں بے مثال اور معاملہ فہمی میں طاق تھے مگر اسلام سے بددل ہو کر سکے تو فیصلہ کیا کہ (نعوذ باللہ) خود بانی اسلام کا قصہ پاک کر دیں۔ تلوار لے کر

ل اللہؐ کی طرف چلے۔ راستے میں قبیلہ کے ایک بزرگ نعیم بن عبداللہ ملے۔ تیور دیکھ کر پوچھا
رہے، بولے "محمدؐ کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں"۔ انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تو تمہاری بہن
بہنوئی اسلام لا چکے ہیں"۔ فوراً پلٹے، بہن کے ہاں پہنچے، بہنوئی سے دست و گریباں ہو گئے۔
ن بچانے آئیں تو ان کی بھی خبر لی۔ بہن نے کہا "عمر! جو بن آئے کرو مگر اسلام اب دل سے
ں نکل سکتا"۔ ان الفاظ کا ایسا اثر ہوا۔ کہ قرآن سنانے کی فرمائش کی۔ بہن نے قرآن کے
بڑا سامنے رکھ دیئے۔ دیکھا تو یہ سورۃ تھی

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْم

(اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمت والا)
ایک ایک لفظ دل پر نقش ہوتا گیا۔ جب اس آیت پر پہنچے آمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
بے اختیار پکار اٹھے اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا
رَّسُوْلُ اللّٰہِ شمشیر بکف گئے تھے شمشیر بکف ہی دار ارقم پہنچ کر دستک دی۔ صحابہ کو
اسلام لانے کا علم نہ تھا انہیں تردد ہوا۔ حضرت امیر حمزہؓ نے کہا "آنے دو مخلصانہ آیا ہے تو
بہتر ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا جائیگا"۔ اندر داخل ہوئے رسول اللہ نے پوچھا
"کیوں عمر! کس ارادہ سے آئے ہو" نہایت خضوع سے عرض کیا "ایمان لانے کے لئے"۔
آنحضرت صلعم بے ساختہ پکار اٹھے" اللہ اکبر۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عمر سے پوچھا کہ آپ کا لقب فاروق
کیسے پڑا۔ آپ نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ تفصیلاً بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسلام لانے
کے بعد حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا "کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" آپ نے فرمایا "کیوں نہیں ہم یقیناً
حق پر ہیں"۔ میں نے عرض کیا پھر اب علانیہ عبادت ہو گی چھپ کر نہیں۔ مسلمان دو لائنوں میں مسجد
حرام میں داخل ہوئے۔ ایک لائن میں حضرت حمزہ تھے اور دوسری میں میں۔ جب قریش نے
حمزہ اور مجھے اس حال میں دیکھا تو انہیں سخت صدمہ ہوا۔ اس دن چونکہ حق و باطل کے درمیان

فرق ظاہر ہو گیا لہٰذا مجھے رسول اللہؐ نے فاروق کا خطاب عطا فرمایا۔

حضرت عمرؓ کو محبت نبویؐ، اخلاص اور خدمت اسلام کی وجہ سے یہ مدح عطا ہوا کہ آپ کی زبان و دل کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا!

اللہ تعالیٰ عمر کے زبان و دل پر حق جاری کرتا ہے۔ آپ کا دل و دماغ اس طرح پاکیزگی اور طہارت کا مرکز تھا کہ اس کی فکر و سوچ نہایت ہی صائب ہوتی۔ آپ جب بھی اسلام کے بارے میں غور و فکر کر کے رائے دیتے اور خواہش کرتے کہ یوں ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسی طرح وحی کا نزول فرما دیتا۔ مقام ابراہیم جو پتھر ہے جو حجر اسود کی طرح جنت سے لایا گیا تھا۔ اس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی اس پر آپ کے قدموں کا نشان ہے اسی پر کھڑے ہو کر حج کی دعوت بھی دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے خواہش ظاہر کی کاش مقام ابراہیم پر نماز ادا کریں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی "وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى" (۲/۱۲۵)

(اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ)

۲ھ میں غزوہ بدر کا معرکہ پیش آیا۔ آنحضرتؐ کے ساتھ ۳۱۳ لوگ تھے اور قریش کے ساتھ ۹۵۰ کی جمعیت تھی۔ کفار کو شکست فاش ہوئی۔ مسلمانوں میں سے ۱۴ شہید ہوئے۔ قریش کے ۷۰ مقتول اور ۷۰ ہی گرفتار ہوئے۔ مقتولین میں بھی بڑے بڑے رؤسا مکہ تھے اور قیدیوں میں بھی۔ رسول اللہ نے تمام صحابہ سے رائے لی۔ حضرت ابوبکر نے کہا یہ اپنے ہی بھائی بند ہیں اس لئے ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے اختلاف کیا اور کہا اسلام کے مقابلہ میں رشتہ و قرابت کو دخل نہیں، ان سب کو قتل کر دینا چاہیئے۔ رحمۃ للعٰلمین نے حضرت ابوبکر کی رائے پسند فرمائی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ الخ

(کسی پیغمبر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ خوب خونریزی نہ کرلے۔)

[illegible] میں جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا انتقال ہوا۔ آنحضرت نے نماز جنازہ پڑھی اور اس کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ حضرت عمر اس معاملہ میں آڑے آئے اور کہا "یارسول اللہ! یہ وہی خبیث ہے جو ہمیشہ کفر و نفاق کا علم بردار رہا۔ کیا حق تعالیٰ نے نہیں فرمایا۔" اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۚ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (تو ان کے لیے بخشش مانگ یا نہ مانگ۔ اگر ان کے لیے ستر بار بخشش مانگے تو بھی ہرگز نہ بخشے گا ان کو اللہ) (۸۰/۹)

آپ نے فرمایا اے عمر! مجھ کو استغفار سے منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ آزاد رکھا گیا کہ استغفار کروں یا نہ کروں۔ ممکن ہے دوسروں کے حق میں میرا یہ عمل نافع ہو جائے۔ گویا حضرت عمر کی نظر "البغض فی اللہ" کے جوش میں صرف اسی نقطہ پر تھی اور نبی کریمؐ میت کے فائدہ سے قطع نظر عام پیغمبرانہ شفقت کا اظہار فرما رہے تھے۔ لیکن آخرکار وحی الٰہی نازل ہوئی۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ (۸۴/۹) (اور نماز نہ پڑھ ان میں سے کسی پر جو مر جائے۔ اور کبھی نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر۔) اور اس طرح صریح طور پر منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کے اہتمام کفن دفن وغیرہ میں حصہ لینے کی ممانعت کر دی۔ اس کے بعد حضورؐ نے کسی منافق کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔ اور حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت عمر احتیاطاً ایسے شخص کا جنازہ نہ پڑھتے تھے جس کی نماز میں حضرت حذیفہ شریک نہ ہوں کیونکہ یہ صاحب سِرِّ رسول اللہؐ تھے اور حضورؐ نے ان کو بہت سے منافقین کا نام بنام علم کرا دیا تھا۔

سورۃ النساء کے رکوع ۸ کے آخر میں ہدایت ہے

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۔ (۵۹/۴)

(پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے)

یعنی اپنے متنازعات اور اختلافات کو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنا یعنی اللہ

ور رسول کی فرمانبرداری مفید ہے۔ آپس میں جھگڑنے یا اپنی رائے کے موافق فیصلہ کرنے
سے اس رجوع کا انجام بہتر ہے۔

حضرت عمرؓ اس ہدایت پر پوری طرح عامل تھے۔ اور اگر کوئی دربار رسالت
فیصلہ نہ مانے تو خود اس کا فیصلہ فرما دیتے تھے۔ یہود اپنے متنازعات کے تصفیہ میں رعایت
رشوت کے عادی تھے۔ اور جو ظاہری مسلمان منافق اور جھوٹے تھے وہ بھی اپنے معاملے
ودی عالموں کے پاس لے جانا پسند کرتے تھے۔ اور آنحضرتؐ کے پاس ان معاملوں کو
پسند نہ کرتے تھے کہ آپؐ حق کی رعایت فرمائیں گے اور باطل کو ظاہر فرما دیں گے۔ چنانچہ
نہ میں ایک یہودی اور ایک ظاہری مسلمان جو حقیقتاً منافق تھا، دونوں میں کسی امر
جھگڑا ہوا۔ یہودی سچا تھا اور منافق جھوٹا۔ منافق نے کہا کعب بن اشرف کے پاس تصفیہ
کے لئے جائیں۔ جو یہودیوں میں عالم اور سردار تھا۔ مگر یہودی نے کہا کہ تصفیہ کو آنحضرتؐ کے
س لے جائیں۔ چنانچہ دونوں آپؐ کی خدمت میں جھگڑا لے آئے۔ آپؐ نے یہودی کا
ثابت فرما دیا۔ منافق آپؐ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا بلکہ کہنے لگا کہ حضرت عمرؓ کے پاس
ں وہ جو فیصلہ کریں وہی منظور۔ غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ میں مدعی اسلام ہوں اس لئے
دی کے مقابلہ میں میری رعایت کریں گے۔ جب حضرت عمرؓ نے جھگڑا سنا اور یہودی سے
یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ جھگڑا آنحضرت صلعم کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے اور آپؐ یہودی
حق میں تصفیہ فرما چکے ہیں تو حضرت عمرؓ یہ سن کر اندر تشریف لے گئے تلوار لا کر نہ ماننے
لے کا سر قلم کر دیا اور فرمایا جو حضور کے فیصلہ کو نہیں مانتا عمرؓ کی تلوار اس کا فیصلہ کر دیتی ہے۔
ا کے وارث آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے اور حضرت عمرؓ پر قتل کا دعویٰ کیا۔ قسمیں کھانے
حضرت عمرؓ کے پاس تو صرف اس وجہ سے گئے تھے۔ کہ شاید وہ اس معاملہ میں باہم صلح
ہ یہ وجہ نہ تھی کہ آپؐ کے فیصلہ سے انکار تھا۔ اس پر سورۃ النساء کی یہ آیت (۶۵) نازل
ہیں کا ترجمہ ہے "پس نہیں تیرے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے

ملازم ہیں آپ کو حاکم نہ مانیں پھر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور آپ کے فیصلہ کو دل وجان سے تسلیم کرلیں ۔

خلافت کے قیام و استحکام میں حضرت عمر کا سب سے بڑا حصہ ہے، آنحضرت کے انتقال پر حضرت ابوبکر و عمر آنحضرت کے بندوبست میں مصروف تھے ۔ کہ کسی نے حضرت عمر کو اطلاع دی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور خلافت کی بات کر رہے ہیں، چنانچہ حضرت حضرت ابوبکر کو لے کر فوری وہاں پہنچے ۔ خلافت پر بحث نے طول پکڑا اور قریب تھا کہ تلواریں میان سے نکل آتیں حضرت عمر نے یہ رنگ دیکھ کر دفعتہً حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا سب سے پہلے میں بیعت کرتا ہوں، ساتھ ہی حضرت عثمانؓ ابوعبیدہ جراحؓ عبدالرحمن بن عوفؓ نے بھی ہاتھ بڑھائے، پھر عام خلقت ٹوٹ پڑی اور اس سے ایک اٹھتا ہوا طوفان رک گیا ۔

حضرت ابوبکر کی خلافت کی مدت سوا دو برس ہے، اس پورے عرصہ میں حضرت عمر کے مشورے انہیں حاصل رہے، چنانچہ اپنی وفات کے قریب حضرت ابوبکر نے عمر کے بارہ میں اکابر صحابہ سے مشورہ کیا ۔ اور حضرت عثمان سے عہدنامہ خلافت لکھوا کر حضرت عمر کی خلافت کا اعلان فرما دیا ۔

حضرت عمر کی خلافت کا ایک بڑا کارنامہ کثیر ممالک کی فتوحات اور اشاعت اسلام ہے ۔ اسلام میں خلافت یا حکومت کی بنیاد حضرت ابوبکر کے عہد میں پڑی لیکن نظام حکومت کا دور حضرت عمر کے عہد سے شروع ہوتا ہے ۔ حضرت عمر کے دور خلافت میں شام، مصر، عراق، جزیرہ، خوزستان، عراق عجم، آرمینیا، آذربائیجان، فارس، کرمان، خراسان اور مکران وغیرہ ملک فتح ہوئے جن کا رقبہ 30 0، 51، 22 مربع میل تھا ۔ حضرت عمر نے ہر مفتوحہ ملک میں حکومت و سلطنت کا نظام قائم کیا ۔ آپ نے بغیر کسی مثال اور نمونہ کے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی اور ایک مجلس شوریٰ قائم کی ۔ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو

ایک منادی اعلان کرتا الصّلوٰۃ جامعۃ یعنی سب لوگ نماز کے لئے جمع ہو جائیں، جب سب جمع ہو جاتے حضرت عمر مسجد نبوی میں دو رکعت نماز پڑھتے پھر منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے اور تصفیہ طلب امر پیش کیا جاتا۔ اور کوئی تصفیہ بغیر مشورہ اور کثرت رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کے علاوہ عام رعایا کو انتظامی امور میں مداخلت حاصل تھی۔ چنانچہ صوبجات و اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی کے مقرر کئے جاتے تھے۔ اضلاع سے وفد آتے، اپنے حالات و شکایات سے مطلع کرتے اور حضرت عمر سے دادرسی چاہتے۔ اس کے علاوہ نظام حکومت میں ہر قسم کے محکمے قائم کئے جو آج کی ترقی یافتہ حکومتوں میں موجود ہیں۔

ذمی وہ لوگ ہیں جو غیر مسلم ہوں اور مسلم حکومت کے زیر نگیں سکونت پذیر ہوں۔
حضرت عمر نے ذمی رعایا کو جو حقوق دے رکھے تھے وہ اس عہد کی حکومتوں میں تو مفقود ہی تھے شاید آج کی مسلم حکومتوں میں خود مسلمانوں کو وہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ فاروق اعظم کی عالی حوصلگی، دریا دلی اور بے مثال رواداری نے مسلم اور غیر مسلم رعیت کو اتنا قریب کر دیا تھا کہ دونوں بڑی حد تک مساوی ہو گئے تھے۔ بیت المقدس کے مغلوب عیسائیوں سے ۱۵ھ میں جو معاہدہ کیا گیا۔ تاریخ عالم میں اس کی نظیر ملنی ہی نہیں ہے۔ اس کا ترجمہ دیکھئے:

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیرالمومنین عمر نے ایلیا (بیت المقدس) کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے اس طرح کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائیگی۔ نہ وہ ڈھائے جائینگے نہ ان کو نہ ان کے احاطہ کو کچھ نقصان پہنچایا جائیگا۔ نہ ان کی صلیبوں نہ ان کے مال میں کچھ کمی کی جائیگی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائیگا۔ نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائیگا۔ جو کچھ اس میں تحریر ہے اس پر خدا کا رسول خدا کا خلفا کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ یہ لوگ جزیہ مقررہ ادا کرتے رہیں۔"

ذمیوں سے صرف دو ٹیکس وصول کئے جاتے تھے۔ جزیہ اور خراج اس کے برخلاف

مسلمانوں سے زیادہ ٹیکس وصول کئے جاتے۔ مثلاً زکواۃ جس کی مقدار جزیہ اور خراج سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ عشر بھی لیا جاتا۔ جزیہ بیت المال میں جمع ہوتا تو اس سے اپاہج اور ضعیف مسلمانوں کے ساتھ ذمیوں کو بھی وظیفہ دیا جاتا۔

ان تمام اقدامات و انتظامات کا یہ اثر ہوا۔ کہ خلافت فاروقی میں ذمی دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں اسلامی حکومت میں رہنا پسند کرتے اور اکثر ملک کی فتح کے ساتھ ہی بہت سے لوگ اپنی خوشی سے مسلمان ہو جاتے۔ چنانچہ خلافت فاروقی میں جس تیزی سے مملکت کے حدود وسیع ہوئے اس سے زیادہ تیزی سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ جو تلوار سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے حسن سلوک کے باعث اور اسلام کو ان پر پیش کرنے کے باعث وقوع پذیر ہوا۔ حضرت عمر جن بہادروں کو فوج کا سپہ سالار مقرر کرتے وہ فوجی مہارت کے ساتھ ساتھ شریعت کے علم میں بھی فقیہ و مفتی کے درجہ پر ہوتے۔ اور غیر مسلموں کے سامنے اپنا نمونہ پیش کرتے اور اسلام کو دلنشین انداز میں پیش کرتے۔

حضرت عمر کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس خصوصیت کو یوں بیان فرمایا ہے۔ کہ (ترجمہ)

"سینۂ فاروق اعظم کو ایک گھر تصور کیا جائے۔ جس کے کئی دروازے ہیں اور ہر دروازے میں ایک صاحب کمال بیٹھا ہے۔ مثلاً ایک دروازے میں سکندر ذوالقرنین تمام سلیقۂ ملک گیری کے ساتھ۔ دوسرے دروازہ میں امام ابوحنیفہ یا امام مالک اپنے تمام فتوی و احکام کے علم کے ساتھ۔ کسی دروازے میں مرشد کامل عبدالقادر جیلانی یا خواجہ بہاالدین تو دوسرے دروازہ میں حضرت ابوہریرہ و ابن عمر کے پایہ کے محدث۔ تو کسی اور دروازہ میں حضرت ابوہریرہ و ابن عمر کے پایہ کے محدث۔ تو کسی اور دروازہ میں مولانا جلال الدین رومی یا شیخ فریدالدین عطار جیسے حکیم۔ اور اس گھر کے چاروں طرف لوگ جمع ہیں' اپنی اپنی حاجت متعلقہ صاحب فن سے بیان کرتے ہیں اور کامیاب و کامران ہوتے ہیں

باقی صفحہ ۲۸ پر

الحاج سید غلام محمد کیفی شاہ نظامی

تصوف

تصوف کی تعریف امام قشیریؒ کی تحقیق کی رو سے لفظ "صوفی" ۲۰۰ھ سے کچھ پہلے سے مشہور ہوا۔ شیخ ابو علی رودباری فرماتے ہیں۔

صوفی وہ ہے جو صفائے قلب کے ساتھ صوف پوشی اختیار کرے ہوائے نفسانی کو سختی کا مزہ چکھائے شرع مصطفیٰ کو لازم کر لیتا ہے۔ اور دنیا کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ (تائید الحقیقۃ العلیہ)

شیخ الاسلام زکریہ انصاریؒ فرماتے ہیں۔

تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیۂ نفس، تصفیۂ اخلاق، تعمیر ظاہر و باطن کے احوال کا علم ہوتا ہے تاکہ سعادت ابدی حاصل کی جا سکے۔ اس کا موضوع بھی تزکیۂ نفس و تصفیۂ اخلاق و تعمیر ظاہر و باطن ہے اور اسکی غایت و مقصد سعادت ابدی کا حاصل کرنا ہے۔ (حاشیہ رسالہ قشیریہ)

امام غزالیؒ اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں فرماتے ہیں۔

ترجمہ: جب میں علوم سے فارغ ہو کر صوفیہ کے طریقہ کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کا طریقہ علم و عمل کے تکمیل کو پہنچتا ہے ان کے علم کا حاصل نفس کی گھاٹیوں کو قطع کرنا ہے اخلاق ذمیمہ اور خبیثات خبیثہ سے پاک و منزہ ہونا ہے تاکہ اس کے ذریعہ قلب کو غیر اللہ سے خالی کیا جائے اور اس کو ذکر الٰہی سے آراستہ کیا جائے۔

ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں۔

تصوف حظِ نفس کا چھوڑنا ہے۔ یعنی غیر شرعی حظِ نفسانی کا ترک کرنا ہے۔ صوفی ہوا و ہوس سے آزاد ہوتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں

نیکو مثلے شنو ز پیر بسطام ✦ از دانۂ طمع بگذر رُستی از دام

ابوسہل قزوینی تصوف کو پسندیدہ اخلاق قرار دیتے ہیں۔ ابوسہل الصعلوکیؒ نے اسکی تعریف اعتراض سے بچنا کی ہے۔ ابو محمد الجریریؒ نے کہا ہے کہ تصوف نیک خصلت سے مزین ہوتا ہے اور تمام بری عادتوں سے قلب کا تخلیہ کرنا ہے

محمد بن القصابؒ کے نزدیک تصوف اخلاق کریمہ ہے۔ جو بہتر زمانے میں بہتر شخص سے بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

کتانیؒ نے فرمایا "تصوف خلق ہی کا تو نام ہے۔ جو شخص تجھ سے اخلاق حسنہ میں بڑھ گیا وہ تجھ سے صفائے قلب میں بھی بڑھ گیا"

ان اقوال صوفیا کی ان تمام تعریفوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصوف تزکیہ نفس اور تصفیہ اخلاق کا نام ہے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصود ہی مکارم اخلاق کی تتمیم بیان فرمایا ہے

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاَخْلَاقِ (الحدیث)

مجھے مکارم اخلاق کی تتمیم کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

تصوف کی حقیقت

حضرت مولانا رومؒ نے مثنوی کے دفتر پنجم کے دیباچہ میں کہا ہے کہ ایک شمع ہے جس سے راستہ دکھائی دیتا ہے یہ شریعت ہے اور [illegible] استعمال کی یہ طریقت ہے [illegible] پر پہنچ جانا حقیقت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شریعت علم ہے، طریقت عمل ہے! اور حقیقت عمل کا اثر ہے۔ شریعت چار چیزوں کا نام ہے، اقرار زبانی، اعتقاد قلبی، تزکیہ اخلاق، اعمال (یعنی اوامر و نواہی کا اعتقاد) یقین جو تجربہ سے پیدا ہوتا ہے۔ تقلید سے، استدلال سے

کشف و مال سے۔ پہلی دونوں قسموں کو شریعت کہتے ہیں ان طریقوں سے کسی کو اعتقاد حاصل ہو جائے گا تو کہا جا سکیگا کہ اُسے شرعی اعتقاد حاصل ہے۔ یہاں طریقت وہ بھی شریعت سے باہر نہیں، لیکن یہ ایک امتیازی نام ہے اسکے لیےکہ یہ اعتقاد مجاہدہ و ریاضت اور سلوک و تصوف کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

تزکیۂ اخلاق کے جو احکام شریعت میں مذکور ہیں ان کا نام شریعت ہے لیکن محض احکام کے جاننے سے تزکیہ اخلاق نہیں ہو جاتا۔ علمائے ظاہر کیا نہیں جانتے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے اخلاق ہوتے ہیں یہ کمال یہ بات تو مجاہدات و فنائے نفس ہی سے حاصل ہوتی ہے اور یہاں طریقت ہے اسی سے ظاہر ہے کہ شریعت و طریقت دو متناقض چیزیں نہیں بلکہ دونوں میں جسم و جان، ۔ وپوست و مغز، ظاہر و باطن کی نسبت ہے۔ ادراک کا ذریعہ سب کے نزدیک حواس ظاہری و باطنی یعنی حافظہ، تخیل، اور حس مشترک وغیرہ ہیں لیکن ارباب تصوف کے نزدیک تصفیہ قلب و مجاہدات سے انسان کے اندر ایک اور حاسہ پیدا ہوتا ہے جس سے وہ کچھ ادراک ہوتا ہے جو حواس ظاہری و باطنی معلوم نہیں ہو سکتا۔ اور وہ کچھ نظر آتا ہے جسے ہماری جسمانی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔

حضرت امام غزالیؒ اور تصوف

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ایک حوض ہے جس میں نلوں اور جدولوں کے ذریعہ پانی باہر سے آتا ہے لیکن خود حوض کی تہ میں سے بھی ایک سوت پیدا ہو گیا ہے۔ جس سے پانی فوارہ کی طرح ابلتا ہے اور حوض میں آتا ہے یہی علم باطن ہے جسے علم غیبی لدنی اور کشف وغیرہ کہا جاتا ہے۔ گو یہ علم انبیاؑ اور اولیا کے ساتھ مخصوص ہے البتہ انبیاؑ کا علم فطری اور نہایت کامل ہوتا ہے لیکن اولیائے کرام کو مجاہدات و ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے اہل ظاہر کہتے ہیں کہ تحقیقات علمیہ سے ظاہر ہو چکا ہے کہ حواس کے سوا اور کوئی ذریعہ ادراک نہیں حضرات صوفیا کا جواب۔ ہے

ذوق ایں بادہ نہ دانی تا نہ چشی

ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ جس طرح علوم ظاہری سیکھنے کا ایک خاص طریقہ ہے اسی طرح علم باطن کے حصول کا بھی ایک خاص طریقہ ہے جب تک اس کا تجربہ نہ کر لیا جائے اہل ظاہر کو اس کی تکذیب کا کوئی حق نہیں۔

مولانا رومؒ اپنی مثنوی میں اسے سمجھاتے ہیں اور خوب سمجھاتے ہیں اور نئی تشبیہوں کے ساتھ سمجھاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک — نقشہا بینی بروں از آب و خاک
جمع سی ہست جز ایں ہیچ حس — آن بود رنگ سرخ و ایں چشمہا تلخی
خویش را صافی کن از اوصاف خود — تا بہ بینی ذات پاک صاف خود
بینی اندر دل علوم انبیاءؑ — بے کتاب و بے معید و اوستا
پس چو آہن گرچہ تیرہ ہیکلی — صیقلی کن صیقلی کن صیقلی
تا دلت آئینہ گردد پر صور — اندر او ہر سو ملیح سیمبر
آہن ارچہ تیرہ و بے نور بود — صیقلی آن تیرگی از وے زدود
گر تن خاکی غلیظ و تیرہ است — صیقلش کن زانکہ صیقل گیرہ است
تا در او اشکال غیبی رو دہد — عکس حوری و ملک در وے جہد

تصوف کی اصل

لفظ تصوف کے اشتقاق پر بہت بحث کی جا چکی ہیں۔ حضرت غوث اعظمؒ اور حضرت امام غزالیؒ نے اسے صفا سے مشتق قرار دیا ہے۔ اول الذکر بزرگ محترم نے لکھا ہے کہ صوفی وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے صاف کیا ہو۔ یعنی جو شخص نفس کی آفتوں اور اس کی برائیوں سے صاف ہو اور اس کے قلب کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے آگاہ نہ ہو

خلاصہ یہ ہے کہ تمام اخلاق رذیلہ سے پاک ہو کر اخلاق فاضلہ کے حاصل ہونے، حقائق و معارف الٰہیہ میں منہمک ہے کہ باطن کو تمام لوث اور ماسوا سے صاف کر دینے اور روحانی ترقی کی ذیل میں مراحل ارتقا عاشقانہ انداز میں طے کرنے کو تصوف کہتے ہیں۔

تصوف اور احادیث نبوی

حدیث جبرئیل میں حقیقت اسلام و ایمان کے بعد احسان کا ذکر ہے۔ جسکی تفصیل حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

"ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"

احسان کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اس حال پر نہیں تو یوں عبادت کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے (مشکوٰۃ ۔ کتاب الایمان)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اعمال ظاہری و عقائد کے علاوہ ایک اور کمال بھی ہے جسے "احسان" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "احسان" اصل تصوف کی طرف اشارہ ہے اور اثبات ولایت کی قوی دلیل ہے۔

احسان اشارہ ہے اصل تصوف کی طرف جس سے مراد صدق و توجہ الی اللہ ہے۔ فقہ اور تصوف لازم ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے بغیر کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ فقہ کے بغیر تصوف نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ احکام الٰہی فقہ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے اور تصوف کے بغیر فقہ نا تمام رہتی ہے اس لئے کہ عمل صدق کے بغیر کامل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے حضرت امام مالک نے فرمایا کہ جو شخص صوفی بنا اور فقیہ نہ بنا پس وہ زندیق ہو گیا اور فقیہ ہوا صوفی نہ بنا وہ فاسق ہو گیا۔ جو دونوں کو جانتا ہے وہی ٹھیک اور درست ہے۔

ایک اور حدیث ہے کہ جب آدمی بہت زیادہ نفل پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہے پھر اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے

میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس حدیث کو پڑھئے اور سمجھئے کہ
یہی وہ مرتبہ ہے جس کے متعلق حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

یہی فنا فی اللہ اور تصوف کی انتہا ہے۔

تصوف اور قرآن

ویسے تو حقیقت یہ ہے کہ اول و آخر ہی اعادیہ و قرآن ہی ہے کہ اول و آخر ہی میں قرآن کریم میں کو دیگر اشیائے ارض و سماوات کی طرف متوجہ ہونے غور کرنے اور ان سے کام لینے کی طرف اشارات کئے گئے ہیں اسی انداز میں نفس پر غور کرنے کا اشارہ صریح موجود ہے۔

ارشاد ربانی ہے وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

"تمہارے اندر ہی سب کچھ موجود ہے، تمہارے قلب ہی میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں، پھر کیا تم ان نشانیوں کو نہیں دیکھتے ہو؟"

بہ الفاظ دیگر ہم نے تمہارے قلب میں گوناگوں صفات پیدا کردی ہیں اور اسے گنج معارف و خزینۂ حقائق بنایا ہے۔ تم کوشش کرو اور جس طرح اور دنیا کی سیر کرتے ہو اس کی بھی سیر کرو تاکہ اس میں تمہیں انوار الٰہیہ نظر آئیں۔ کیا اس آیت میں اسی سوت اسی صحن دل و فواد کی طرف اشارہ نہیں ہے جس کا ذکر حضرت امام غزالیؒ اور حضرت مولانا رومؒ نے اپنے اشعار میں کیا ہے اور یقیناً ہے جس طرح پہاڑوں، دریاؤں، آسمانوں، تاروں، درختوں، ہواؤں، سمندروں پر غور و تحقیق کرکے اور حقائق کی تہ کو پہنچ کر انسان نے بے شمار علوم منضبط کرلیے اسی طرح تصوف، نفس نہیں نفس کی گہرائیوں میں اور قلب کی پہنائیوں میں اترنے کا نتیجہ ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا
(پ ۲۱ الم ۶۹)

یعنی جو لوگ الٰہیات میں ہماری ذات میں کسی وجہ سے کام لیتے ہیں مجاہدے و
ریاضات کرتے ہیں ہم ان کے سامنے راہیں کھول دیتے ہیں: صاف و صریح آیت ہے کسی
تشریح کی محتاج نہیں۔

مجاہدہ و کثرت عبادت

مجاہدہ و ریاضت اور کثرت عبادت شرعًا جائز ہے۔ جیسا کہ ابھی ابھی واضح
کیا جا چکا ہے کہ نوافل کی کثرت محبوبیت کا درجہ عطا کر دیتی ہے۔ البتہ اتنی بات ہے کہ اس
کے مجاہدہ و ریاضت کی غرض اور کسی کے حق پر زد نہ پڑتی ہو۔ انتہا یہ کہ اپنے نفس کو بھی
تکلیف نہ ہو۔ اور کسی پر گراں نہ گزرے کہ انسان پر اس کا حق ہے۔ اس پر پابندی کی وجہ
سے اولیائے کرام نے ابتدا ترک اسباب و ترک دنیا کو عارضی طور پر ضروری سمجھا ہے۔
بزرگوں نے سنت نبوی کی تعمیل میں شادیاں بھی کیں مگر اس وقت جب یہ تمام مدارج ابتدائی
مراحل و مدارج طے کر چکے۔

شرائط یہ ہیں کہ اولاً ملال خاطر نہ ہو گراں نہ گزرے کہ ایسی حالت میں عبادت
وغیرہ عبادت برابر ہوتی ہے۔ عبادت وہی کہ جس میں کیفیت و شوق ہے۔ غالباً تکلیف
مالا یطاق نہ ہو ثانیاً کوئی اہم فریضہ قضا نہ ہو۔ رائیگاں نہ ہوسکے۔ اولاد، والدین یا مسلمان
وغیرہ کا حق فوت نہ ہو خامسًا رخصت شرعی کو باطل اور عامل رخصت کو بے عمل نہ سمجھے
سادسًا غیر واجب کو واجب اور غیر حرام کو حرام کرنا التزام نہ آسکے۔ ان کے علاوہ چند اور
امور بھی ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اولاً ارکان عبادت پورا کرسکیں سے ادا کئے
جائیں ثانیاً مداومت نہ رہے ثالثاً دوسرے بھائیوں کے لیے موجب ملال و تکلیف نہ ہو۔
رابعاً اس عبادت و کثرت پر غرور وغیرہ اور اپنی فضیلت کا احساس پیدا نہ ہو۔

عبادات

ایک بڑی نعمت ہے جس کی قدر کرنے والے بڑے لوگ ہیں

لہٰذا نظر نہیں آتی جو عہد رسالت میں تھی ہے اس لئے کہ تعلیم موجود ہے معلم موجود نہیں۔

یہ معلم حقانی ہی کر سکتا ہے کہ وہ انسانوں کو زہد و تقویٰ اخلاص و عمل صبر و توکل تسلیم و رضا اور ورع و اخلاق کا پیکر بنا دے۔ عالم تو پھر عالم ہیں بعض علماء کو بھی کسی شیخ کامل کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے کا موقع نہیں ملا اندازہ کر لو آزما لو کہ وہ آیات و احادیث میں تو بال کی کھال اتارتے نظر آئیں گے۔ مگر روحانیت سے بہرہ حاصل نہ ہونے کے باعث غرور و حرص عزت و ریا اور خود پسندی اور نفس پرستی کے بندے بنے ہوں گے عجب کیا ہے احکام شریعت کی وہ پابندی جس کا اثر باطن پر نہ ہو محض ایک رسم و عادت ہے' صاحب جامع اصول نے بھی یہی لکھا ہے کہ نماز کو بحضور قلب ادا کرنا خشوع کا میسر آنا اور نفس کا تزکیہ ہونا تربیت شیخ کے بغیر ممکن نہیں۔ برائی کو برائی سمجھنے سے برائی کا انسداد نہیں ہوگا۔ غرض علم و عمل دونوں کی ضرورت ہے علم حاصل ہوتا ہے کتاب و سنت سے اور عمل کراتے ہیں انبیاء اور ان کے بعد ورثائے انبیاء' آپ ہزار کتابیں پڑھ ڈالئے' احادیث و فقہ کے دفتر چھان ڈالیے بہت کم لوگوں کے دل پر اثر ہوگا۔ متاثر بھی ہوں گے تو دیر میں مگر انبیاء و اولیاء منٹوں میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں اعتراف ہے کہ قرآن کریم بہت موثر ہے اور سلیم الفطرت افراد اس سے فوراً متاثر ہوتے ہیں لیکن معلم سامنے ہو تو ان کی تاثیر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اسی بنا پر انوار قدسیہ میں حضرت امام شعرانیؒ نے شیخ کامل کے وجوب اتباع کو ثابت کیا ہے اور لکھا ہے کہ ازالۂ خود بخود اصلاح بہت کم ہوتی ہے

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے غنیہ میں بھی اس امر کی تحقیق کی ہے اور لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی سے روحانی تربیت کا سلسلہ اس طرح قائم کر رکھا ہے کہ ایک فیض دیتا ہے اور دوسرا فیض حاصل کرتا ہے انبیاء ان کے جانشین حواری و صحابہؓ ان کے بعد ان کے تربیت یافتہ' علیٰ ہذا القیاس تا قیام قیامت یہی سلسلہ جاری رہے گا شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو تربیت کے بغیر مقامات عالیہ تک پہنچا دے۔ علامہ عارف باللہ فقیر [illegible] ۲۸

از ملازم غازی الدین کمال کریم نگری

حضرت صوفی سرمد شہیدؒ کی رباعیات

روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد کے ۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ء کے چہارشنبہ کے ایڈیشن میں "سلطان سرمد شہیدؒ" کے عنوان سے جناب تنہا نظامی کا ایک سیر حاصل مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں حضرت سرمد کی نجی زندگی کے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ حضرت سرمد ایک اچھے رباعی گو شاعر تھے۔ ذیل میں ان کی فارسی رباعیات کا ایک مختصر سا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ ان منتخب رباعیات کے ساتھ ان کا منظوم اردو ترجمہ بھی شامل ہے ترجمہ اردو کے مشہور شاعر جناب بال مکند عرش ملسیانی کا ہے (مضمون نگار)

دل اگر دانا بود اندر کنارش یار ہست — چشم گر بینا بود، در ہر طرف دیدار ہست

(اگر دل سمجھدار ہے تو محبوب ہر دم اس کے پاس ہے، اگر آنکھ دیکھنے والی ہے تو ہر سو اس کا جلوہ ہے)

حضرت سرمدؒ اس بات کے شدت سے قائل تھے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سچے صوفی کو چاہیئے کہ وہ حق پرست ہونے کے ناطے اس فانی دنیا کے جال میں نہ پھنسے۔

دنیا نہ کنم طلب کہ کم تر ز خس است — بے دولت دیدار توایں ہم ہوس است

ترجمہ :- دنیا کی طلب چھوڑ یہ سب ہے محض ہوس۔ بے دولت دیدار یہ دنیا ہے خس

دوسری، آدمی کا دشمن ہے۔ ان کی دوستی پر اعتبار کرنا ایک زبردست غلطی اور نا

این بے خرداں کہ از خدا بے خبراند | از بہر زر و سیم ہم کینہ ور اند
بر دوستی اہل جہاں تکیہ مکن | از بہر دو رغیف دشمن یکدیگراند

ترجمہ:- دولت کیلئے کرتے ہیں جو کینہ وری | اللہ سے غافل ہیں خرد سے ہیں بری
تو دوستی اہل زمانہ پہ نہ جا | بہتر ہے کہ چھوڑ دے یہ آشفتہ سری

حضرت سرمدؒ اپنے آپ کو ناداں، غلطیوں، کمزوریوں اور گناہوں کا پتلا سمجھتے تھے، لیکن ان کا یقین محکم اس بات پر ہے کہ خالق کائنات و محبوب حقیقی کا فضل اور اس کی رحمت ایک بحر بیکراں ہے۔ اس لیے وہ رب العزت سے التجا کرتے ہیں۔

از کردہ خویش منفعل نسیادم | عمریست کہ پیوستہ درین آزادم
چیزے کہ بناید بشود از من شد | بر فضل نظر بکن نہ بر کردارم

ترجمہ:- ہوں اپنے کیے پہ میں بہت شرمندہ | آزاد ہے جب تک بھی یہاں ہوں زندہ
کردار تو ہرگز نہیں پائندہ میرے | بہتر ہے ہو فضل ترا پائندہ

ایک اور رباعی میں حضرت سرمدؒ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے میرے ناخدا (مالک) تو ہی اس بحر ظلمات اور گناہوں کے ہزاروں گردابوں سے میری کشتی دل کو کنارے لگا سکتا ہے۔ میں شرمندگی و پشیمانی کے سمندر میں غرق ہوں، بس تیرا فضل و کرم ہی مجھے باہر نکال سکتا ہے۔

یارب چہ کنم گزشت جرمم ز شمار | کشتی دل خستہ ز گرداب برآر
در بحر خجالت و ندامت غرقم | فضل تو کند چارہ، بگیر و یکبار

ترجمہ:- یارب میرے عصیاں کا نہیں کوئی شمار | ہے کشتی دل ایک، تو گرداب ہزار
دل بحر خجالت و ندامت میں ہے غرق | ہو فضل اگر تیرا تو لگ جائے پار

حضرت سرمدؒ کا فلسفہ حیات کیا تھا؟ اس کو سمجھنے کے لیے ان کی رباعیات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کا انداز فکر خدا کے عشق سے

وابستہ ہے اور یہی بات ان کے فکر و خیال کی بنیاد ہے۔ وہ اس نظریے و عقیدے کے [illegible] ہیں کہ خدا ہر جگہ ہر شئے میں نظر آتا ہے وہ کسی پردے میں نہیں، پوشیدہ نہیں، بلکہ انسان کے دل میں بھی ہے۔ اس لیے انسان کو اس کی تلاش میں مارا پھرنا کا فرصت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

اے بے خبر از ہستی خود ہم چو کتاب — در جلد تو آیات الٰہی یہ حجاب
یعنی ز تو حق پدید و تو از اثر ش — آگاہ نئی چو شیشہ از بوئے گلاب

ترجمہ: ہستی سے ہے بے خبر تو مانند کتاب — آیات الٰہی کا ہے خود تو ہی حجاب
حق تجھ میں ہے تو اس سے نہیں ہے واقف — شیشے کو خبر کہاں کہ ہے مجھ میں گلاب

اس کا مطلب ہے۔ تو مانند کتاب اپنی ہستی میں پوشیدہ علم سے بے خبر ہے کلام الٰہی تیرے اندر موجود ہے اور تو اس کا پردہ دار ہے۔ یعنی خدا تیرے اندر ہے اور تجھے خبر نہیں۔ تیری حالت تو اس بوتل کی طرح ہے، جس کے اندر گلاب کا عطر ہے، مگر وہ اس کی خوشبو سے بے خبر ہے۔

غم عشق، خدا کا دیا ہوا بہترین عطیہ ہے، دنیا کی ایک عظیم دولت ہے غم عشق ہر کس و ناکس کو عطا نہیں ہوتا۔ نفسانی لذتوں کے جال میں پھنسے ہوئے بدمست دنیادار اسے کیا جانیں۔ اس لیے خدا انہیں درد عشق کی دولت سے محروم رکھتا ہے پروانے کا سوز، پھول کا رس چوسنے والے بھونرے کو ملے یہ ناممکن ہے۔ اس عشق کو پانے کے لیے زندگی بھر دردیں کروٹیں بدلنا پڑتا ہے، سوز میں تڑپنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکر محبوب کا آغوش نصیب ہوتا ہے۔ یہ نادر نعمت ہر کس و ناکس کو نہیں ملتی۔

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند — سوز دل پروانہ، مگس را ندہند
عمری باید کہ یار آید بہ کنار — ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

ترجمہ: سرِ دمِ عشق بوالہوس کو نہ دیا — سوزِ دل پروانہ مگس کو نہ دیا
اک عمر گزرنے پہ [illegible] وہ دوست — جس سے وہ کشف [illegible] ہر خس کو نہ دیا

عاشق کو اپنے محبوب کے لگاتار تصور اور ہمیشہ اسی کے خیال میں محو رہنے سے جو سکون و چین اور انتہائی لطف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ سچا عاشق اسے پاکر ایسی دائمی دولت اور ابدی نعمت سے مالا مال ہو جاتا ہے کہ دنیاوی زر و مال کا محتاج نہیں رہتا۔ وہ سب سے بڑا دولت مند ہو جاتا ہے۔

بے فکر و خیال دوست راحت نہ بود — اندیشہ مال و جاہ و دولت نہ بود
سر رشتہ جان و دل بہ دلبر بسپار — با دولت پائیدار دولت نہ بود

ترجمہ: اس ہمدم کے تصور سے تو مغرور نہ ہو — دیوانہ دولت نہ ہو، مغرور نہ ہو
دلبر کے سپرد کر دے اپنے دل و جاں — اس دولت پائیدار سے دور نہ ہو

یہ دنیا جو کہ عارضی اور فانی ہے، اس کی شان و شوکت، اس کا طمطراق، اس کا دبدبہ اور اس کا زر و مال سب کچھ فریب ہے، دھوکہ ہے، یہ جسد خاکی بھی تو فانی اور عارضی ہے عارضی مقام کو دائمی مسکن و وطن نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے اس دو روزہ قیام کے لیے اس کی تمنا فضول ہے۔

اندیشہ مال و جاہ دنیا غلط است — این وہم و خیال و فکر بیجا غلط است
در خانہ تن وطن نہ باشد ہرگز — از بہر دو روز این تمنا غلط است

ترجمہ: اندیشہ و مال و فکر دنیا ہے غلط — یہ شوق غلط یہ فکر بیجا غلط است
یہ روح بدن میں رہے گی دائم — دو روز این تمنا غلط است

دنیا سے فانی اور عارضی جسم انسانی کے بارے میں وہ کہتے ہیں

دنیا ہمگی اگر بکام تو بود — دین سکہ ہر درم بنام تو بود
آخر ز جہاں چلے بقا باید رفت — گر قیصر و فغفور غلام تو بود

ترجمہ: دنیا سے جو حاصل ہوا تجھے سب العلم ہو سکا جو وہ پہ بھی تیرا نام
اک دن تو یہاں سے کوچ کرنا ہوگا ہوا قیصر و کسریٰ کا بھی اگر تیرے مقام

غفلت کو انسان کا عظیم ترین دشمن قرار دیتے ہوئے حضرت سرمدؒ کہتے ہیں۔

در دہر عدو مثال غفلت نہ بود ۔ خواری بتر از خواہش رفعت نہ بود
دم پیری شو کہ آخر وقت حاصل دگرت بجز ندامت نہ بود

ترجمہ: دشمن ترا کوئی نہیں غفلت کے سوا یہ خواہش رفعت نہیں ذلت کے سوا
ہشیار ہو پیری میں کہ اس منزل پر ملتا نہیں کچھ شرم و ندامت کے سوا

جس انسان کے دل میں سونے چاندی کے حصول کی خواہش ہے، وہ کتنا نادان۔
اس کو اپنے انجام کی خبر نہیں ہے، وہ کہتے ہیں۔

چنداں دل نادان بہ غم سیم و زر است کو وقت نماز ہم بہ فکر دگر است
در وہم و خیال این و آن بیشتر است از فکر مآل کار خود بے خبر است

ترجمہ: اتنا دل نافہم ہے دیوانہ زر ہے وقت نماز بھی اسے فکر دگر
سودا اسے ہر وقت ایں و آں کا اپنے انجام کی نہیں کچھ بھی خبر

اللہ کی عبادت و طاعت کا مشورہ دیتے ہوئے سرمدؒ کہتے ہیں۔

سررشتہ اختیار با یار گزار خود را ز غم و محنت بے ہودہ برار
ایں عمر گرامی کہ تمامی ہوس است با یاد بسر بر بہ غفلت مسپار

ترجمہ: خالق ہی ترا دوست ہے تو دوست کا ہو بے ہودہ نہ کر رنج نہ بیکار ہو
یہ عمر گرامی ہے فقط حرص و ہوا طاعت میں گزار اور غفلت میں نہ کھو

دوست کیسے افراد کو بنانا چاہیئے؟ اس تعلق سے سرمدؒ فرماتے ہیں۔

یاری بگزیں کہ بے وفائی نہ کند دل خستہ ترا در آشنائی نہ کند
پیوستہ در آغوش و کنارت گیرد ہرگز ز تو یک گام جدائی نہ کند

ترجمہ: وہ دوست بنا جو بے وفائی نہ کرے جو تجھ کو ستا کے آشنائی نہ کرے
آغوش محبت ہی میں رکھے تجھ کو ہمدم جو تجھے اقدام جدائی نہ کرے

حسد رکھنے والے دوستوں سے خود کو بچانے کا مشورہ دیتے ہوئے حضرت سرمدؒ کہتے ہیں۔

اندیشہ و یاران حسد پیشہ بکن سنگی کہ بہ بینی حذر از شیشہ بکن
از صحبت ایں طائفہ دل شاد مشو از مردم روزگار اندیشہ بکن

ترجمہ: یاران حسد پیشہ سے تو خود کو بچا پتھر ہیں یہ توڑیں گے دل شیشہ نما
ان لوگوں کی صحبت سے حذر لازم ہے ان لوگوں سے ڈرنے ہی میں ہے تیرا بھلا

عشق حقیقی کی شراب سے صوفی اپنے محبوب کی محبت میں اس قدر مخمور و سرشار ہو جاتا ہے کہ اسے نیک نامی و بدنامی اجامہ پوشی یا عریانی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس لیے صوفی درویش موت سے کبھی خوف نہیں کھاتے بلکہ شہید ہونے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔
حضرت سرمدؒ اپنی ایک رباعی میں اس کیفیت کے بارے میں کہتے ہیں۔

سرمد مارا بہ عشق رسوا کردند سرمست و سراسیمہ و شیدا کردند
عریانی و تن بود غبار رہ دوست آن نیز بہ تیغ از سر ما وا کردند

ترجمہ: سرمد ہمیں کرتی ہے محبت رسوا سرمست و سراسیمہ و شیدا بھی ہے
عریانی و جسم تھی غبار رہ دوست تلوار نے اس کو بھی نہ باقی چھوڑا

اس رباعی کے مصداق حضرت صوفی سرمدؒ جام شہادت نوش کر کے صوفی شہیدوں کی روایت کو از سر نو زندہ کیا۔ سرمدؒ کی تاریخ شہادت ان کے مزار پر لگے کتبہ کے مطابق ۱۸۔ ربیع الثانی ۱۰۷۰ ہجری بمطابق ۱۶۶۰ عیسوی ہے

شاہ سرمد در عہد عالمگیر چوں سفر ساختہ بہ خلد بریں
گفت تاریخ اکبر مسکیں " لحد مرقد شہید سرمد ایں "
(۱۰۷۰ھ)

(اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں شاہ سرمدؒ نے جب آخرت کا سفر کیا
تو اکبر مسکین نے ان کی [illegible] شہادت کہی یہ [illegible] کی ہے ۔)

(نہائے دکن ۱/۲ ۱۵۹ سے ماخوذ)

سلسلہ صفحہ ۲۱

جیسے زبردست محدث نے بھی شیخ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ حضرت امام حنبلؒ حضرت
ابوحمزہ بغدادیؒ اور شیخ عزالدین محدثؒ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ کے آگے سر
جھکانے اور فیض حاصل کرنے پر مجبور ہوئے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ولی اللہ اور اس کے کمال باطنی کا موازنہ کرنے کے لیے چشم بصیرت
نہیں چشم باطنی کی بھی ضرورت ہے ۔ علامہ ابن تیمیہ بڑے پایہ کے عالم تھے مگر وہ علم حقیقت
طریقت کو کیا سمجھتے تھے ۔ قال نہ حال کے اسرار کا ادراک کیا کر سکتے تھے یہی دیکھیے کہ
تحریروں میں کسی قدر درشتی اور تشنیع سے کام لے رہے ہیں ۔ حالانکہ یہ رویہ کتاب
کے مخالف ہے ۔ اہل اللہ کبھی مخالفین کے خلاف ایسا رویہ اختیار نہیں کر سکتے تھے ۔

سلسلہ صفحہ ۱۲

فاروق اعظم نے ہر مسئلہ اور معاملہ میں حق و باطل کے فرق کو واضح کر دیا اور
باطل کو ہٹا کر حق کو قائم کر دیا ہے ۔ آج بھی اگر ان کے بتائے اصولوں پر حکومت کی
بنیاد رکھی جائے تو حق و انصاف کا بول بالا ہو مسلمان چاہیں تو یہ خواب شرمندہ تعبیر
ہو سکتا ہے ۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

تبدیلیِ مذہب اور اسلام کا خصوصی وصف

قبول اسلام میں اصل چیز دل ہے، جب وہ تبدیلی پر رضامند ہو جاتا ہے اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے، تو پھر باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ اس تبدیلی کی تائید کے لیے وقف ہو جائے۔

ہمیں اسلام کے قدیم اور جدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ قدیم مبلغین کا اثر غیر مسلموں کے دلوں پر ہوتا تھا، وہ اپنی للہیت، بے نفسی، خوش خلقی اور [illegible] مروت کی بدولت اور اداؤں سے دلوں کو گرویدہ کر لیتے تھے۔ اور اس طرح ہزارہا لوگ از خود بغیر کسی بحث و تکرار کے ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ مگر جدید مبلغین کا [illegible] دماغ کی تبدیلی پر صرف ہوتا ہے، وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں، مقابلہ میں دوسری حجت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں۔ اس پر بحث [illegible] شروع ہو جاتی ہے۔ مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے غیر مسلم اپنے [illegible] پر تن جاتا ہے، اس سے ضد پیدا ہوتی ہے اور ہدایت ختم ہو جاتی ہے۔

[illegible] اسلام کو دلوں کے متاثر کرنے کے لیے [illegible] چاہیے [illegible] مسلمان [illegible] قبولیت کے [illegible] کی پیروی کریں [illegible] میں [illegible] حاصل کرنے کے لیے اپنا [illegible] پیش [illegible]

جو طبیعت میں فطرت کہلانے میں لذت پیدا کرتی ہے لیکن آپ اسے بے اختیار کھا جاتے
اس وقت ایک بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا کہ یہ کھانا بھی کیا واسطے مفید ہو
آپ ایک ضروری کام پر جا رہے ہیں راستے میں کہ ناگہاں پھولوں کی ایک خوشنما زمی
اور لب جو ایک حسین نظارہ سامنے آجاتا ہے ۔ آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے
وہیں ٹھنڈی ہوا کا ایک دلنواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے ۔ اس
وقت کوئی شخص بھی دماغ سے یہ نہیں پوچھتا کہ مجھے سونا چاہیئے یا نہیں ؟

مختصر یہ کہ فطرت ہر کام میں اسی طرح دلوں کو گرویدہ کر کے اپنا مطلب نکالتی ہے
وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی ۔ اسلام چونکہ سراسر نور فطرت ہے ۔ اس
مبلغین اسلام کو چاہیئے کہ اخلاق و محبت کی گہرائیوں سے اس طرح تسخیر کریں کہ ان
سرکشی اور انکار کی سکت ہی باقی نہ رہے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ مبلغ اس
اسلامی کیریکٹر کی عظمت کے مالک ہوں ، تاکہ سرکش سے سرکش آدمی بھی ان کے سامنے
اپنی گردنیں جھکا دیں ۔ باقی رہے دماغی مباحث اور عقلی تکرار ... تو اس سے
تو دل مطمئن ہو سکتے ہیں ، نہ منقلب ہو سکتے ہیں اور نہ فطرت رام ہو سکتی ۔

اب یہ دیکھیئے کہ دل کی دنیا میں کیسی دلیلوں پر عمل کیا جاتا ہے ۔ یہ چند ہی سال
ذکر ہے کہ یہاں ایک غیر مسلم جج کا انتقال ہو گیا اس کے کچھ عرصہ بعد یہ بات
مشہور ہوئی کہ ان کی بیوہ مشرف بہ اسلام ہو رہی ہیں ۔ یہاں کے غیر مسلموں کو
طور پر اس واقعہ سے تکلیف ہوئی ۔ عورت کے عزیز و اقارب جمع ہو گئے اور
سبھی نے مل کر زور ڈالا کہ وہ مسلمان ہونے کے خیال سے باز
ہو جائے ... لیکن اس تمام دباؤ کے باوجود عورت کے ارادے میں [illegible]
نہ آیا ۔

عزیزوں کی ناکامی کے بعد دوسرا قدم جو اٹھایا گیا یہ تھا کہ [illegible]

پنڈت اور پیشوا بلائے گئے۔ انہوں نے کتھائیں سنائیں، تاریخی حوالے دیئے۔ مذہبی احکام بتائے، اپنے دھرم کی سچائی کی دلیلیں پیش کیں۔ تعلیم و تعلّم کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا، مگر عورت پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے تمام مذہبی احکام سن لیے اور آخر میں صرف یہ کہہ دیا کہ "میں فرد مسلمان ہو کر رہوں گی۔"

اب آریہ سماج کے مبلغ بلائے گئے، انہوں نے مخالفت کا دفتر کھول دیا۔ مسلمانوں کے مظالم پیش کیے، اسلامی احکام کی تردید کی، مسلمانوں سے نفرت دلائی، اورنگ زیب اور محمود غزنوی کا ذکر چھیڑا، "گئو ماتا" کے نام پر اپیل کی۔۔۔ یہ سلسلہ بھی کئی دن تک جاری رہا، مگر عورت اب بھی اپنے ارادے پر مستحکم تھی۔

تیسرا قدم یہ تھا کہ عورت کو ڈرایا گیا۔ زدوکوب کی دھمکی اور قتل کی دھمکی دی گئی۔ خوف کے ساتھ طمع کے مناظر بھی سامنے لائے گئے۔

۔۔۔ مگر عورت اب بھی متاثر نہ ہوئی۔

اب سوال و جواب شروع ہوئے۔ عورت سے پوچھا گیا کہ "تم کیوں مسلمان ہونا چاہتی ہو۔ کیا تمہیں مال و دولت کی خواہش ہے؟"

عورت نے کہا کہ "تم دیکھ رہے ہو کہ میرے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔" پھر پوچھا گیا "تمہیں کیا کوئی نفسانی خواہش ہے؟"

عورت نے جواب دیا "تم میری عمر کو دیکھ رہے ہو۔ میں تو اب چند دنوں کی مہمان ہوں۔"

"پھر پوچھا گیا" کیا کسی مسلمان مولوی یا مبلغ نے تمہیں بہکایا ہے؟"

عورت نے جواب میں کہا کہ "میں نے زندگی بھر کسی مسلمان مولوی سے نہیں ملی، اور میں نے کوئی اسلامی کتاب بھی نہیں دیکھی۔"

اب لوگ متعجب ہوئے اور انہوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔۔۔۔

اپنے پتی کی زندگی سے لیکر اب تک ... اس ملاقات سے پہلے میں ہی تھی لیکن سبب معلوم نہیں کر سکی سب چند روز ہوئے، میں نے اس راز کو معلوم کر لیا ہے کہ مسلمان چونکہ خدا پرست اور پاک طینت اور ان کی روح پاک ہے، اس واسطے ان کے جسموں سے بو نہیں آتی۔ وہ قیمتی کپڑے پہنیں یا معمولی۔ ان کے جسم فرو بو سے پاک ہوتے ہیں لیکن اس کے برخلاف غیر مسلم چونکہ مشرک ہیں۔ اور ان کی روح پاک نہیں ہے، اس واسطے خواہ وہ کسی قدر بھی صاف اور پر تکلف لباس پہنیں، ان کے جسم بو سے پاک نہیں ہوتے۔"

اس اعلان کے بعد عورت کی آنکھیں چندھیا گئیں، ان کے چہرے پر جوش ایمان کی سرخیاں دوڑنے لگیں، اور اس نے بھرائی آواز میں اپنے رشتہ داروں کو متنبہ کیا کر.....

"مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو، میں اسلامی توحید کے نور سے اپنی روح کو پاک کرنا چاہتی ہوں، اس واسطے میں ضرور مسلمان ہوؤں گی۔"

الغرض عورت نے اپنے تمام رشتہ داروں کے سامنے کلمہ پڑھا۔ عورت کے بیان پر سب پریشان تھے.... مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ عورت اپنے اقرار پر قائم رہی اور بالآخر مسلمان ہو گئی۔

(رہنمائے دکن ۲/۹ ۱۹۵۰ء سے ماخوذ)

محمد یوسف شاداب

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے

جناب محمد موسیٰ اللہ خان صرف ممتاز صنعت کار ہی نہیں بلکہ ایک دانشور بھی ہیں، ملی اتحاد کے لیے ان کی کاوشوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ بوسنیا کنونشن کے بعد اسلامک یونیورسل سائنس کنونشن ان ہی کاوشوں کا ثمر ہے

قیامت کے دن خدا فرمائے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جو میرے لئے لوگوں سے محبت کرتے تھے، آج میں انکو اپنے سائے میں جگہ دونگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہیکہ !

خدا کے بندوں میں کچھ ایسے ہیں جو نبی اور شہید تو نہیں لیکن قیامت کے روز خدا انکو ایسے رتبوں پر سرفراز فرمائیگا کہ انبیاؑ اور شہدا بھی انکے مرتبوں پر رشک کریں گے۔

صحابہؓ نے پوچھا کہ وہ کون ہونگے یا رسول اللہ ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے محض خدا کیلئے محبت کرتے تھے۔ نہ یہ آپس میں رشتہ دار تھے اور نہ انکے درمیان کوئی لین دین تھا خدا کی قسم قیامت کے دن انکے چہرے نور سے جگمگا رہے ہونگے جب سارے لوگ خوف سے کانپ رہے ہونگے تو انہیں کوئی خوف نہ ہوگا اور جب سارے لوگ غم میں مبتلا ہوں گے اسوقت انہیں قطعاً کوئی غم نہیں ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

و سنو اللہ کے چاہنے والوں کیلئے نہ کسی بات کا خوف ہوگا اور نہ کسی قسم کا غم۔"
اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی نیابت عطا فرمائی تو فرشتوں نے عرض کیا کہ یہ زمین پر فساد پھیلائے گا۔ یہ بتانے کے لیے کہ آدم کے اندر شر کے ساتھ فلاح اور خیر کا سمندر بھی ہے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ ہماری تخلیقی صفات بیان کرو۔ جب صفات (اسماء) بیان کئے تو فرشتے پکار اٹھے :

" پاک اور مقدس ہے آپ کی ذات، ہم کچھ نہیں جانتے مگر جس قدر علم آپ نے ہمیں بخش دیا ہے۔ بے شک و شبہ آپ ہی کی ذات علیم اور حکیم ہے۔"

ہمارے لیے یہ بہتر ہے کہ ہم شر سے محفوظ رہیں اور صبر کو اپنائیں اور دوسروں کو بھی اسکی تلقین کریں۔ اللہ کے پیغام کو پہنچانے اور ہر قسم کی قربانی کیلئے اپنے اندر ہمت و عزم پیدا کر کے خدا کی راہ میں وقت اور پیسہ خرچ کیجیے۔ اللہ اور اس کے رسول کا پیغام دوسروں تک پہنچانا امت مسلمہ پر فرض ہے اور ان نعمتوں کا شکر ادا کریں جو اللہ نے ہمیں عطا کی ہیں۔ آج کا دور دولت پرستی کا دور ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ دولت پرستی اور بت پرستی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ پتھروں کو پوجنا یا دولت اور سونے کو پوجنا ایک ہی بات ہے۔ سونے چاندی اور جواہرات کی محبت نے قوم کو اس حد تک اندھا کر دیا ہے کہ شرافت اور خاندان کا معیار ہی دولت بن گیا ہے ہماری تمام انسانی قدریں پامال ہو چکی ہیں۔ قومی روایات اب ملبے کا ڈھیر بن گئی ہیں۔ موت کے بعد زندگی کا یقین اٹھ چکا ہے۔ اللہ کے ان ضابطوں کی کھلی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔

" اللہ کی رسی مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔"

اللہ کا ایک بندہ جب اسکے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو قوم کانوں میں روئی رکھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ نیک لوگ آنسو بہاتے ہیں اور شیطان اپنی کامرانی پر ہنستا ہے

"جو لوگ میرے الہام کو بھول جائیں گے ہم یہاں انکی روزی تنگ کر دینگے اور قیامت میں انہیں اندھا بنا کر اٹھائینگے" (طٰہٰ)

[illegible] آیات کا علم جب حاصل ہو جاتا ہے تو انسان کے اندر ایمان و یقین کی ایک دنیا روشن ہو جاتی ہے۔ اور نور سے دل منور ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"جب ان کے سامنے آیات الٰہی کی تفسیر پیش کی جاتی ہے تو انکے سینے منور ہو جاتے ہیں۔"

(سورہ انفال)

اللہ کی جماعت کے ارکان آپس میں شفیق اور ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹنے والے ہوتے ہیں اور انکی مجموعی مثال جسم کی طرح ہوتی ہے کہ اگر جسم کے کسی حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورا جسم یہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔

"تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کا آئینہ ہے، پس اگر وہ اپنے بھائی میں کوئی خرابی دیکھے تو اسے دور کر دے (حدیث)

تین باتیں ہلاکت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

۱) ایسی خواہش، انسان جس کا غلام بن کر رہ جائے

۲) ایسی حرص جس کو پیشوا مان کر آدمی اس کی پیروی کرنے لگے

۳) خود پسندی۔ اور یہ بیماری سب سے خطرناک ہے (حدیث)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار منبر پر تشریف فرما ہو کر حاضرین کو [illegible] فرمایا!

مسلمانوں کے عیب کے پیچھے نہ پڑو۔ جو شخص اپنے مسلمان بھائیوں کے پوشیدہ عیبوں کے درپے ہوتا ہے تو خدا اسکے چھپے ہوئے عیب کو علانیہ ظاہر کر دیتا ہے اور جس کے عیب [illegible] کرنے پر خدا [illegible] اسکو رسوا کر کے [illegible]

اگرچہ وہ اپنے گھر کے اندر گھس کر ہی بیٹھ جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے!

اپنے دوست سے دوستی میں حد سے زیادہ نرمی اختیار کرو، ہو سکتا ہے وہ کسی وقت تمہارا دشمن بن جائے۔ اسی طرح دشمن سے دشمنی میں نرمی اور اعتدال کا رویہ اختیار کرو۔ ہو سکتا ہے وہ کسی وقت تمہارا دوست بن جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ صحابہ نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون سے حقوق ہیں؟ آپ صلعم نے فرمایا۔ جب تم مسلمان بھائیوں سے ملو تو اسکو سلام کرو۔ جب وہ تمہیں دعوت کیلئے بلائے تو اسکی دعوت کو قبول کرو۔ جب وہ تم سے مشورہ کا طالب ہو تو اسکی خیر خواہی کرو۔ اور نیک مشورہ دو۔ جب اسکو چھینک آئے اور وہ الحمد اللہ کہے تو اسکے جواب میں کہو یرحمک اللہ۔ جب وہ بیمار پڑ جائے تو اسکی عیادت کرو اور جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے آدم کے بیٹے میں بیمار پڑا تو نے میری مزاج پرسی نہیں کی، میری عیادت نہیں کی۔

بندہ کہے گا پروردگار عالم آپ ساری کائنات کے رب ہیں بھلا میں آپ کی عیادت کیسے کرتا۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو اسکی عیادت کو نہیں گیا۔ اگر تو اسکی مزاج پرسی کیلئے جاتا تو مجھے پاتا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمیشہ پر امید رہیئے اور یہ یقین رکھیئے کہ گناہ خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں اللہ تعالیٰ کی رحمت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ سمندر کے جھاگ سے زیادہ گناہ کرنے والا بھی جب اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر خدا سے

گرگڑاتا ہے تو خدا اسکی سنتا ہے اور اسکو اپنے دامن رحمت میں پناہ دیتا ہے
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اے میرے بندو جو اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے ہو خدا کی رحمت سے ہرگز مایوس نہ ہونا۔ یقیناً خدا تمہارے سارے کے سارے گناہ معاف فرما دیگا، وہ بہت ہی معاف کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے اور تم اپنے رب کی طرف رجوع ہو جاؤ اور اسکی فرمانبرداری بجا لاؤ اس سے پہلے کہ تم پر کوئی عذاب آپڑے اور پھر تم کہیں سے مدد نہ پاسکو گے۔ (سورۃ الزمر ۵۳، ۵۴)

توبہ کے بعد اس پر قائم رہنے کا پختہ عزم کیجئے۔ دشمنوں کی فتنہ انگیزی اور ظلم سے گھبرا کر بے ہمت بزدل اور پریشان ہو کر بے رحموں کے سامنے سرنگوں ہو کر اپنے وقار کو داغدار کرنا دراصل احساس کمتری اور خود کو ذلیل کرنے کی علامت ہے آخر دشمن میں آپ کے ملی تشخص کو پامال کرنے کی جرأت کیوں ہوئی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسکی دو وجوہات بتائی تھیں۔

۱) مسلمان دنیا سے محبت کرنے لگیں گے۔
۲) موت ان کے اوپر خوف بن کر چھا جائیگی۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو نیک توفیق دے اور ہم اپنی زندگی اسکی رضا کیلئے گزاریں اور ناامید نہ ہوں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہم کو غم اور خوف سے نجات دیگا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی و اطاعت کا پیمان باندھنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تعلیم فرمائی ہے جو صبح اس استغفار کو پڑھے اور دن میں مر جائے تو وہ جنتی ہوگا اور جو رات کو پڑھے اور انتقال کر جائے تو وہ انشاء اللہ جنتی ہوگا۔

(ماخوذ)

مذہبی رواداری کی قابلِ تقلید مثال

ارجنٹینی صدر کے نومسلم فرزند کی پورے سرکاری اعزاز کیساتھ اسلامی طریقہ کے مطابق تجہیز و تدفین

انگلش عربی بین الاقوامی کثیر الاشاعت ہفت روزہ مسلم ورلڈ (العالم الاسلامی) کے تازہ شمارہ کے پہلے صفحہ پر یہ خبر چھپی ہے کہ ارجنٹینا کے صدر کے بڑے صاحبزادے کار لاکس منعم جنہوں نے اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ کا ہیلی کاپٹر کے ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ اسلامی طریقہ پر تجہیز و تکفین کے بعد بوئنس ایرس میں مسلمانوں کے قبرستان میں اسلامی طریقہ کے مطابق انہیں دفن کیا گیا۔

ارجنٹینا کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ تجہیز و تدفین کی اسلامی رسم کی اعلیٰ سطح سے اور اس اعزاز کے ساتھ ادائیگی عمل میں آئی ہے۔ اس موقع پر حکومت کے تمام اہلکار، وزراء، فوج اور پولیس کے عہدیداران، ممبران پارلیمنٹ اور حکومت کے نمائندے موجود تھے۔ قصر جمہوریت نے پہلی مرتبہ ایک سرکاری بیان جاری کیا جس میں کہا گیا ہے کہ جنازہ قصر جمہوریت سے پہلے اسلامک سنٹر لیجایا جائیگا۔ اور پھر وہاں سے مسلمانوں کے مقبرہ میں دفن کیا جائے گا۔ اس بیان کو ملک کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اہمیت کے ساتھ نشر کیا۔ اسی طرح پہلی مرتبہ صدارتی محل سے سرکاری سوگ کے دنوں میں قرآن کی تلاوت سے گونجتا رہا۔ اللہ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔ (آمین)

عربی سے ترجمہ: آفتاب عالم ندوی (تعمیر حیات ۲۵ / ۹۵ء بابت)

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

عہد عثمانی میں تاریخ ساز علمی اور فنی خدمات

ریاست حیدرآباد نے عہد عثمانی میں تاریخ ساز علمی اور فنی خدمات انجام دیں۔
آصف سابع نے علم پرور کے جو چراغ اپنی حکمت عملی سے روشن کئے تھے ان کی روشنی
سے اصحاب علم و فضل ہمیشہ استفادہ کرتے رہے۔ اس خیال کا اظہار سرکردہ مورخ اور
ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے کل مکرم جاہ اسکول پرانی حویلی میں ایک لکچر دیتے ہوئے
کیا جس کا اہتمام مکرم جاہ ایجوکیشن اینڈ لرننگ ٹرسٹ نے آصف ثامن نواب مکرم
بہادر کی سالگرہ کے سلسلے میں کیا تھا۔ پروفیسر جعفر نظام نے اس لکچر کی صدارت
شریمتی نارز پرنسپل محترمہ فخرالنساء ہیم دالس پرنسپل نے اور محترمہ مسعودہ نے مہمانوں
کا استقبال کیا اور خطبہ استقبالیہ اور رپورٹ پیش کی جلسہ کی کارروائی چلانے میں
اعانت کی۔ جناب محفوظ علی خاں مکرم جاہ ٹرسٹ اس جلسہ کے مہمان خصوصی تھے
اسکول کے طلباء و طالبات نے کلچرل پروگرام ممتاز گلوکار عنان اطہر کی رہنمائی میں پیش
کی اور آصف سابع کا کلام ترنم اور ساز کے ساتھ بھی پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر داؤد اشرف
نے اپنا لکچر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ عالمی شہرت یافتہ اردو اور فارسی لغت جیسے
سید علی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مرتب کیا اس کیلئے آصف سابع
کی فراخدلانہ مالی اعانت اور کام کی تکمیل کیلئے ملازمین سرکار کو تنخواہ
رخصت دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اسی طرح تاریخ اسلام کے لئے اور

سیرت النبی کی تیاری کے لئے بھی فراخدلانہ عطیے اور مولانا عبدالحلیم شرر اور علامہ سلیمان ندوی کو سہولتوں کی فراہمی اپنی مثال آپ ہے۔ یہی نہیں بلکہ صفیہ عامیا بالنزمہ کا اشاعت اسلام بھی آصف سابع کی بے پناہ فیاضی کا ثبوت ہے۔ انہوں نے کہا کہ آصف سابع کے عہد کے تمام صاحبان علم و فضل نے ریاست حیدرآباد سے ہر طرح کی سرپرستی حاصل کی۔ ڈاکٹر اشرف نے کہا کہ آصف سابع کی خدمات صرف اردو اور فارسی تک محدود نہیں رہی بلکہ انہوں نے دیگر زبانوں کی بھی اعانت و سرپرستی کی جس میں سنسکرت بھی شامل ہیں۔ جناب محفوظ علی خان سکریٹری مکرم جاہ ایجوکیشن اینڈ لرننگ ٹرسٹ نے اپنی تقریر میں آصف ثامن کو سالگرہ پر انہیں مبارکباد دی اور کہا کہ خاندان آصفی نے علم و فضل کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ کا روشن حصہ ہے۔ انہوں نے مکرم جاہ اسکول کو بھی اس علم نوازی کا حصہ قرار دیا اور اسکول انتظامیہ تعلیمی سرگرمیوں کی ستائش کی۔ پروفیسر جعفر نظام سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی نے اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر داؤد اشرف کی تاریخ دانی اور تحقیق سے دلچسپی کو مثالی قرار دیا اور کہا کہ داؤد اشرف سے مستقبل کی نیک توقعات وابستہ ہیں کہ وہ مستقبل کے ایک عظیم اور نامور مورخ اور محقق ثابت ہوں گے انہوں نے آصف سابع کی ہستی کو علم و فضل کی مثال اور قابل قدر ہے اس موقع پر پرانی حویلی کے مسرت محل کا ایوان عام حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں ادیب، شاعر دانشور صحافی اور فنون اور محققین کی بڑی تعداد شامل تھی۔ یہ جلسہ پرنسپل محترمہ نازر اور وائس پرنسپل محترمہ فہیم اور محترمہ سید مسعودہ کے مختلف زبانوں میں شکریہ پر اختتام کو پہونچا۔ محترمہ فہیم سلام یہ بارگاہ حضور خیرالانام سنا کر حاضرین پر رقت طاری کر دی۔

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشاء
(ادا سنار کی ٹاؤن ناگپور)

غزل

جنوں میں یوں ہوئے مشہور چار سو ہم لوگ
ہر انجمن میں ہیں موضوعِ گفتگو ہم لوگ

لہو لہو دل و جاں کو کیا ہے تب جا کر
مصافِ زیست میں ٹھہرے ہیں سرخرو ہم لوگ

ہمیں پہ تنگ وہ ارضِ چمن ہوئی کہ جسے
بصد خلوص پلاتے رہے لہو ہم لوگ

نگاہِ گرم سے دیکھو نہ گلستاں والو
بہارِ غنچہ و گل کی ہیں آبرو ہم لوگ

ہزار یورشِ آلام تو بہ تو ہو جائے
نہ چھوڑیں گے کبھی دامانِ آرزو ہم لوگ

ہے تار تار بہت زندگی کا پیراہن
کہاں تلک اسے کرتے رہیں رفو ہم لوگ

قرار کہتے ہیں جس کو ہمیں نہیں ہے نصیب
ہر ایک لمحہ ہیں سرگرمِ جستجو ہم لوگ

بیانِ حق و صداقت کے باب میں منشاء
کسی بھی قسم کا کرتے نہیں غلو ہم لوگ

غزل

رحمٰن جامی

ہمیں تو سلسلۂ نیک و بد میں رہنا ہے
ہم اہلِ فن ہیں چشمِ حسد میں رہنا ہے

روایتیں تو یہی ہیں جدیدیوں کو بھی!
قدامتوں سے گھرے ربط وجد میں رہنا ہے

اگرچہ روح ہے بے چین تجھ سے ملنے کو
مگر ابھی اسی خاکی جسد میں رہنا ہے

تری خوشی کیلئے ہے قیام اپنا بھی
ازل میں رہ چکے آگے ابد میں رہنا ہے

ہماری حد ہمیں معلوم ہے کہ بے حد ہیں
مگر ہمیشہ محبت کی حد میں رہنا ہے

یہ زلزلے یہ تلاطم یہ مضطرب لمحے!
نہ جانے کب تک اسی جزر و مد میں رہنا ہے

اسی تضاد میں جینا کمال ہے شاید
جنوں کے ساتھ ہی شہرِ خرد میں رہنا ہے

ترقی کہتے ہیں ننیانوے کے پھیر کو ہم!
جہاں بھی جائیں اسی اک عدد میں رہنا ہے

اک امتیاز ہے جامی تمہارا اونچا قد!
ادب کے ساتھ اسی اونچے قد میں رہنا ہے

*

غزل

سعید شرجی
ص ب ۳۳۸۷ دوحہ قطر

اپنے کئے پہ آج بھی حیران ہے بہت
انسان اس جہاں میں پریشان ہے

عقبیٰ کو بھول بیٹھا ہے زر کی تلاش میں
اس کی تباہیوں کا یہ سامان ہے

بھولا ہوا ہے ملکِ عدم ہی کا راستہ
عیش و طرب میں یہ نادان ہے

اندازہ کیا کریں تیری قدرت کا اے خدا
دشوار ہے جہاں وہاں آسان ہے

امن و سکوں کا نام نہیں اپنے شہر میں
ہر سمت دیکھتا ہوں تو ہیجان ہے

اشرف بنا کے ہم کو کیا تو نے سرفراز
پروردگار ہم پہ یہ احسان ہے

کیوں سبز باغ ہم کو دکھلاتے راہبر
اچھے برے کی ہم کو بھی پہچان ہے

ہیں آستیں کے سانپ بھی پیچھے پڑے ہوئے
اپنے لیے بھی دولتِ ایمان ہے

اپنا مقام کیا ہے ذرا چل کے دیکھئے
اندروں میں اپنا جانا ہے پہچان

رغبت سے ہم نے دیکھا نہیں اس جہان کو
دنیا میں یوں تو عیش کا سامان

کب ہوگی شانتی کی فضا میرے شہر میں
دل میں یہی تو اپنے اک ارمان

تقلید غیر کی کریں ہم کس لیے سعید
مومن کی رہبر کو تو قرآن ہے بہت

غزل

افضل عنایت بیگم افضل

ناز اٹھانے کی بات کرتے ہو
دل دکھانے کی بات کرتے ہو

راہ چلتے ہو میرے ساتھ مگر
چھوڑ جانے کی بات کرتے ہو

کوئی تنکا نہیں ہے گلشن میں
آشیانے کی بات کرتے ہو

ایک تبسم کی بھیک کے بدلے
دل جلانے کی بات کرتے ہو

کعبۂ دل کو توڑنے والو
گھر بنانے کی بات کرتے ہو

کون کرتا ہے اعتبارِ وفا
کس زمانے کی بات کرتے ہو

یاد کے نقش گہرے ہوتے ہیں
بھول جانے کی بات کرتے ہو

غم زدوں سے مذاق سو بھلا ہے
مسکرانے کی بات کرتے ہو

ذکر انکا ہے آج بھی افضل
تم زمانے کی بات کرتے ہو

حسن جلگانوی

ورثہ

ہمارے درد کی دہلیز سے گذرتے ہوئے
گذرتا وقت سکھے مل کے کسمسایا تھا
کہ مٹھیوں میں چھپی اس کے سیپیاں تھیں بہت
وہ مجھ کو سونپ کے اپنی امانتیں مجھ سے
نئی حیات کا اقرار لے کے لوٹ گیا
وہ سیپیاں تو سبھی ریزہ ریزہ ٹوٹ گئیں
مگر اے میرے فرشتے مرے گلاب کے پھول
میں تجھ کو آج جنم دن کی نیک ساعت پہ
ملی جو سینہ بہ سینہ وہ زندگی دے دوں

جو تیری راہ اجالے وہ روشنی دے دوں

فاروق عارفی

غزل

ایسے حالات بھی تاریخ میں اکثر آئے
لیکے پیغام اخوت کا پیمبر آئے

بے رُخی حسن کی فطرت ہے گلہ کیا کیجے
ہم تیری بزم میں سب سوچ سمجھکر آئے

دینے والے تری رحمت پہ بھروسہ ہے مجھے
تو اگر چاہے تو قطرے میں سمندر آئے

اُن کا چہرہ جو تصوّر میں نظر آیا تھا
چاند، سورج تیری آنکھوں میں اُتر آئے

ہم کو تو ربّ دو عالم نے بچایا فاروق
ورنہ مخلص بھی تو دشمن کے برابر آئے

○

رازؔ اٹاوی
کٹرا پردل خان، اردو روڈ
اٹاوہ، ۲۰۶۰۰۱ یوپی، انڈیا

غزل

زیست کی ہر گزر ہے رنجیدہ　　آدمی کا سفر ہے رنجیدہ
زندگی سے رہے سبھی رنجیدہ　　آجکل ہر بشر ہے رنجیدہ
ہر خوشی تلوار لگتی ہے　　دل کسی کا اگر ہے رنجیدہ
حال پوچھو نہ تم پرندوں کا　　طاقتِ بال و پر ہے رنجیدہ
غم زدہ بحرِ بیکراں ہوگا　　ایک قطرہ اگر ہے رنجیدہ
بیکسوں نے تو پی لیے آنسو　　ہر ستمگر مگر ہے رنجیدہ
گلستاں ماتمی لباس میں ہے　　رنگِ برگ و شجر ہے رنجیدہ
کسقدر غم زدہ فضائیں ہیں　　حسنِ شام و سحر رنجیدہ

قافلے رو رہے ہیں رستے میں
رازؔ ہر راہبر ہے رنجیدہ

ماہنامہ **شاداب** حیدرآباد

جلد: ۱۲

شمارہ: ۱۱

نومبر ۱۹۹۵ء

قیمت: ۶ روپے

زر تعاون

	سالانہ	۲ سال	تاحیات
ہندوستان	۶۵ روپے	۱۲۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۲۰۰ ،،	۳۶۰ ،،	۳۷۰۰ ،،
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱ ریڈ ہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد اے۔پی سے شائع کیا

فہرست

مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی

غیر شرعی رسم و رواج

ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے اور ملی و اجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بڑے وسیع اور دور رس ہیں، وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف و فضول خرچی، شہرت و عزت کے حصول یا رسم و رواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا اور اپنے پڑوسیوں عزیزوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر و فاقہ، اضطرار و اضطراب اور ان افسوس ناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے، جن میں کم سے کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں، فقر و فاقہ کی حقیقی ضروریات اور حلال و حرام کے معین حدود احکام میں خواہ اس کے سلسلے میں صراحت کا کوئی صریح فتوی اور نص نہ ملے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کی حکیم و عادل ذات اور ربوبیت و رحمت عامہ کی صفات کے لیے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول و زمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نان شبینہ کی محتاج ہو، جب بہت سے مریض دوا اور پرہیز سے محروم ہوں، شریف مرد اور عورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں، کہیں کسی بیوہ کے جھونپڑے کی چھت ٹپکتی ہو اور کہیں کسی غریب کے جھونپڑے میں دیا نہ جلتا ہو "ایک ایک دعوت" اور ایک ایک تقریب میں سیکڑوں اور ہزاروں روپے بے دریغ خرچ کیے جاتے ہیں۔

جس سلسلہ کی [illegible]

کو دعوت دینے والی چیز لڑکی والوں سے زیادہ سے زیادہ جہیز کا مطالبہ اور فرمائشوں کی وہ فہرست ہے جو لڑکے یا لڑکے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے اور اس کو رشتہ کی شرط قرار دیا جاتا ہے۔ کہیں اس کو "تلک" کی رسم کہیں "سلامی" اور کہیں "گھوڑے جوڑے" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لڑکی کو اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دینا خلاف شرع و سنت نہیں، بلکہ وہ درحقیقت اپنی اولاد کے ساتھ حسن سلوک و صلہ رحمی ہے، جو فی نفسہ امر مباح بلکہ مستحسن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگر گوشہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جہیز میں روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں دیں۔ جس میں ایک خمیل (جھالردار چادر) ایک مشک، ایک تکیہ دیا تھا جس میں گھاس بھری تھی بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کے دینے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جن سے شادی ہوئی تھی روزمرہ کے استعمال کا سامان بھی نہ تھا، اس سے ان کے اسباب خانہ داری کی فراہمی کی بھی نیت تھی، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ہر طبقہ اور حیثیت کے مسلمانوں نے اپنی بیٹیوں کو ضرورت کا سامان دیا اور یہ اب بھی جائز و مستحسن ہے لیکن اب اس کی شکل بالکل بدل گئی ہے اب نہ ہدیہ مقصود رہا ہے، نہ صلہ رحمی بلکہ نام و نمود شہرت کی طلب اور پابندی رسم رہ گئی ہے، اور اس میں بہت سی ایسی پابندیاں شامل ہو گئی ہیں، جن کی کوئی شرعی اساس نہیں، اس رسم کو پورا کرنے کے لیے لڑکی والے کو اکثر اوقات قرض بھی لینا پڑتا ہے، خواہ سود ہی دینا پڑے یا حویلی، باغ اور زرعی املاک فروخت کرنی پڑیں، ہندوستان سے باہر ممالک اسلامیہ میں اس کی یہ اہمیت اور اس کا یہ اہتمام نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی معاشرہ کی دین ہے۔ یہ چیز بد اکثر ہی فرقے اور ہندو سماج سے مسلمانوں میں پچھلے دنوں آتی ہے، اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اس نے شادی کو ایک مصیبت اور دشوار کن کام بنا دیا ہے اور اس کی وجہ سے ایسے افسوسناک واقعات پیش آتے اور آ رہے ہیں جن سے اس غیرت مندانہ کے حرکت میں آ جانے کا خطرہ ہے جس کی بنا پر سلطنتیں، معاشرتیں اور

تہذیبوں کے چراغ گل اور ملک زیر و زبر کر دئے گئے ہیں۔

مسلمانوں کا جو حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں، فرض تھا کہ ان کی موجودگی میں غیر مسلم معاشرہ میں بھی یہ ظلم عظیم نہ ہوتا، جس کی پاداش میں ملک پر قہر الٰہی کے نزول کا اندیشہ ہے، اور وہ اپنے کو اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث و نائب ثابت کرتے جس کے لیے ارشاد خداوندی ہے "اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اس وقت تک عذاب نازل کرنے والا نہیں ہے جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہیں۔

(سورہ الانفال ۳۳)

ملکی معاشرہ میں یہ بیماری کس حد تک پہنچ گئی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے مشہور اخبار "قومی آواز" مورخہ ۱۵ جون ۱۹۸۴ء کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے

"نئی دہلی ۹ جون مہیلا سرکشا سمیتی کے صدر و ممبر پارلیمنٹ مسز پرمیلا ڈنڈوتے نے کل ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی راجدھانی نئی دہلی میں اب جہیز کے لیے ہر بارہ گھنٹے بعد ایک دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے، جب کہ اس سے قبل ایک دن میں اس طرح کی موت واقع ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا کہ جہیز کے خاتمہ کے لئے اعلان تو بہت ہوتے ہیں اور اقدام بھی کئے جاتے ہیں لیکن یہ سب کاغذی معلوم ہوتے ہیں کہ ان سے صورت حال میں بظاہر کوئی سدھار نہیں آیا ہے۔ بلکہ وہ دن بدن ابتر ہوتی جا رہی ہے، جہیز کا سودا جیسے پہلے ہوتا تھا اب بھی دھڑلے سے ہو رہا ہے اور لڑکی والے جہیز کا بندوبست کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے باوجود ان کی لاڈلی اولاد کو جلا کر بھسم کر دیا جاتا ہے۔"

ایک دوسرے اخبار "دعوت" دہلی کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"گذشتہ سال دہلی میں ۶۱۵ عورتیں جل کر ہلاک ہو گئیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر روز اوسطاً دو عورتیں جل کر ہلاک ہوئیں، ان میں سے صرف چالیس عورتوں کی اموات کی وجہ جہیز کے تنازعات بتائی گئی تھی، گذشتہ سال طلاق میں جہیز کے تنازعات

کی وجہ سے ہونے والی اموات کے مقدمات کی سماعت کے لیے ایڈیشنل سیشن جج مسٹر ڈے جی کپور کو جج مقرر کیا گیا تھا۔ جب سے اب تک ان کی عدالت میں جہیز کی وجہ سے اموات کے صرف گیارہ مقدمات پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے چار کی سماعت مکمل ہو گئی ہے، اور ان مقدمات میں انھوں نے عمر قید کی سزا سنائی ہے۔ ایک اور ایڈیشنل سیشن جج مسٹر ایس ایم اگروال نے گذشتہ مئی میں جہیز کی وجہ سے ایک عورت کی موت کے مقدمہ میں سزائے موت کا حکم سنایا۔ یہ یقین کرنے کے مناسب وجوہات موجود ہیں کہ جہیز کی وجہ سے اموات کی تعداد درج کیے گئے مقدمات کے مقابلے میں زیادہ ہوگی۔"

لیکن افسوس ہے کہ خود مسلم معاشرہ میں یہ مرض داخل ہو گیا ہے، اور مسلمان اس کو دینی بلکہ انسانیت و شرافت کے بھی خلاف نہیں سمجھتے اور فہرست میں سے کسی ایک چیز کی تکمیل نہ ہونے پر مہینوں اور بعض اوقات برسوں منکوحہ بیوی یا بہو کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ضرورت ہے کہ اس کے خلاف ایک طوفانی مہم چلائی جائے اور مسلمانوں کے دینی شعور اور جذبے کو بیدار کیا جائے، اور اس رسم کا بالکلیہ استیصال اور قلع قمع ہو جائے۔ ورنہ اس کے نتیجہ میں کسی بلائے آسمانی یا آفت ناگہانی کے ظاہر ہونے کا خطرہ ہے، باقی اس کے جو معاشرتی خاندانی اخلاقی نتائج بد ظاہر ہو رہے ہیں وہ کسی کی نظر سے مخفی نہیں۔

سلسلہ

اور دعا کرتے ہیں کہ

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی	اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اور امید کرتے ہیں کہ ان کا انسانِ کامل ایسے اعلیٰ و ارفع مقام کا حامل ہو گا کہ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے	خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

حضرات :

اقبال ایک عظیم شاعر تھے۔ ایک نابغۂ روزگار۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال نے ایسی دیدہ وری کی۔ قدیم اساطیر، وید، اپنشد، گیتا، دوسری مذہبی کتب، قرآن حکیم، اسوۂ حسنہ حضور صلعم، عصر جدید کے رہنما، مارکس، لینن، نطشے، کانٹ، ہیگل، برگساں، متفکرین مشرق و مغرب غرض سبھوں کا مطالعہ کیا، ان پر غور و فکر کر کے ان کا نچوڑ اپنے کلام میں پیش کیا۔

اقبال حکیم تھے، مفکر تھے انہوں نے فلسفہ و حکمت پر نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مگر اپنے اشعار میں ایک پیغام پیش کیا۔ انہیں شاعر ملک، شاعر قوم، شاعر ملت اور شاعر مشرق قرار دیا گیا۔ کسی نے انہیں پاکستان کا شاعر اسلام بتایا تو دوسروں نے انہیں ہندوستان کا سیکولر شاعر ثابت کیا۔ میں یہ کہوں گا کہ اقبال کسی ملک، کسی قوم، کسی وقت اور کسی زمانے کے پابند نہیں تھے۔ بلکہ ان کا پیغام آفاقی اور ہمہ وقتی پیغام تھا۔ وہ بنی نوع انسان کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں

انسانِ کامل کو پیش کیا۔ اور یہ بتایا کہ یہ انسان پر ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل کیسے بن سکتا ہے اقبال کے کلام اور پیغام کے اِسی پہلو پر اس خطاب میں توجہ مبذول کروی جائیگی۔

حضرات! "شاعری جزویست از پیغمبری" اقبال اِسی کے قائل تھے وہ شعر کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے بلکہ ادب برائے زندگی ان کا ایقان تھا۔ انہوں نے شعر گوئی کے فن کا استعمال فرید کیا مگر اظہارِ خیال پر طرزِ ادا کو کبھی ترجیح نہ دی۔ انہوں نے اردو میں شاعری شروع کی لیکن بہت جلد محسوس کیا کہ ان کے پیغام کی آفاقیت اردو میں نہیں سما سکتی۔ اور جلد اِس نتیجہ پر پہنچے کہ

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

اپنے بیان کے لیے انہوں نے فارسی کو ترجیح دی۔ وہ فارسی کے اہلِ زبان نہ تھے اپنے فارسی داں اساتذہ سے فارسی سیکھی اور ذاتی مطالعہ سے مہارت پیدا کی۔ مگر فارسی میں مؤثر اظہارِ بیان کا حق ادا کر دیا۔

"اسرارِ خودی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست ÷ بت پرستی بت گری مقصود نیست
ہندیم از فارسی بیگانہ ام ÷ ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسنِ اندازِ بیاں از من مجو ÷ خوانسار و اصفہاں از من مجو

مگر انہوں نے اپنے پیغام کو تنگنائے اردو سے نکال کر فارسی کی وسعتوں میں پہنچا کر آفاق گیر بنا دیا اور پکار اُٹھے:

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے ÷ عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

اقبال پیغمبرِ حرکت و حرارت ہیں، اقبال کی شاعری کی عمر کم و بیش ہم برس ہے ان کی شاعری کے مختلف ادوار ہیں اِس دوران انہوں نے شاعری کا ساحرہ بھی

ا اور بیچبری بھی۔ اس اثنا میں ان کی جوئے سخن ہمارستانِ شباب سے گنگناتی ہوئی نکل اور صحرائے فلسفہ و حکمت کی وسعتوں کو ایک دریائے مواج کی صورت طے کرتی ہوئی بالآخر عرفان و ایقان کے بحر ناپیدا کنار سے جا ملی۔ لیکن اس تمام سفر میں حرکت اور حرارت برابر شامل اور نمایاں رہی۔ حرکت اور حرارت دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ زندگی کی یہ دونوں کیفیتیں بیک وقت ایک دوسرے کی خالق بھی ہیں اور مخلوق بھی۔ حرارت حرکت کو جنم دیتی ہے اور پھر خود اسکے ہم لیتی ہے۔ اقبال کے شعر میں بھی حرارت کی مختلف کیفیتوں کے ساتھ ساتھ حرکت کی مختلف صورتیں بھی ایک ساتھ ملتی ہیں۔ اقبال نے شعر عرب کی روایاتی تب و تاب اور حرکت کو شعرِ عجم کے سوز دروں اور حرارت میں سمو کر اس لطیف امتزاج سے زندگی میں ایک نئی روح پھونکی۔ اقبال کہتے ہیں۔

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اور : عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

زندگی نام ہے اِن عناصرِ دوگانہ کا جنہیں حرکت و حرارت کہتے ہیں۔ زندگی کے اِن عوامل کے مختلف تصورات کلامِ اقبال میں دیکھیے :

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی ✤ مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو ✤ منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ ✤ تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی
شاخ سے کیوں پھوٹا میں، شاخ سے کیوں ٹوٹا ✤ اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی
ساحل کے ماتم میں روتی ہے شبنم کی آنکھ ✤ دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ہے گریز پا مگر ہنگامۂ عالم گرم ÷ سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی
اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو ÷ خاموشی و دلسوزی، سرمستی و رعنائی

اِس عالم امکاں میں موت کا مقام ہی ایسا ہے جہاں پہنچ کر انسان بے بس و مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اقبال یہاں بھی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے وہ اپنے معرکۃ الآرا مرثیہ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں اپنی ماں کے مرقد پر سرنگوں نہیں ہوتے اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے بلکہ خود زندگی کی نمود و درخشانی کا پیغام یاد دلاتے ہیں، حرکت و حرارت کی موجودگی ملاحظہ کیجئے:

تخم گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے ÷ کس قدر نشوونما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے ÷ خود نمائی، خود فزائی کے لئے مجبور ہے
سردی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں ÷ خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ ÷ موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے ÷ خواب کے پردہ میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز میں کچھ ڈر نہیں ÷ موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر نہیں

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

اور کہتے ہیں:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی
تڑپ صحن چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

مزید کہتے ہیں:

نوا پیدا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اور فرماتے ہیں۔

جوانوں کو سوزِ نظر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے
دما دم رواں ہے یمِ زندگی　　ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند　　سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
الجھ کر تڑپنے میں لذت اسے　　تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

اقبال کا انسان کامل دردِ عشق سے آشنا ہو کر اپنے سوزِ دل کی قوت سے عالی ہمتی سے متصف ہوتا ہے اور کامیابی و کامرانی کے اعلیٰ منازل طے کرتا ہے۔

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آ گیا تو یہی آسماں زمیں

زندگی کی حرکت پسندی کے بارے میں فرماتے ہیں

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتی تھی مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

اقبال کا مخاطب ہمیشہ نوجوان اور مرد نوجوان رہا ہے نوجوانوں میں وہ بلند نظری اور عالی حوصلگی پیدا کرنا چاہتے ہیں "انہیں سخت کوشی اور بلند ہمتی سے آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ معرفتِ نفس اور احساسِ برتری سے روشناس کرانا چاہتے

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو منزل اپنی آسمانوں میں

اور اس کی کیفیات کچھ اس طرح ہوتی ہیں

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ
اور جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اور اس طرح وہ کائنات کا مرکز قرار پاتا ہے اور وہ مقام حاصل کرتا ہے کہ

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے ؛ جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز ؛ یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

اقبال اپنے نوجوان میں اس کی خودی کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں" تاکہ انسانِ کامل بن جائے۔ اقبال کی فکر کا مرکزی نقطہ خودی ہے۔ اقبال نے

اپنے خطبات میں خودی کے بارے میں بڑے عالمانہ انداز میں بحث کی ہے
اقبال کے نزدیک خودی سب کچھ ہے۔ خودی خود حیات ہے، عشق ہے،
ذوقِ تسخیر ہے، خود آگاہی ہے۔ ذوقِ طلب ہے، سرچشمۂ جدت و ندرت
ہے، یقین کی گہرائی ہے۔ سوزِ حیات کا سرچشمہ اور ذوقِ تخلیق کا مآخذ ہے
اقبال نے اپنے تصورِ خودی کو اپنے اشعار میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے
کہتے ہیں: نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است

زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

خودی ایک نور ہے جس سے انسان میں شعور و آگہی کی شمع روشن ہوتی ہے
توکہ از نورِ خودی تابندہ ؟ گر خودی محکم کنی پائندہ ؟
یہ نورِ خودی نہ صرف انسان کی ذات بلکہ اس کی صفات کا بھی خالق ہے

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پروین سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات

اقبال کے نزدیک خودی ہی کا کرشمہ ہے کہ وجود یا کائنات کی نمود یا جلوہ گری
ملتا ہے۔

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اقبال کے مطابق خودی میں آرزو کا خمیر ہے اور آرزو انہماک حیات
ہے اور مقصدیت ہے کہتے ہیں۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است ‏ ‏ اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار ‏ ‏ تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

آرزو ہنگامہ آرائے خودی ‏ ‏ موجِ بے تابے ز دریائے خودی

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم ‏ ‏ از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اقبال آزادیٔ فن کے حامی ہیں اور تقلید کے زبردست مخالف تقلید کو مرگِ تخیل سمجھتے ہیں۔

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

آئینۂ فطرت میں اپنی خودی کو دکھانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ فن فطرت کا آئینہ نہیں بلکہ فن کار کی شخصیت کا اظہار ہونا چاہیئے۔

چنانچہ کہتے ہیں:

فطرت کو خرد کے روبرو کر ‏ ‏ تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت ‏ ‏ جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

فطرت کی تکمیل سے یہ تخیل بھی مصلحت پر مبنی ہے۔ اقبال اس سے بھی آگے بڑھتے اور کہتے ہیں

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و گلزار و باغ آفریدم
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اسی طرح جب اقبال کی فطرت پرستی فطرت نگاری سے آگے بڑھ کر فطرت کی تکمیل و فطرت کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور یزداں بہ کمند آور اسے ہمت مردانہ کے مصداق اقبال کا انسان کامل جب اپنی فکر و نظر سے کام لیتا ہے۔ اور فن میں جدت فکر اور ندرت تخیل کے کمالات دکھاتا ہے تو خود فطرت بھی شرمندہ ہو جاتی ہے

دریا متلاطم ہوں تری موج گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجاز ہنر سے

اور

آں ہنر مندی کہ بر فطرت فزود
راز خود را بر نگاہ ما کشود
آفریند کائنات دیگرے
قلب را بخشد حیات دیگرے

یہ خود اعتمادی کا پیغام ہے وہ کہتے ہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

پریس انفارمیشن بیورو۔ گورنمنٹ آف انڈیا
(حیدرآباد)

عظیم رہنما
رفیع احمد قدوائی

مجاہدین آزادی کی ایک طویل فہرست ہے اور اس میں مختلف لوگوں نے مختلف
سے ملک کو غلامی کی زنجیر سے آزاد کرنے میں حصہ لیا ہے۔ اس فہرست میں چند ایسے نام بھی
نظر آتے ہیں جن کے خونِ جگر کا ذکر آزادی کی مختصر سی مختصر تاریخ میں بھی مل جائے گا۔ رفیع
قدوائی کا شمار مجاہدین آزادی کے اسی زمرے میں ہوتا ہے۔

رفیع احمد قدوائی ۱۸ فروری ۱۸۹۴ء کو بارہ بنکی کے ایک گاؤں مسولی میں پیدا
ہوئے۔ ان کے والد ایک متوسط زمیندار تھے۔ جو انگریزوں کی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے
پر فائز تھے اور انہیں خان صاحب کا خطاب عطا ہوا تھا لیکن رفیع صاحب بچپن
ہی سے اس طرح کے خطابات اور اس طرح کے عہدوں کو ناپسندیدہ نظروں سے [illegible]
دیکھتے تھے۔ دراصل اس نظام کی مخالفت کی ایک بنیادی وجہ [illegible]
تھی جس نظام سے اس طرح کے خطابات اور عہدے ملتے تھے۔ وہ نہایت خاموش،
سنجیدہ اور حلیم الطبع واقع ہوئے تھے۔ ذہانت اور فراست کی بدولت لوگ انہیں عزت
کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم حیات [illegible] اور [illegible]

کے پیلے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ جو اس وقت قوم ملت کے نونہالوں کی بیداری اور آبیاری کا ایک سرچشمہ تھا۔ اس مادر علمی کے بطن سے ایسے جیالے اور حوصلہ مند سپوتوں نے جنم لیا جنہوں نے اپنے مادر وطن کو آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر صرف علی برادران، حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام لینا کافی ہے۔

بیسویں صدی کا ربع اوّل عالمی سطح پر ایک ہنگامہ خیز اور انقلاب روس نے دنیا کو متاثر کیا تھا۔ غلام ملکوں میں اس عہد سے حریت کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ یوں تو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامیابی سے انگریزوں کی حکومت ہندوستان پر پوری طرح سے مسلط ہو گئی تھی۔ مگر ہمارے بیدار مغز اسلاف کبھی خاموش نہیں بیٹھے۔ کسی نہ کسی روپ میں اور کسی نہ کسی سطح پر عوامی بیداری کے لئے وہ سعی کرتے رہے۔

اس دوران مختلف جماعتیں اور مختلف تحریکیں عالم وجود میں آئیں جو حصول آزادی کی بنیاد بن گئیں۔ ایسے ماحول میں ہر حساس آدمی کے دل میں آزادی کے جذبے کا بیدار ہونا ایک فطری تقاضا تھا۔

رفیع احمد قدوائی ایک حساس طبیعت کے مالک تو تھے ہی، اس کے علاوہ ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں سیاست کی خوبو تھی۔ ان کے والد پہلے ہی گورنمنٹ کے غلام۔ مگر ان کے چچا ولدیت علی صاحب ایک ایسے رہنما تھے جن کے اثر و رسوخ اس عہد کی سیاست پر نمایاں تھا۔ علی برادران سے ان کے خوشگوار تعلقات تھے۔ ظاہر ہے ان کے کردار کی تعمیر و تشکیل میں ان سب کا گہرا اثر پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ رفیع صاحب جب علی گڑھ میں بی اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس وقت وہ سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔ مگر والد کے سمجھانے بجھانے پر ان کا دل رکھنے کے لیے مان گئے اور بی اے کی ڈگری حاصل کرلی۔ لیکن کانگریس کا جو جذبہ رفیع صاحب کے دل میں بیدار ہو چکا تھا۔ اسے زیادہ دنوں تک دبایا نہیں

جا سکتا تھا۔ اس وقت تو خاص طور سے زیر تعلیم نوجوان اس شعر کا مصداق بن
گئے تھے۔

جنونِ حبِ وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے، رہے نہ رہے

اور رفیع صاحب ایل ایل بی پاس کرنے سے پیشتر گاندھی جی کی تحریک عدم
تعاون میں شامل ہو کر تعلیم چھوڑ دی۔ اب وہ آزادی کے متوالے بن گئے تھے اور
حب وطن ان کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن گیا تھا۔ اسی دوران رولٹ ایکٹ
کے سلسلے میں ہنگامہ ہوا اور آزادی کی تحریک نے نیا موڑ لیا۔

رفیع صاحب، عدم تعاون کی تحریک کو اپنے قریب و جوار میں فعال اور
متحرک بنانے کی غرض سے جب اپنے آبائی وطن پہنچے تو ان کا بڑا خیر مقدم ہوا
اور چونکہ رفیع صاحب کی دیانتداری ایمانداری اور مخلصانہ جذبہ کا بڑا چرچا تھا۔
اس لیے ان کے اطراف کے لوگوں نے اپنے جانباز سپاہی کی صدا پر لبیک کہا۔

عدم تعاون کی تحریک میں پُر جوش حمایتی عوام کے جوش اور ولولہ کا یہ عالم تھا کہ
وہ ظالم پولیس کی لاٹھیاں کھاتے رہے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے
مگر رفیع صاحب کا ساتھ انہوں نے نہ چھوڑا۔ لوگوں نے انگریز حکومت کے خلاف
غم و غصے کے اظہار کے لئے بدیسی کپڑوں اور سامانوں کی ہولی جلائی جس میں ان کے
علاقے کے ساتھیوں نے اپنے قیمتی لباس کو نذر آتش کر دیا اور ان کے خاندان کے
لوگوں نے تو شادی کے لائے جوڑے کو سپرد آتش کرنے میں فخر محسوس کیا۔

عدم تعاون کی تحریک میں وہ اپنے گروہ کے لیڈر تھے۔ اس لئے وہ انگریزوں
کے عتاب کی زد میں آ گئے اور انہیں ایک سال قید محنت کی سزا بھگتنی پڑی۔ اس طرح
جیل ان کا دوسرا گھر بن گیا۔ انہوں نے حالات سے کچھ سمجھوتا نہیں کیا بلکہ وہ اپنے
وطن کی آزادی کے لیے ہمہ وقت اور مسلسل سرگرداں رہتے تھے۔ ایسے ہی آزادی

ضلع سپاہی کے لیے چکبست کا یہ شعر موزوں ہے۔

قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہو
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

تحریک خلافت اور کانگریس کے اتحاد نے جنگ آزادی میں ایک نئی روح پھونک
اور ہندو مسلم اتحاد نے حصول آزادی کو مزید مستحکم بنا دیا تھا۔ قدوائی
صاحب آنند بھون سے اسقدر قریب ہوئے کہ وہ نہرو خاندان کے ایک فرد بن
ے ان دنوں آنند بھون انقلابیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ملک کے مختلف گوشے سے
ی کی جدوجہد میں مصروف ہوئے۔ ایسے لوگوں میں رفیع صاحب کا نام نمایاں
۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے انہیں ایک منظم اور منتظم کی صلاحیت عطا کی تھی
ا لیے وہ پارٹی کو منظم اور متحد کرنے میں اپنی صلاحیت کو بروئے کار لاتے رہے۔
۱۹۲۶ء میں وہ سوراج پارٹی کے ٹکٹ پر سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے
گئے اور ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی پکار پر اس سے مستعفی ہو گئے۔ نمک ستیہ گرہ
موقع پر یو۔ پی کانگریس کی صدارتی تقریر میں جو کچھ فرمایا وہ ان کی موقف
نہ دیتی ہیں۔ ان کا دل حب وطن سے سرشار تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سیکولر
ن خیال اور نیشنلسٹ لیڈر تھے جو سرمایہ دارانہ نظام حیات کے سخت مخالف
۔ نہرو جی کی صحبت اور قربت نے ان کے ان خیالات کو جلا بخشی۔ اس سے رفیع صاحب
ت میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ملک کے مقبول ترین رہنما بن گئے۔ خاتمہ زمینداری کا
ہرا پنڈت گووند بلبھ پنت کے سر ہے اور اس مہم میں قدوائی صاحب نے
لے دست راست کی حیثیت سے کام کیا۔ لہذا ایسے ہی محب وطن اور ترقی پسند
ت کے رہنماؤں کی کوشش آزادی سے پیشتر زمینداری کو توڑنے کی اسکیم بن گئی
ر اس دور کے رہنماؤں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی تھی کہ مفلوک الحال
ن اور مزدور کی مساوات ہندوستان میں بغیر خاتمہ زمینداری کے ممکن نہیں تھا۔

روس کا کارنامہ بھی سب کے سامنے تھا۔ اس لیے روشن خیال رہنماؤں نے اس حقیقت حال سے اتفاق کیا۔ رفیع صاحب کا خیال تھا کہ عوام کے اصلی اور ازلی دشمن سرمایہ دار ہیں۔ اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں متحد ہو کر سرمایہ داروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا چاہیئے تھا نہ کہ مذہب کی بنیاد پر لڑنا چاہیئے۔
آزادی کے ۴۴ برسوں بعد بھی سماج اور معاشی مساوات کی جنگ آج بھی جاری ہے مگر ضرورت ہے رفیع صاحب جیسے روشن خیال دُور اندیش اور مخلص رہنما کی جس سے ہمارا ملک ترقی کے راستے پر گامزن رہے۔ انہوں نے جہاں کسان مزدور غریبوں کے متعلق غور و فکر کیا۔ وہاں عورتوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ عورتوں کی تعلیم میں دلچسپی ہی نہیں لیتے تھے بلکہ ان کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے اور سماجی و سیاسی معاملات میں وہ مردوں کے دوش بدوش چلتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ ماضی کی فرسودہ روایتیں جو عورتوں کی پاکیزگی اور پالیدگی حائل تھیں توڑنے کی بھرپور کوشش کی۔
جب ۱۹۴۶ء کے صوبائی الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کانگریس نے حکومت بنائی جو پنڈت پنت نے انہیں اپنی کابینہ میں شامل کیا۔ اس وقت ملک ایک طرف تو حصولِ آزادی سے قریب تر تھا اور دوسری طرف ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو دو قومی نظریے کا پرچار کر رہا تھا اس کی وجہ سے فرقہ وارانہ فضا قائم کرنے ہو گئی تھی۔ اس فضا کے خلاف رفیع صاحب نے جس طرح محاذ آرائی کی اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

تقسیم ملک اور ہجرت کے معاملے میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہمنوا تھے انہیں وطن سے از حد محبت تھی اس لئے تا حیات وہ ملک کی خدمت کرتے رہے انہوں نے مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کی تلقین کی جس سے جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔

محمد قمر الدین صابری
ایڈیٹر شاداب

سرسید اور ان کا پیام

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا ۔ یہ جنگ ناکام ہوگئی وہ "غدر" کہلائی ۔ اور مسلمانوں کے لیے عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ قوم نے انگریزی زباندان اور نئے علوم و فنون کی تعلیم کی طرف راغب ہو کے ترقی کی راہ اپنالی، مسلمانوں نے انگریزی سے احتراز کیا اور نئے علوم و فنون کی واقفیت میں پیچھے رہ گئے۔ سرسید احمد خاں نے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھا، تعلیم کی ضرورت کو پہچانا اور قوم کی اصلاح و ترقی کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ۱۸۴۷ء میں "آثار الصنادید" لکھی، "سرکشی بجنور"، "رسالہ اسباب بغاوت ہند" "قول متین در ابطال حرکت زمین"، "احکام طعام اہل کتاب"، "تسہیل فی جر الثقیل" اور "جام جم" وغیرہ کتب لکھیں۔

سرسید نے ۱۸۶۴ء میں "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی۔ جہاں مختلف موضوعات پر لکچرز کا انتظام ہوتا اور دوسری زبانوں خصوصاً انگریزی سے عصری علوم پر کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا اور ۱۸۶۶ء میں "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" جاری کیا گیا۔ یہ شروع میں ہفتہ وار تھا، بعد میں سہ روزہ ہو گیا، مگر اس میں روزنامہ کی پوری شان موجود تھی، اخبار سائنٹفک آپ نہایت عمدہ تھا، سرورق پر انگریزی میں

THE ALIGARH INSTITUTE GAZETTE

اور انگریزی میں " اخبار سائنٹفک سوسائٹی " لکھا جاتا تھا۔ ابتداً میں اخبار کا مالو
ERTY OF THE PRESS IS A PROMINENT DUTY OF
GOVERNMENT AND NATURAL RIGHT OF THE
UBJECTS

" آزادی چھاپے کی ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلی اور جبلی رعیت کا " جنوری ۱۸۶۶ء سے مالو میں اس طرح تبدیلی کی گئی :

PERMIT THE LIBERTY OF THE PRESS IS THE PART
A WISE GOVERNMENT. TO PRESERVE IT IS THE
ART OF FREE PEOPLE

" جائز رکھنا چھاپہ کی آزادی کا ہے کام ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا۔ "

مالو کا یہ اندراج اور تبدیلی سرسید کے صاحب بصیرت اور آزاد ذہن کو ہونے کی دلیل ہے۔ غلامی کے اس بدترین عہد میں آزادی صحافت کا اصول اپنی کی جرأت مردانہ کا کام تھا۔ SUBJECTS کی بجائے PEOPLE کے الفاظ کا استعمال ایک آزاد ، نڈر اور بے باک صحافی ہی کر سکتا ہے۔

سرسید نے گزٹ کے ذریعہ اردو صحافت کا معیار بلند کیا اور اسے معاصر صحافت کے شانہ بشانہ لاکھڑا کیا ۔ گزٹ کی ایک اہم خصوصیت اس کا وقت پر ہونا ہے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ گزٹ (۴۲) برس برابر جاری رہا اور اس میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا ہو۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شمالی ہند میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچہ کے اجرا سے شروع ہوتی ہے۔ سرسید نے گزٹ کو قوم کی اصلاح و

کے لیے استعمال کیا۔ سرسید کا نقطۂ نظریہ تھا کہ مسلمان جب تک جدید علوم وفنون نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ان کی حالت نہیں بدل سکتی اور جدید علوم وفنون سیکھنے کے لیے حکمرانوں کی زبان سیکھنا اور ان سے مصالحت کرنا ضروری ہے چنانچہ وہ ایک طرف تو مسلمانوں میں بالخصوص اور ہندوستانیوں میں بالعموم یہ احساس پیدا کرنا چاہتے تھے کہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھنا اور پورا کرنا ضروری ہے دوسری طرف وہ انگریزوں کو ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے مسائل اور اصلاحات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کو اسی مقصد کے لیے وقف رکھا، اس اخبار میں انگریزی اور اردو عبارتیں ساتھ ساتھ شائع ہوتی تھیں انہوں نے اس اخبار کو خبروں کی صحت کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں پہلے کوئی اردو اخبار نہیں پہنچا تھا، علاوہ ازیں انہوں نے اپنے مدلل، منطقی، عام فہم اداریوں، تبصروں اور مضامین سے اخبار کو مفید اور وقیع بنا دیا۔

گزٹ نے ہندوستانیوں اور حکومت وقت کے درمیان منافرت کے جذبات کو ختم کرنے اور باہمی معاملات کے لیے سازگار ماحول تیار کرنے میں بے مثال کام انجام دیا۔ سرسید، سرسید ایسے مسائل کو گزٹ کی انگریزی عبارت میں جگہ دیتے تھے جن سے انگریزوں کو واقف کروانا ضروری ہوتا تھا۔ نیز انہی مسائل کو اردو مضمون میں بھی بیان کیا جاتا تھا تاکہ غیر انگریزی داں عوام کو بھی اس کی اطلاع ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے خلاف لکھی گئی ان تصانیف کا جواب دیا جاتا تھا جن میں ہندوستانی مسلمانوں کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا اور ان کو بالکلیہ طور پر انگریزوں کا دشمن قرار دیا گیا تھا۔ انگریز مصنف ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کی تردید گزٹ میں کئی سال میں انگریزی اور اردو میں شائع کی گئی۔

گزٹ میں پہلی بار قارئین کو موضوعات کے تنوع سے آشنا کرایا گیا۔ اخبار میں موسم کے حال سے لے کر سیاسی، تمدنی نشیب و فراز کی خبریں شامل رہتی تھیں۔ تار برقی کی خبریں، مختلف واقعات اور بعد میں سررشتہ تعلیم کی خبریں بھی مستقل عنوانات کے تحت دی جاتی تھیں، اکثر تار برقی کی خبریں نمایاں چھاپی جاتی تھیں، کسی اہم واقعہ کے سلسلہ میں گزٹ کا ضمیمہ بھی شائع کیا جاتا تاکہ تازہ خبروں کے لیے اخباری ذوق رکھنے والوں کے ذوق کی تکمیل کا سامان کیا جاتا تھا۔ اس طرح اردو صحافت کے ایک معیاری نمونہ کے طور پر انگریزی صحافت کے شانہ بشانہ گزٹ کو لا کھڑا کیا، خبروں کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی، علمی اور اخلاقی موضوعات پر مضامین لکھ کر اور لکھوا کر شائع کیے۔ پہلے اردو اخباروں میں اداریہ نویسی کا رواج نہ تھا۔ کبھی کبھی خبر کے ساتھ ہی ایڈیٹر کے خیالات کا مختصر اظہار کر دیا جاتا تھا۔ گزٹ میں بالالتزام اداریوں کو شریک کیا جانے لگا۔ اور وقت کے لحاظ سے اہم معاملات پر اداریے لکھے جانے لگے۔

سلسلہ ملا

موقع ملا۔ اور کئی موقعوں پر میں نے دونوں کو ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے دیکھا۔ جو کچھ دیکھا اور سنا۔ ان کیفیات کو بیان کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ ایک مرتبہ۔ میں نے سرگوشی کرتے ہوئے زرین صاحب سے کہا زرین صاحب ادبی دنیا میں آپ نے فرحہ کے نام کو روشن کیا یا فریدہ کے نام کے ساتھ آپ کو شہرت ملی۔ تو جھٹ سے کہنے لگے۔ یہ بات ذرا آہستہ کہو۔ کہیں وہ سن نہ لیں۔ اور وہ فرمانے لگے۔ عارف صاحب: انہی کے تو چلائی اردوائی زندگی چل رہی ہے۔

مائل خیرآبادی

۲ دو دشمن

صلیبی جنگوں میں اپنے جنگی کارناموں کے اعتبار سے شیر دل شاہ رچرڈ (برطانیہ) وہ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ شیر دل رچرڈ کے متعلق سلطان صلاح الدین کا قوت بازو اور دست راست قاضی بہاالدین (جو کہ خود ایک بہترین جرنیل تھا) لکھتا ہے :-

"وہ بلا کا طاقتور، نہایت دلیر اور اولوالعزم۔ اس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ اس کی شجاعت مسلم تھی۔"

صلیبی جنگوں کا مشہور مورخ لیمب (جسے عیسائی دنیا کا ایک غیر متعصب مورخ سمجھا جاتا ہے) لکھتا ہے :-

"رچرڈ شیر دل جب صلیبی جنگ میں حصہ لینے آیا۔ اس وقت وہ 34 سال کا ریپد جوان تھا۔ وہ شاہی رعب و جلال کا پیکر تھا۔ اس کے مضبوط شانوں پر سنہری رنگ بال پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی پیشانی ہموار اور کشادہ تھی اور سیاہ آنکھوں کے میان کافی فاصلہ تھا۔ اس کی مختصر سی داڑھی فرانسیسی تراش کی تھی۔ اسے اپنی قوت پر بڑا ناز تھا۔ وہ کسی کمزوری کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ طبعاً فیاض تھا مگر بچوں کی طرح نمائش و نمود کا دلدادہ۔ اس کی پر جوش طبیعت گیتوں کے مقابلہ

اور عمدہ مناظروں میں تسکین ملتی۔ وہ تیغ زنی اور نیزہ بازی میں انتہائی لطف محسوس کرتا۔ وہ بربط بجانے کا بھی بہت شوقین تھا۔ وہ ہر کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور جنگ میں ہمیشہ سرداری کے فرائض سرانجام دیتا۔"

رچرڈ کے بارے میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی رائے یہ ہے:

"شاہ رچرڈ ایک بے بدل اور نڈر سپاہی تھا لیکن قائدانہ حیثیت سے سپہ سالار' اور یہی اس کی ناکامی کا سبب بنا۔"

سلطان صلاح الدین ایوبی کے متعلق لیب لکھتا ہے:۔ "بے شک سلطان ا شجاعت اور بہادری' اپنی سپہ گری و سالاری' عدل و انصاف' انسانیت' بے لوثی اور بے نفسی' اسلامی کردار اور دینداری' زہد و تقویٰ' محبت رسول صلعم راضی برضا رہے میں (صحابہ کے بعد) اپنی مثال آپ تھا۔" (۱) (حیرت ہے کہ محاربا کا ماہر مورخ لیب اس موقع پر خالد بن ولید' ابوعبیدہ بن جراح اور زید بن حارثہ اللہ تعالیٰ عنہم کے کارناموں کو بھول گیا۔ ہم نے بریکٹ میں (صحابہ کرام کے بعد) لکھ کر کردی۔) اس کے بعد ایک جگہ پھر سلطان کے بارے میں لکھتا ہے:

"جب پورا یورپ یعنی یورپ کی رعایا اور حکمران ناموس صلیب کے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر صلیبی جنگ کو کامیاب بنانے کے لیے اقدام کرنے میں معروف تھے حتیٰ کہ عورتوں نے اپنے زیور بیچ کر دے دیئے۔ بچوں اپنے کھلونے بیچ دیئے۔ اسکے ساتھ پہلی بار جب رچرڈ یروشلم بچاؤ کی آواز چیلا کر چڑھائی تاکہ متحدہ یورپ کی فوج اس کے ساتھ تھی۔ اس وقت کسی بھی مسلمان حکمران نے صلاح الدین ایوبی کو کسی قسم کی کمک نہیں دی تھی۔ وہ کردوں' عربوں اور ترکمانوں کو لے کر چالیس ہزار فوج سے رچرڈ کے مقابلہ ڈٹ گیا۔ اس نے بلاد اسلام کی حفاظت سلطان صلاح الدین ایوبی کا تنہا زندہ جاوید کارنامہ تھا۔"

پھر لکھتا ہے :-

" بلاشبہ صلاح الدین ایوبی اپنے دور کی عظیم شخصیت تھا۔ سلطان اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار تو تھا ہی، وہ عظیم انسان بھی تھا۔ سکندر اعظم، چنگیز خاں، تیمور، سلطان محمد فاتح، فریڈرک اعظم، نپولین، جنرل رومیل، جنرل ماشا شینا۔ جنرل آئزن ہاور، جنرل منٹگمری، مارشل ٹینکو اور زوکوف میں سے ہر ایک نے سلطان مرحوم سے بہت بڑے پیمانے پر بڑی بڑی جنگیں لڑیں، بے شک وہ بہترین سپہ سالار تھے لیکن ان میں سے اور دنیا کے دیگر سپہ سالاروں میں سے ماسوائے اسلامی قرون اولیٰ کوئی بھی سپہ سالار سلطان کی طرح انسان دوست اور صلح پرست نہ تھا۔ اس کی مثالی شرافت، علم بردباری کی گرد بھی کوئی نہ پا سکا۔ وہ سراپا نیکی اور شرافت کا پیکر تھا۔ یہ ایسی صفات تھیں جن سے رچرڈ جیسا خونخوار اور وحشی حکمران بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ قرون اولیٰ کے مجاہدوں کی طرح رات کا نمازی اور دن کا غازی تھا۔ متقی، پاکباز اور عابد و زاہد ہونے کے ساتھ ماہر سالار، جنگی فنون سے واقف بہادر اور بے خوف مرد میدان تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کا منتظم بھی تھا۔ اس نے بہت سے مدارس اور بیمارستان (اسپتال) قائم کئے۔ اس کی نجی محفلوں میں جید علماء شامل ہوتے تھے "

ہم نے لیب کے کروسیڈ (صلیبی جنگوں) سے اخذ کرکے ان دو باہم متصادم سپہ سالاروں کا تعارف لے کر اس لیے پیش کیا ہے کہ دنیا دیکھے، عالی دشمنوں کی زندگی میں کچھ ایسے مرحلے آتے ہیں جن سے انسانیت دوستی کا گہرا تعلق ہے۔ اس گہرے تعلق سے دونوں متاثر بھی ہوتے ہیں۔ ایسی منزلیں ان دونوں بہادروں کے درمیان بھی آئیں۔ انہی کو منظر عام پر لانے کے لیے ہم نے اوپر تعارف کی پیش کیا ہے۔ ان منزلوں پر آکر سلطان صلاح الدین ایوبی اور شیر دل رچرڈ میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

ملاحظہ ہو۔ جافا کی جنگ میں شیر دل رچرڈ ایسی بہادری اور بے جگری سے لڑا کر دشمن (سلطان اور اس کی مسلمان فوج کے بارے میں لیب ہر جگہ لفظ دشمن ہی استعمال کرتا ہے) کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ جس جگہ دشمن کا خیمہ نصب تھا وہاں رچرڈ کا خیمہ نصب ہو چکا تھا۔ مسلمان پیچھے ہٹ گئے۔ دھوپ سے سارا میدان چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے لڑائی کا ہنگامہ بند ہو گیا۔ فریقین دوبارہ صف بندی میں لگ گئے۔ ادھر سے ایک مسلح ترک سوار آیا۔ اس نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا اور اس کے بائیں ہاتھ میں دو عمدہ گھوڑوں کی لگامیں تھیں۔ گھوڑوں پر زینیں کسی ہوئی تھیں۔ اسے روک ٹوک کے بغیر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس نے بتایا ملک العادل (سلطان کے بھائی) نے یہ گھوڑے شاہ انگلستان کو بطور تحفہ بھیجے ہیں کیونکہ انہوں نے بادشاہ کو نکمے گھوڑے پر سوار دیکھا تھا۔"

سالاروں نے عرض کیا" جناب! ان گھوڑوں پر سوار نہ ہوں۔ یہ آپ کو لے کر واپس مسلمانوں کی طرف بھاگیں گے۔" سالاروں کی درخواست کے جواب میں رچرڈ کود کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور کہا: "آج اگر شیطان بھی اچھا گھوڑا بھیج دے تو میں سواری کروں گا۔" اسی نے حکم دیا کہ تمام مردوں کو دو پیلے کی تھیلی مہر کر دی جائے شاہ بڑے بلیغ جملے استعمال کرتا تھا۔ اس کے کہنے کا مقصد تو یہ تھا کہ یہ گھوڑے سلطان جیسے مخیر دشمن نے بھیجے ہیں۔ سلطان کی نیت صاف ہے۔ سلطان دیکھے اس گھوڑے پر سوار ہو کر تھوڑی ہی دیر میں اس سے دو دو ہاتھ کر رہا ہوں گا اور گھوڑا وفادار ثابت ہوگا۔ رچرڈ نے جافا کو بچا تو لیا لیکن اس جنگ میں حق رات اس نے جس دلیری سے جنگ کی تھی اس سے اسے تکان ہو گئی۔ وہ بیمار ہو گیا۔ سلطان کو جب اس کی بیماری کا حال معلوم ہوا تو سلطان نے حکیم کو دواؤں اور پھلوں کے ساتھ بھیجا۔ ہتھوں (ذکت الادمن) یا شائقین نے منع کیا کہ حکیم سے علاج نہ کرائے لیکن وہ [illegible]

مشہور ہے کہ ایک بہادر ہی دوسرے بہادر کو پہچانتا ہے۔ اس نے حکیم سے علاج کرایا۔ ذرا افاقہ ہوا تو اسے ٹکرلے گئے۔

دونوں دشمن ایک دوسرے کے معاملے میں اس قدر ستم ظریف واقع ہوئے تھے اس کی وجہ کوئی جان نہیں سکتا تھا۔ سلطان سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ رچرڈ جیسے بہادر سے لڑنے میں مزہ آتا ہے۔" اب رچرڈ کی ایک اور ستم ظریفی اور سلطان کی طرف سے اس کا جواب اور لیجئے قلم کی روانی ملاحظہ ہو:۔

عیسائی دنیا جسے رچرڈ شیر دل کہہ کر پکارتی اور فخر کرتی ہے اور جسے یورپی ملکوں نے اپنی افواج کی سربراہی کے لیے فلسطین کی جنگ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے سامنے لاکھڑا کیا تھا" اسی بادشاہ کا قاصد سلطان کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ شاہ رچرڈ کی طرف سے ایک ایسا پیغام لے کر آیا تھا، جس کے بارے میں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں کا بادشاہ اس کا "ہاں" میں جواب نہیں دے گا۔

سلطان نے رچرڈ کا پیغام پڑھا۔ قاصد پر ایک نگاہ ڈالی۔ اسے خلعت سے سرفراز کیا۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا اور پھر اس نے ایک نہایت شیریں اور نرم آواز کی۔

" آپ شاہ سے کہہ دیجئے کہ ہمیں ان کی درخواست منظور ہے۔ ہم ابھی اپنے فوجی سالاروں کو حکم بھجوائے دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ سات روز تک مکمل جنگ بندی کے عارضی معاہدے پر خود شاہ رچرڈ پوری طرح عمل کریں گے اور ان کی افواج بھی۔ آپ ہماری طرف سے شاہ کو مبارکباد بھی پیش کریں کہ وہ ایک اہم فریضے سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔

قاصد کا اضطراب دور ہو چکا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مسلمانوں کا سلطان اتنا فیاض بھی ہو گا۔ دل ہی دل میں وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ ایسی درخواست سلطان کی طرف سے شاہ کی خدمت میں پیش کی جاتی تو وہ حقارت سے ٹھکرا دیتا۔ بلکہ اسے

سارے دربار میں سناٹا اس کا مذاق اڑاتا سلطان نے شاہ کی درخواست قبول کر کے فیاضی کا ایسا ثبوت پیش کیا جس کا تصور بھی اس عیسائی دانشمند قاصد کے لئے محال تھا۔ شاہ رچرڈ اپنی بیٹی ماریہ کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ شادی کے جشن کے لیے اس نے عین اسی موقع پر سات روز کے لئے جنگ بندی کی درخواست کی تھی جبکہ یہ صلیبی جنگ پورے شباب پر تھی۔ شاہ کے علاقے میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں یہ بھی ایک ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ کل تک جو سلطان عیسائی فوجوں کے سپاہیوں سے برسر پیکار تھے وہ آج آپس میں مل بھی رہے تھے اور ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ان میں لڑائی ہوئی ہی نہیں۔ ایک دوسرے کو تحفے دیتے۔ ایک طرف سے اگر انگور، سیب، پستہ بادام کی پیٹیاں پیش کی جاتیں تو دوسری طرف سے اس کا جواب بھی خلوص کے ساتھ ملتا تھا۔ جبکہ سب جانتے تھے کہ ایک ہفتہ بعد پھر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں گے اور تلوار چلنی ہے۔

شاہ رچرڈ کی بیٹی شہزادی ماریہ کی شادی کا دن آ گیا پورے تزک و احتشام سے عیسائی طریقے کے مطابق شہزادی کی شادی ہوئی۔ رات کو شادی کی خوشی میں جشن کی تقریب منعقد ہونے والی تھی۔ اس میں سلطان کو شرکت کے لیے دعوت نامہ بھیجا تھا وہی عقلمند قاصد پھر سلطان کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس بار اسے یقین تھا کہ سلطان ایوبی شاہ رچرڈ کی دعوت ہرگز قبول نہ کرے گا۔ رچرڈ کا ذہین اور عاقل قاصد بڑے غور سے سلطان کے چہرے کے تاثرات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلطان نے دعوت نامہ پڑھا۔ ایک نظر اپنے درباریوں پر ڈالی۔ پھر قاصد کی طرف دیکھا اور کہنے لگے "میں شاہ رچرڈ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی مسرتوں میں شامل فرمایا۔ آپ شاہ کو میرا پیغام دیں کہ میں شادی کی تقریب میں ضرور شرکت کروں گا۔"

اس بار قاصد کو پہلے سے زیادہ حیرت تھی۔ وہ یہ پیغام لے کر سلطان سے

رخصت ہوا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ سلطان اپنا وعدہ ہرگز ایفا نہ کرے گا۔ کون ایسا عقلمند ہو سکتا ہے جو دشمنوں کی کچھار میں جانے کو آمادہ ہو۔ سلطان ضرور بعد میں کوئی عذر کر دے گا۔"

سلطان نے اپنے خیمے میں بڑے خشوع و خضوع سے عشاء کی نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلا۔ خادم اس کا خاص گھوڑا لیے کھڑا تھا۔ سلطان گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑا چل دیا۔ اس کے پیچھے دو گھوڑ سوار بھی تھے، جو شادی کے تحائف اٹھائے ہوئے تھے۔

"شاہ معظم! اب رات زیادہ ہو گئی ہے۔" ایک بڑے درباری نے شاہ رچرڈ کو مخاطب کر کے کہا "مسلمانوں کا بادشاہ اب نہیں آئے گا۔ اب کھانا ..."

"مجھے معلوم تھا، وہ نہیں آئے گا۔" شاہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے اسے مرعوب کرنے کے لیے جو انتظامات کیے تھے۔ وہ بیکار ہو گئے۔"

ٹھیک اسی لمحے حاجب نے اعلان کیا "مسلمانوں کے بادشاہ جناب سلطان صلاح الدین ایوبی تشریف لا رہے ہیں۔"

حیران حیران شاہ رچرڈ اور اس کے درباریوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اپنی حیرت اور گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے باہر کی طرف لپکا۔ اس کے درباری بھی استقبال کو اس کے پیچھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہ کی رہنمائی میں سلطان اپنے دو خدمت گزاروں کے ساتھ شامیانے میں داخل ہوا۔ سلطان نے بڑھ کر شہزادی کو تحائف پیش کیے۔ شہزادی بوکھلا گئی۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا "شکریہ!" اور کچھ نہ کہہ سکی۔ سلطان نے ایک نظر شہزادی پر ڈالی۔ دعا دے کر شاہ کی طرف مڑا۔ شاہ نے اس دن کی تقریب کے لیے جو شامیانہ سجوایا تھا اس سے شاہ کی

شاہ کی شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ عیسائی سردار جرنیل اور کمانڈرز
حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہے، جس سے کل لڑ رہے تھے۔ اور وہ نہایت
شان بے نیازی کے ساتھ ان کے درمیان بیٹھا شاہ کو مبارکباد پیش کر
سلطان کی یہ بے نیازی اور شاہانہ وقار رچرڈ نے دیکھا۔ اس نے سلطان سے
جناب نے اس تقریب سعید میں شرکت کر کے ہمیں ممنون فرمایا۔ آپ کے اس سلوک
سے متاثر ہو کر ایک مفید مشورہ دیتا ہوں، آپ اس جنگ سے دستبردار ہو جائیں۔

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ ساری دنیا کے عیسائی یروشلم کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے
ہوئے ہیں۔ ہماری افواج کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے یہاں سے مسلسل فوجیں رو
یورپ تک قطار در قطار کھڑی ہیں اور آپ کو کسی مسلمان حکمراں سے کوئی تعاون
نہیں ہے۔ آپ جیت نہیں سکتے، مسلمانوں کو بیکار کٹوانا عقلمندی نہیں ہے۔ آخر
سب کا خون آپ ہی کے سر تو رہے گا۔"

سلطان کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ اس مشورے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے
انہوں نے بڑے وقار سے جواب دیا "شاہ! یہ بحث اس وقت بیکار ہے۔ یہ خوشی کا موقع
فلسطین کا قضیہ میدان جنگ میں طے ہوگا۔ اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ اس
وقت ہم خوشی منا رہے ہیں۔ براہ کرم اس خوشی کی تقریب کو بے مزہ نہ کیجئے۔ شاہ
اس مسکت جواب کو سن کر موضوع بدل دیا۔ سلطان اس تقریب میں دو گھنٹے تشریف
فرما رہے۔ اس کے بعد اجازت چاہی۔ پھر شہزادی کی طرف دیکھا۔ دعا دی۔ اللہ
تیرے سہاگ کو قائم رکھے۔ تمہارے دولہا کو میدان جنگ میں میرا کوئی کوئی سپاہی
قتل نہ کرے گا۔ ہاں وہ گرفتار ہو سکتا ہے۔ میں اپنے لشکر میں جاتے ہی اس کا
اعلان کرا دوں گا۔ اس کے بعد دولہا کے پاس گئے۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا

باقی

اداریہ دعوت سہ روزہ
مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۹۵ء

نیویارک میں ایک مقدمہ کا فیصلہ

امریکہ کی وفاقی عدالت کی جیوری نے یکم اکتوبر کو اس مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا ہے جو مصری عالم دین شیخ عمر عبدالرحمٰن اور دیگر ۹ افراد کے خلاف گذشتہ ۹ ماہ سے جاری تھا۔ جیوری نے شیخ کو پانچ مختلف معاملات میں قصوروار قرار دیا ہے جن میں امریکی مملکت کے خلاف غدارانہ سازش کر کے دہشت گردی کی جنگ چھیڑنا اور مصری صدر حسنی مبارک قتل کرنے کی کوشش کرنا شامل ہے۔ استغاثہ نے شیخ کو نیویارک کے ٹریڈ سنٹر میں فروری ۱۹۹۳ء میں ہونے والے بم دھماکے کے علاوہ اقوام متحدہ کی عمارت نیز ایک بڑی سرنگ اور ایک بڑے پل کو بم سے اڑا دینے کی سازش تیار کرنے کے الزام میں ماخوذ کیا تھا۔ جیوری نے ٹریڈ سنٹر کے واقعہ میں ملوث ہونے کے مبینہ جرم میں چار افراد کو عمر قید کی سزا سنائی۔ لیکن کسی کو خاص مجرم قرار نہیں دیا۔ استغاثہ کا کہنا تھا کہ نیویارک دھماکہ امریکہ کی مشرق وسطیٰ سے متعلق اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا۔ شیخ کے ایک ساتھی السید نوسائر کو کسی یہودی ربی کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کا قصوروار ٹھہرایا ہے۔ شیخ اور ان کے ساتھی عدالتی کارروائی کے دوران ان تمام الزامات سے انکار کرتے رہے۔ جیوری کے اس فیصلے کے بعد شیخ اور دیگر لوگوں کو عمر قید کی سزا ہو سکتی ہے جن کے وکیلوں نے اپیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس سے پہلے کہ شیخ عمر عبدالرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کے خلاف سنائے جانے والے
اس فیصلے کے محرکات کا جائزہ لیا جائے، پہلے یہ دیکھیں کہ مقدمہ کی تحقیقات اور عدالتی
کارروائی کس طرح چلائی گئی۔ استغاثہ کا سب سے بڑا سہارا عماد سالم نامی ایک مصری تھا
جو سرکاری جاسوس تھا وہ شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا تھا اور ان کے بارے
میں پولیس کو اطلاعات فراہم کیا کرتا تھا۔ اسی نے جیوری کو بتایا کہ شیخ نے فیڈرل بلڈنگ کے ٹریڈ
اور دیگر اہم عمارتوں کو اڑانے کی سازش تیار کی تھی۔ جیوری کے ممبران میں کوئی ایک بھی
مسلم جج یا کوئی ایسا جج شامل نہیں تھا جس نے ملزمین، عماد کا اظہار کیا ہو۔ اطلا
کے مطابق جس طرح پولیس کی "تحقیقی" کارروائی ایک خاص انداز میں اور یکطرفہ
چلتی رہی بالکل اسی طرح جیوری کا انداز سماعت بھی یکطرفہ رہا۔ استغاثہ کی باتیں توجہ
سے سنی گئیں، ملزمین کی باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا جس سے ایک عام امریکی بھی ا
کر سکتا تھا کہ فیصلہ کیا ہو گا۔ اتفاق سے اس کے تیسرے دن ۳ اکتوبر کو ایک ا
سنسنی خیز مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا۔ لاس اینجلس کی اعلیٰ عدالت کی جیوری نے فٹ بال
کے مشہور کھلاڑی او جے سمسن کو اپنی بیوی اور اس کے دوست کے قتل کے الزام
سے بری کر دیا۔ یہ مقدمہ بھی نو ماہ چلا۔ سماعت کے لیے جو بارہ نفری جیوری تشکیل دی
گئی تھی اس کے ۹ جج سیاہ فام تھے دو سفید فام اور ایک اسپینی تھا۔ اور یہ نسلی
علاحدہ اس لیے رکھا گیا تھا کہ عدالت پر سیاہ فاموں کے ساتھ امتیازی سلوک کا ا
نہ آسکے۔ کیونکہ سمسن سیاہ فام اور دونوں مقتول سفید فام باشندے تھے جانبدار فیصلے کے
امریکی انتظامیہ کی غیر جانبداری اور جیوری کے انصاف کی تعریف کی جا رہی ہے۔ (ا
فرانس پریس کے مطابق شیخ کے مقدمہ کی کارروائی کے دوران جو ویڈیو دکھائے گئے
ان کے مناظر میں بار بار ٹریڈ سنٹر کے واقعات اور ان کے پس منظر میں شیخ کی تص
دکھائی گئی اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ سیاہ چشمے والا یہی شخص ان واقعا

کے پیچھے ہے۔ غدارانہ سازش کا الزام جس قانون کے تحت عاید کیا گیا تھا وہ امریکا کا ایک فرسودہ قانون ہے، اور موجودہ خانہ جنگی کی باقیات میں سے ہے جس کا استعمال شاذونادر ہی ہوا ہے۔ شیخ کی ایک وکیل مس لینی اسٹیوارٹ نے جیوری کا فیصلہ سن کر برجستہ کہا کہ "جیوری نے صرف "دہشت گردی" پر توجہ مرکوز رکھی تھی اور شہادتوں سے اسے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔"

ایجنسیوں کا ایک ڈرامہ ہی ہے۔ واضح ہو جاتا ہے کہ مقدمہ کی کاروائی بالکل یکطرفہ تھی اور پہلے سے کچھ مفروضات کو ذہن میں رکھ کر فیصلہ صادر کیا گیا ہے۔ اب اس حقیقت کو دہرانے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہ جاتی کہ سرد جنگ کے بعد امریکی حکومت نے اسلام اور بالخصوص مسلمانوں کے خلاف کردار کشی کی جو مہم چھیڑ رکھی ہے، شیخ عمر عبدالرحمن اور دیگر افراد کے خلاف سنایا جانے والا یہ فیصلہ اسی مہم کی ایک کڑی ہے۔ چنانچہ فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکہ کے کئی سرکردہ مسلمانوں نے بھی اعلان ظاہر کیا ہے کہ یہ فیصلہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش کا حصہ ہے۔

اپنے خلاف فیصلہ پر شیخ عمر عبدالرحمن نے جو کچھ کہا وہ راہ حق کے ہر مسافر کو بغور سننا چاہئے "ہم نے حق کا جو راستہ اپنے لیے منتخب کیا ہے اس میں یہ مراحل آتے ہی ہیں۔ جس نے بھی اپنی زندگی میں یہ راستہ اپنایا ہے اسے اس صورت حال کو سکون اور دلجمعی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ آپ انسانوں کو قید کر سکتے ہیں ان کے خیالات کو قید نہیں کر سکتے۔ ہم خدا کی بندگی پر قائم رہیں اور قائم رہیں گے۔ اپنے ایمان و عقیدہ کی خاطر جیل جانے والا میں پہلا شخص نہیں ہوں اور آخری بھی ثابت نہیں ہوں گا۔"

فیصلہ کے خلاف کی جانے والی اپیل کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے، یہ تو بعد میں معلوم ہوگا البتہ یہ بات طے ہے کہ ایک ممتاز اسلامی رہنما کا ... [illegible]

مولانا محمد تقی عثمانی

خشکی پر جہاز چلانے کا واقعہ

پچھلے ہفتہ برطانیہ سے واپسی پر مجھے تین دن ترکی کے تاریخی شہر استنبول میں گذارنے کا موقع ملا، دو مرتبہ پہلے بھی استنبول جا چکا ہوں۔ پہلے سفر کا تفصیلی تذکرہ میری کتاب "جہاں دیدہ" میں شائع ہو چکا ہے اور پچھلے سال دوسرے سفر سے واپسی پر ایک مختصر تذکرہ جنگ کے انہیں کالموں میں لکھ چکا ہوں لیکن اس مرتبہ وہاں کے سیاسی اور دینی حالات کے بارے میں کچھ نئی معلومات حاصل ہوئیں دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کروں لیکن ان معلومات سے پہلے استنبول کی تاریخ کا تھوڑا سا تعارف ضروری ہے تاکہ تمام باتیں اپنے صحیح پس منظر میں سمجھی جا سکیں۔

استنبول دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے جس کے نام بھی مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں مسلمانوں کی تاریخی کتابوں میں یہ قسطنطنیہ کے نام سے زیادہ مشہور ہوا ہے اس شہر کا یہ نام تیسری صدی عیسوی سے چلا آتا ہے اور رومی بادشاہ قسطنطین کی طرف منسوب ہے مسلمانوں کے زیر نگیں آنے کے بعد بھی اس کا سرکاری نام قسطنطنیہ ہی رہا لیکن جب خلافت عثمانیہ ختم ہوئی تو ۱۹۲۴ء میں اس کا باقاعدہ نام استنبول رکھ دیا گیا۔ اور اب اسی نام سے مشہور ہے قسطنطنیہ۔ یا موجودہ استانبول اپنے محل وقوع

اور جہاں تک تاریخ کے لحاظ سے دنیا کا منفرد شہر ہے یہ وہ واحد شہر ہے جس کا نصف حصہ
یورپ میں اور نصف حصہ ایشیا میں ہے۔ دونوں حصوں کے درمیان آبنائے باسفورس
بہتی ہے جس کا ایک سرا بحر اسود اور دوسرا بحیرہ مرمرہ سے ملتا ہے۔ یہ شہر گیارہ سو سال
تک سلطنت روما کا پایہ تخت رہا ہے جو کبھی دنیا کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی اور اس کی تہذیب
دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ عیسائیوں کی مشرقی کلیسا کا مرکزی شہر بھی یہی تھا جس کے
سربراہ کو بطریرک کہا جاتا تھا اور اس طرح یہ بیک وقت بازنطینی سلطنت اور
عیسائی مذہب دونوں کا اہم ترین مرکز بن گیا۔ بازنطینی بادشاہ قیصر کہلاتے تھے اور آدھی
سے زائد دنیا پر بڑی آن بان سے حکومت کرتے تھے حجاز میں طلوع اسلام کے بعد جب
اسلامی تہذیب دنیا میں ابھرنی شروع ہوئی تو رومی سلطنت اسے اپنے لئے ایک
بڑا خطرہ سمجھ کر اس کے مد مقابل آ گئی۔ اور تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں
مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان زبردست معرکے پیش آئے جس کی بنیادی منصوبہ بندی
قسطنطنیہ سے ہی کی جاتی تھی۔ اور اس شہر کی یہی وہ اہمیت تھی جس کی بنا پر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہر پر پہلا جہاد کرنے والے لشکر کو مغفرت کی بشارت دی
تھی (بخاری ۲۷۹۹) نیز قسطنطنیہ فتح کرنے والے امیر کو "بہترین امیر" اور لشکر کو بہترین لشکر
قرار دیا تھا۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۳۳۵)

چنانچہ مسلمان خلفا ہر دور میں یہ کوشش کرتے رہے کہ قسطنطنیہ فتح کرنے کی
سعادت انہیں حاصل ہو۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت کا مصداق
بن سکیں۔ لیکن قسطنطنیہ کے گرد سمندری خلیجوں نے حصار سا قائم کیا ہوا ہے۔ دوسرے یہ
پہاڑی علاقہ ہے۔ جس میں سردیوں کا موسم عربوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا
تیسرے اس شہر کے گرد یکے بعد دیگرے تین فصیلیں تھیں اور دو فصیلوں کے درمیان سو فٹ
گہری اور ساٹھ فٹ چوڑی خندق بنی ہوتی تھی اسی لئے اسے دنیا کا سب سے مستحکم

اور ناقابلِ تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ اس شہر کو جو سیاسی اور مذہبی مرکزیت حاصل تھی اُس کی وجہ سے اس پر آنچ آتی دیکھ کر پوری عیسائی دنیا اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو جاتی تھی، ان وجوہ سے مسلمانوں کے بیشتر محاصرے شہر کو فتح نہ کر سکے۔

بالآخر اللہ تعالیٰ نے فتح قسطنطنیہ کی سعادت خاندان آلِ عثمان کے ساتویں سلطان خلیفہ سلطان محمد فاتح کی قسمت میں لکھی تھی۔ اس وقت اکیس سالہ نوجوان نے خلافت کی باگ سنبھالنے کے بعد بڑی باریک بینی سے ان اسباب کا جائزہ لیا جو اب تک قسطنطنیہ کی فتح میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اور اپنے تدبر، بہادری اور اولوالعزمی کے ذریعہ جنگ کا ایسا نقشہ تیار کیا جو بالآخر فتح پر منتج ہوا۔

اہلِ قسطنطنیہ کو لڑائی کے وقت عموماً دوسرے اہلِ یورپ سے جو امداد ملتی تھی وہ بحرہ اسود سے آبنائے باسفورس میں داخل قسطنطنیہ پہونچتی تھی۔ لہٰذا قسطنطنیہ کو ان کے حلیفوں سے کاٹنے کے لیے باسفورس پر مکمل قبضہ ضروری تھا۔ اس غرض کے لیے یلدرم نے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر ایک قلعہ تعمیر کیا جو آج بھی اناطولی حصار کے نام سے مشہور ہے لیکن سلطان محمد فاتح نے محسوس کیا کہ صرف ایک کنارے پر یہ قلعہ باسفورس پر مکمل کنٹرول کے لیے کافی نہیں ہے لہٰذا اس نے اس قلعہ کے سامنے باسفورس کے یورپی ساحل پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کیا جو رومیلی حصار کہلاتا ہے۔

یہ قلعہ تین ہزار مربع میٹر کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور ستر ہ برجوں پر مشتمل ہے۔ بلند ترین برج کی اونچائی تقریباً نوے فیٹ ہے اور اس کی دیوار ۹ میٹر آثار کی ہے۔ لیکن جو بات محیرالعقول حد تک عجیب ہے وہ یہ ہے کہ یہ پورا قلعہ صرف چار مہینے چار دن میں تیار ہوا۔ اس کی تعمیر ۲۲ اپریل ۱۴۵۲ء کو شروع ہوئی تھی۔ اور ۱۸ اگست ۱۴۵۲ء کو مکمل ہو گئی۔ آج شاید ایسی عمارت کا صرف نقشہ بھی چار مہینے میں تیار نہ کیا جا سکے۔

بہرکیف! اس قلعے کی تعمیر کے بعد باسفورس سے گزرنے والا ہر جہاز عثمانیوں کی

دروازہ توپوں کی زد میں آ گیا۔ سلطان محمد فاتح نے توپ سازی کی صنعت کو بھی ترقی دی۔
اور پیتل کی ایک ایسی توپ تیار کی جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی توپ تھی۔
اس کے ذریعہ ڈھائی فٹ قطر کا آٹھ من وزنی گولا ایک میل تک پھینکا جا سکتا تھا۔
قسطنطنیہ چونکہ سمندروں سے گھرا ہوا ہے اس لیے محمد فاتح نے ایک طاقتور بحری بیڑہ
بھی تیار کیا جو ایک سو چالیس جہازوں پر مشتمل تھا۔ ان تیاریوں کے بعد سلطان محمد فاتح نے
قسطنطنیہ کا اس طرح محاصرہ کیا کہ بری فوج شہر کی مغربی فصیل کے سامنے پہنچ گئی اور
بحری بیڑہ آبنائے باسفورس میں پھیل گیا۔ قسطنطنیہ کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ
باسفورس کی ایک پتلی شاخ ایک سینگ کی شکل میں مغرب کی طرف جاتی ہے جو گولڈن
ہارن کہلاتی ہے۔ قسطنطنیہ کی بندرگاہ اسی گولڈن ہارن میں واقع تھی لہذا باسفورس
سے بندرگاہ یا شہر کی شمالی دیوار کے سامنے پہنچنے کے لیے گولڈن ہارن سے گزرنا
ضروری تھا لیکن بازنطینی فوج نے گولڈن ہارن کے اس دہانے پر جو باسفورس
سے متصل ہے لوہے کا ایک بڑا زنجیرہ باندھ دیا تھا جس کی وجہ سے کوئی جہاز باسفورس
سے گولڈن ہارن میں داخل نہیں ہو سکتا تھا لہذا محمد فاتح کے جہاز باسفورس میں محدود
ہو گئے تھے اور ان کے ذریعہ بندرگاہ کا محاصرہ ممکن نہیں رہا تھا۔ چنانچہ فصیل پر حملہ
صرف خشکی کے راستے سے ہو سکتا تھا۔ اور شہر نے سمندر کی سمت کو محفوظ سمجھ کر اپنی ساری
طاقت مغربی فصیل پر لگا دی تھی۔

سلطان محمد فاتح کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس کے کچھ جہاز آبنائے باسفورس
سے گولڈن ہارن میں داخل ہو جائیں تاکہ بندرگاہ کی سمت سے بھی شہر پر حملہ کیا جا سکے لیکن گولڈن
ہارن کے دہانے پر لوہے کا زنجیرہ بھی نصب تھا اور اس کے آس پاس [illegible] موجود تھیں اور
بڑے بڑے بازنطینی جہاز بھی گولڈن ہارن کے اندر سے زنجیرے کی مدافعت کے لیے کھڑے رہتے تھے۔ اس
اسی راستے سے کامیابی نہیں آتی تھی بہت دن گزر گئے لیکن گولڈن ہارن میں جا پہنچنے کی کوئی
تدبیر سمجھ میں نہ آ سکی

دعا اور عمل کا فرق

صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرق وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اس عہد کے مسیحی مفاد کی نمائندگی کرتا تھا۔ مشرق وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی اور دونوں کی متقابل حالت سے ان کی متضاد نوعیتیں آشکار ہو گئی تھیں۔ یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علم بردار تھا، مسلمان علم و دانش کے علمبردار تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا، مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا لیکن خدا کے پیدا کئے ہوئے سر و سامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی [illegible] معتقد تھا۔ دوسرا روحانی اور مادی دونوں کا۔ پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا۔ دوسرے نے نتائج عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے لیکن نتائج عمل نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا۔

ژوائن ویل کی سرگزشت میں بھی یہ متضاد تقابل ہر جگہ نمایاں ہے جب مصری فوج نے منجنیقوں (PETRARY) کے ذریعہ آگ کے بان پھینکنے شروع کئے تو فرانسیسی جن کے پاس پرانے وضع کے ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بالکل بے بس ہو گئے ژوائن ویل اس سلسلے میں لکھتا ہے۔

"ایک رات جب ہم ان برجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لئے

بنائی گئی تھیں پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن جیسے پٹری یعنی منجنیق کہتے ہیں لا کر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر میرے لارڈ والٹر نے جو ایک اچھا نائٹ تھا، ہمیں یوں مخاطب کیا۔ "اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آگیا ہے۔ کیونکہ اگر ہم نے ان برجیوں کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں نے ان میں آگ لگا دی تو ہم بھی برجیوں کے ساتھ جل کر خاک ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ہم برجیوں کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں، تو پھر ہماری بے عزتی میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ ہم ان کی حفاظت پر مامور کئے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں۔ جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ میرا مشورہ آپ سب لوگوں کو یہ ہے کہ جوں ہی مسلمان آگ کے بان چلائیں، ہمیں چاہیئے کہ گھٹنے کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔"

چنانچہ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کا پہلا بان چلا ہم گھٹنوں کے بل جھک گئے اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ بان اتنے بڑے ہوتے تھے جیسے شراب کے پیپے، اور آگ کا جو شعلہ ان سے نکلتا تھا، اس کی دم اتنی لمبی ہوتی تھی جیسے ایک بہت بڑا نیزہ۔ جب یہ آتا تو ایسی آواز نکلتی جیسے بادل گرج رہے ہوں اس کی شکل ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ایک آتشیں اژدہا ہوا میں اڑ رہا ہے اس کی روشنی نہایت تیز تھی۔ چھاؤنی کے تمام حصے اس طرح اجالے میں آجاتے جیسے دن نکل آیا ہو۔

اس کے بعد خود لوئس کی نسبت لکھتا ہے۔

ہر مرتبہ جب بان چھوٹنے کی آواز ہمارا ولی نعمت بادشاہ سنتا تھا تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا، مہربان مولیٰ! میرے آدمیوں کی حفاظت کر! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے بادشاہوں کی ان دعاؤں نے ہمیں ضرور فائدہ پہنچایا۔

لیکن فائدہ کا یہ یقین خوش اعتقادانہ وہم سے زیادہ نہ تھا، کیونکہ بالآخر

کوئی دعا بھی سودمند نہ ہوئی۔ اور آگ کے بالوں نے تمام برجوں کو جلا کر خاکستر کر
یہ حال تو تیرہویں صدی مسیحی کا تھا، لیکن چند صدیوں کے بعد جب پھر یورپ
مشرق کا مقابلہ ہوا تو اب صورت حال یکسر الٹ چکی تھی۔ اب دونوں جماعتوں
متضاد خصائص اسی طرح نمایاں رہے، جس طرح صلیبی جنگ کے عہد میں رہے
اتنی تبدیلی کے ساتھ کہ جو دماغی جگہ پہلے یورپ کی تھی، وہ اب مسلمانوں
ہو گئی تھی، اور جو جگہ مسلمانوں کی تھی اسے اب یورپ نے اختیار کر لیا تھا۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد
نے جامع ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔
علمائے ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم
کرنا چاہیے کہ انجاح مقاصد کے لئے تیر بہدف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔
ابھی صحیح بخاری کا ختم، ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا
کر دیا۔ شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی نے اس عہد کے چشم دید حالات قلمبند کئے ہیں،
ہی عبرت انگیز ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا
تھا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھو
ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں۔ ادھر لوگ ختم خو
کے حلقوں میں بیٹھے یا مقلب القلوب یا محول الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے۔
بالآخر وہی نتیجہ نکلا۔ جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ
دوسری طرف ختم خواجگان! دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انہیں ہی
جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترک عمل اور تعطل قویٰ کا حیلہ

مولانا ابوالکلام آزاد
(غبار خاطر)

اسلوب دعوت

آج ہم جس نازک دور سے گزر رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ کٹھن و سنگین مراحل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گزرنا پڑا تھا۔ اگر اس تیرہ و تاریک ماحول میں آپ صلعم نے دعوت و تبلیغ کے قافلۂ حق کی قیادت کا فریضہ بنفس نفیس انجام دیا تو آج قرآن و سنت قافلۂ سخت جاں کی قیادت و رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

ان مسلمات و حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے یہ لازم آتا ہے کہ ہم اپنے سارے معاملات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے تناظر میں دیکھیں۔ آپ نے نزول وحی سے قبل اپنی عمر مبارک کے چالیس سال ذاتی سیرت کی تشکیل میں صرف کئے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین تھے تو عوام الناس میں بحیثیت امین مشہور ہوئے اگر راست عہد تھے تو حجر اسود کے تنازعہ میں عدل و انصاف کی خاطر لوگوں نے آپ صلعم کی طرف رجوع کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس قضیہ میں ثالثی کا فریضہ سرانجام دیا۔

آپ نے مکہ کے اندر اخلاق حسنہ و فضائل عالیہ انسانی اقدار کا لوگوں کے سامنے ایک مثالی نمونہ پیش کیا، نزول وحی کے ساتھ ساتھ آپ نے دعوت الی اللہ کے کام کا آغاز کیا اور یہ مرحلہ تیرہ سال تک چلتا رہا اس درمیان آپ نے سارا زور جہد لوگوں کو الٰہ واحد کی طرف بلانے، اصنام پرستی کا قلع قمع کرنے اور اپنے رفقاء کار کو صبر و استقامت، ثابت قدمی و استقلال کی تعلیم دینے میں صرف کی، ایک مرتبہ

آل یاسر کے پاس سے گذر ہوتا ہے جبکہ وہ عذاب کی بھٹی میں جل رہے ہو
انہیں صبر کی تلقین فرماتے ہیں۔
آپ کی زندگی کا تیسرا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب آپؐ ا
پیارے وطن کو سے ہجرت کرکے مدینہ کا رُخ کرتے ہیں، یہ مرحلہ کوئی دس سالوں
اس درمیان آپ انصار و مہاجرین کے درمیان اخوت و مساوات، بھائی چارگ
کی تعلیم عام کرتے رہے۔ تکمیل قرآن سے قبل مدینہ میں قدم رکھتے ہی آپؐ نے ایک
تیار کیا جو مدینہ کے متحارب و مخالف دھڑوں کے درمیان ایک دستور کی حیثیت
تھا، اس دستور میں حقوق و احباب کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ جب ا
آیات نازل ہوئی تو آپؐ نے ظلم و طغیان کے خلاف اعلان جہاد کیا، باطل قوتو
خلاف نبرد آزما ہوئے۔
غرضیکہ آپ صلعم نے جامع اسلامی (strategy) تیار کی جو غزوات اا
حدیبیہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ آپؐ نے مدینہ کو اسلام کا آہنی قلعہ بنایا
سے دعوت الی اللہ کا چشمہ پھوٹتا رہا اور تشنگان حق سیراب ہوتے رہے۔ مکہ
اہل خاندان، خویش و اقارب کو دین کی دعوت دیتے رہے، لیکن سورہ ا
نزول کے بعد دعوت کا رُخ اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والی ساری
طرف منتقل ہو گیا صلح حدیبیہ اور یہودیوں کا قلعہ فتح کرنے کے بعد دعوت کا کام عالمگیر ہوا۔
، ہوتا ہے، چنانچہ آپؐ نے اپنے ہم عصر سربراہان مملکت کو خطوط بھیجے، کچھ نے آپؐ کی
لبیک کہا اور حلقہ بگوش اسلام ہوئے، بعضوں نے آپؐ کی دعوت کا انکار کیا آپؐ
رکاوٹ بنتے، جبکہ بعض دوسروں نے پس و پیش اور تردد سے کام لیا جیسے کہ قیصر روم
سورہ اعراف کی آیت (یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا) اور سورہ سبا
وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا جس سے دعوت کی عمومیت و
کو مزید تقویت ملتی ہے۔

(ذاکر الاعظمی۔ ریاض)

اپنے رب پر ایمان لاؤ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسولؐ کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلا وطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو اعلانیہ کرتے ہو، ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے وہ یقیناً راہِ راست سے بھٹک گیا۔ ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمہیں آزار دیں۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔

(سورہ الممتحنہ ۱ تا ۲)

محمد عارف الدین
خوشنویس ماہنامہ سب رس
مکان نمبر ۱۳۵ بستی پولیس لائن
پیٹلا برج حیدرآباد

دھرتی کے دکھ : تبصرہ

دھرتی کا دکھ فریدہ زین صاحبہ کے افسانوی مجموعہ کا نام ہے ۔ یہ ان کی چوتھی کتاب ہے ۔ دوسری اور تیسری کتاب ۔ دل سے دار تک اور لے گردش دوراں کو کتابت کرتے ہوئے پڑھ لیا تھا ۔ مگر دھرتی کے دکھ کو خرید کر پڑھنے کا اتفاق ہوا ۔ جب کوئی کتاب خرید کر پڑھتا ہے تو بہ نسبت مفت میں ملی ہوئی کتاب کے خرید کر کتاب پڑھنے کے تاثرات کچھ اور ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ۔

کئی مرتبہ زین العابدین صاحب نے بھی فریدہ زین کی کتابوں اور شخصیت پر تنقید و تبصرہ یا تاثرات لکھنے کیلئے کہا مگر ان کے حین حیات یہ موقع میسر نہ آسکا ۔ دھرتی کا دکھ زین صاحب کی جدائی کے بعد شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے اس کتاب کی افتتاحی تقریب میں بھی مدعو تھا جس میں حیدرآباد کے نامور ادیب و شاعر و نقاد و پروفیسرس کو فریدہ زین کی شخصیت اور فن پر دل کھول کر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے سنا ۔ جلسہ کے اختتام پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کے صدارتی ریمارک سن کر میرے اندر بھی زین صاحب کا ایک قرض ادا کرنے کا ارادہ ہوا ۔ کتاب کھول کر پڑھنے لگا تو پہلے صفحہ پر انتساب کے نیچے لکھا تھا : اس درد کے نام جو کائنات پہ محیط ہے ۔

پہلے مضمون جنبش لب پر نظر پڑی تو دوسری سطر پڑھ کر رک گیا ۔ جس کی ابتدا ۔

محسوس نے اس طرح کی ہے۔ " دنیا میں آتے ہی جنبش کی ابتدا آواز سے ہوتی۔ مضمون کا
پہلا لفظ دنیا۔ کتاب کا پہلا حرف دھرتی۔ ہر دو میں دال مشترک ہے۔ فوراً ذہن [illegible]
کا نام اور کتابوں کے نام اور فہرست مضامین کے عنوانات کو کریدنا شروع کیا تو معلوم
ہوا کہ ان کی شخصیت میں وہ تمام اجزا موجود ہیں جو ایک افسانہ میں ہونا چاہیئے۔ مثلاً
نام ہے فریدہ :
ف + ر + ی + د + ہ پانچ حرفی یہ لفظ مرکب ہے ان تمام اجزا کا جو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں
جیسے کہ ف سے فہم۔ فکر۔ فسانہ۔ فطرت۔ فریاد۔ فرض
ر سے رشتے۔ رسم و رواج۔ رخصت۔ رفاقت۔ راہی۔ رنج و راحت
ی سے یقین۔ یادیں۔ یاد الٰہی۔ یاد ماضی۔ یادگار۔ یادداشت۔ یاور۔ یلغار
د سے داستان۔ دامن۔ درد۔ داغ، دوستی، دشمنی۔ دکھ
ہ سے ہمت۔ ہوش۔ ہدایت ہمدردی۔ ہمراز۔ ہچکی۔ ہنسی۔ ہجرہ وغیرہ
حسن اتفاق ف + ر سے فریدہ زین۔ اور اسکول کا نام ہے فلاور [illegible]۔

مذکورہ تمام کیفیات جو ان میں پائی جاتی ہیں۔ اسی مناسبت سے ان کی کتابوں
کے مجموعوں اور عنوانات کے نام ہیں میرے خیال کی تصدیق کیلئے ایک بار پھر کتاب
کا سرورق بغور دیکھئے۔ نظر پڑتے ہی جو لفظ نمایاں نظر آئے گا اس میں بھی حرف
دال ہے، مثلاً۔ دھرتی کا دکھ، دھرتی سے دھواں۔ دادی ماں کا دعا کرنا۔
دونوں ہاتھ اٹھانا۔ دریا کی روانی۔ دریا پار کرنا۔ دائرے میں چاند اور ستارے
معرق داغدار جیسے باتوں کی عکاسی کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کی پشت ملاحظہ
ہو۔ حرف دال پر توجہ دیں۔ درد کی جتنی اقسام ہیں وہ سب ان کی کہانیوں میں ملیں گی۔
پہلی کتاب سسکتی چاندنی۔ دوسری کراہتے دلوں سے دار تک۔ تیسری کتاب ۔ اسے
گردشِ دوراں۔ چوتھی کتاب۔ دھرتی کا دکھ۔ زیر ترتیب کتاب تلاش آدم ۔ لا
ہر نام میں دال موجود۔

میں اپنے بیان کی تائید میں جناب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا مضمون پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا عنوان ہے فن اور مواد۔ ارتقا کی داستان ۔ فریدہ زین کی کہانیاں۔ کتاب کے صفحہ 160 پر وہ لکھتے ہیں۔

" فریدہ زین کی زندگی نے بہت کرب دیکھا۔ ابتدائی عمر میں ہی باپ کی رحلت دیکھی ماں کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹتی دیکھیں ۔ زندگی میں خلا پیدا ہوا محسوس ہوا ۔ اس تاریکی میں جو امید کی کرن پھوٹی وہ جس نے فریدہ کو حوصلہ دیا وہ زین العابدین سعید سے ازدواجی زندگی کے رشتے سے منسلک ہونے کی امید جسے والد کی جدائی کے کرب نے کچھ سلا دیا تھا اب زین العابدین کی مدد سے پھر جاگ اٹھا ۔ اور فریدہ توصرف لکھنے لگیں بلکہ خاندانی روایات کی بندشوں کو توڑ کر چھپنے بھی لگیں۔"

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ محترمہ کو فطرتاً درد سے خاص لگاؤ ہے۔ جب کبھی ذہن پر درد کا بوجھ بڑھ جاتا ہے تو اظہار کیلئے داستان کا سہارا لیتی ہیں ۔ جو کہانیوں کی شکل میں ڈھل جاتی ہیں تو الفاظ کے آبشار رواں دواں اور اچھے جملے ہاتھ باندھے اپنے انتخاب کیلئے منتظر نظر آتے ہیں ۔ ان کی اکثر کہانیاں T.V سیریل میں پیش ہونے کی قابل ہیں ۔ اور وہ وقت دور نہیں جب ان کی کہانیاں نام اور مقام کی تبدیلی کے ساتھ پیش ہوں گی۔ تب ہمیں پتہ بھی نہ چلے گا۔ اور ہم سب منہ تکتے رہ جائیں گے۔ محترمہ درد کے احساسات کو پیش کرنے میں کافی مہارت رکھتی ہیں۔ یوں بھی ہر عہد میں آدم تا ایں دم درد کا احساس مشترک رہا ہے ۔ اگرچہ کہ درد کی کیفیات مختلف ادوار میں مختلف رہی ہیں ۔ اولاد آدم میں ایک درد کا احساس ہی تو ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آرہا ہے کسی میں کچھ زیادہ اور کسی میں کچھ کم۔ اسی لیے جسم کے کسی حصے میں یا کسی عضو کو چوٹ لگے تو دوسرے تمام اعضاء اس درد میں برابر کے شریک ہوتے ہوئے پل پل کی خبر سے باخبر رکھتے ہیں۔ اسی طرح درد کے احساس کو کم کرنے کے لیے ایک دوسرے کے شریک ہو جاتے ہیں۔

کے معاملے میں انسان ایک دوسرے کے معاملے ہمدرد ہوتے ہیں، جو اپنے
پرائے ہر قسم کے دکھ درد کو جھیلتے ہوئے جیتا ہے۔

محترمہ نے کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے کہ " دنیا میں آتے ہی جنبش کی ابتدا
سے ہوتی اور آواز جو لبوں سے نکلی وہ سب کو یقین دلایا کہ ... کوئی آیا۔
مجھے ان کی اس بات سے کسی حد تک اختلاف ہے، وہ اس طرح کہ انہوں
ابتدا آواز کو کہا ہے اور میں نے درد کو ۔ دنیا میں آنے سے پہلے اور آتے
۔ اور آنے کے بعد انسان کو درد سے پالا پڑتا ہے ۔ جب یہی درد دردِ زہ میں
یل ہو کر ماں اور بچے میں رشتہ طے کرتا ہے تو آواز ایک دوسرے کے تعارف
لیے بنتی ہے ۔ اور اس تعارف کے بعد ماں کا تقدس اس کے قدموں کے نیچے
ما جاتی ہے اور بچے کی آواز بیچ و لپا۔ دودھ کی تشکیل کا سبب بنتی
ر بچے کیلئے آبِ حیات ہے ۔ اور جب ماں کا درد اور بچے کی آواز کم ہو گئی
ش لب ہی ممتا کو قریب کرتی چلی جاتی ہے ۔ کیونکہ درد جس شدت کا ہوگا
میں مٹھاس اور اخلاص اسی لحاظ سے بڑھتا رہے گا ۔ اور پروان چڑھے گا۔

میری نظر میں فریدہ زین صاحبہ اس لیے بھی قابلِ احترام ہیں کہ اور دین دار
گزارتی ہیں۔ اور بدحال لوگوں کے جذبات اور احساسات سمجھتے ہوئے
ا جنم دیتی ہیں۔ جو درد سے شروع ہوتی ہیں اور دکھ پر ختم ہوتی ہیں۔
ا بشاشت نہ ہونے کے باوجود ملاقاتیں اور افراد خاندان کی دلجوئی کی
مت اٹھا لینا پسند کرتی ہیں۔ چاہے طبیعت پر کتنا ہی جبر کرنا پڑے اور
دوسرے جو باتیں زین صاحب کی زندگی میں ناقابلِ برداشت تھیں۔ اب
زین صاحب کی جدائی کے بعد برداشت کر لینے کی عادت سی ہو گئی ہے بالفاظ دیگر
بے آتی ہیں ۔ اور چھاؤں دیتی ہیں۔

تمام تر مجھے زین صاحب کی زبانی ان کے اوصاف کے گن گاتے ہوئے سننے کا

باقی صـ ۲۲ پر

الحاج محمد عبدالعزیز عرفان
"بیت العزیز" ٹیکڑی پورہ
آکوٹ - ۴۴۴۱۰۱ ضلع آکولہ، مہاراشٹرا

آکوٹ کی ادبی خدمات

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ صوبۂ مہاراشٹر کا علاقہ ودربھ اُردو تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی تخلیقی و اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز بھی رہا ہے۔ خصوصاً برار کی زرخیز زمین سے ایسے بہت سے اہلِ قلم حضرات ابھر کر سامنے آئے ہیں جو اپنی علمی و ادبی جواہر کی ضیاء پاشیوں سے لگاتار اہلِ ذوق کو خیرہ بھی کرتے رہے ہیں اور متاثر بھی۔ اُردو ادب کی تخلیقی و اشاعتی سرگرمیوں کا ایسا ہی ایک مرکز شہر "آکوٹ" بھی ہے۔ جہاں کے باذوق اہلِ قلم حضرات اپنی پیہم کاوشوں سے اُردو ادب کو پروان چڑھانے میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اُردو ادب کی تخلیقی و اشاعتی سرگرمیاں کافی تیز ہوگئی ہیں۔ اسی ضمن میں اس مردم خیز خطّے کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

آکوٹ کے قدیم شعراء و ادباء کے بارے میں نہ تو روایتی ثبوت ملے ہیں اور نہ دستاویزی۔ قدیم شعراء میں سب سے پہلے جو شاعر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ ہیں جناب غلام یٰسین وجد۔ مرحوم کا زمانہ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۶۳ء تک رہا ہے مرحوم پیشۂ درس و تدریس سے منسلک تھے۔ اردو کی تمام اصناف پر انہیں عبور حاصل تھا۔ ان کا نمونۂ سلام ملاحظہ فرمائیں۔

تھا بو میں اگر دل ہے تو کیا آنکھ کرے گی!
ہم وہ نہیں بہہ جائیں جو جذبات کی رَو میں
ہر شعر کہاں شعر ہوا کرتا ہے اے رعد!!
اک آدھ نکل آتا ہے دس بیس میں سو میں

سیم شعراء میں محمد اسداللہ اسد، سید داؤد مقصود ہاشمی، شبیر احمد شباب
فضل نیاز، خواجہ شجاع الدین شجاع، مرحوم قادر عسلی اور شفیق آکوٹوی کے نام
بلِ ذکر ہیں۔ مرحوم خواجہ شجاع الدین شجاع معلم تھے۔ مزاحیہ کلام کہتے تھے۔ اور
بی رجحان رکھتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ مرحوم نے موثر اشعار کہے ہیں۔
یہ کلام کا مطلع ہے ؎

کاش اس دور میں ایسا یہ کرشمہ ہو جائے
مومن کا دل کعبہ اور آنکھ مدینہ ہو جائے

مرحوم قادر عسلی نثر نگار تھے۔ ان کی تحریر کردہ کتاب جغرافیہ مڈل اسکول کے
باب میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ مضامین بھی لکھتے تھے۔ جناب محمد اسداللہ اسد
اپنا انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ موصوف کا نظم کی طرف جھکاؤ زیادہ
ب سید داؤد مقصود ہاشمی نے بھی ادب کا آغاز زمانۂ طالب علمی سے کیا۔ شاعروں
، شریک ہوتے تھے۔ موصوف پیشۂ درس و تدریس سے منسلک تھے۔ ملازمت
سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ان کے کلام میں دینی و دنیاوی انقلابات کے اثرات پائے
ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

دیکھو کتنا عاسدوں سے چھپائے ہیں خنجر آستینوں میں
کر بھڑک رہی ہے آگ حسد کی ان کے سینوں میں
لگ کے آگ عداوت کی دیکھتے تماشا ہیں
یہی تو خصلتیں ہیں بڑی کم ظرف کمینوں میں

مرحوم شباب آکولوی جلد ہی اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم کو فکرِ معاش نے موقع عطا نہیں کیا۔ اسکی وجہ سے ان کے کلام میں مایوسی، درد اور تڑپ کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "تارِ گریباں" ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔ مرحوم بڑی مایوسی سے کہتے ہیں ؎

یہ کون روح میں نشتر چبھو رہا ہے شباب
اجل کی گود میں ہم کروٹیں بدلتے ہیں

مرحوم شباب آکولوی کے بعد چراغ جلانے کا سہرا نیاز آکولوی کے سر جاتا ہے۔ موصوف انتہائی ذی فہم اور بر بہہ گو شاعر ہیں۔ اپنے احباب کے ساتھ بزمِ شباب قائم کی اور اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ فلسفۂ زندگی کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

یوں تو نیاز زیست کا ہر لمحہ بار ہے
دو دن اگر تو اور بھی مشکل ہے زندگی!!

مرحوم ڈاکٹر خواجہ علی انجم علاقۂ برار کی معروف شخصیت تھے۔ مرحوم بی ایس کالج کھام گاؤں میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ نے نہیں پروفیسر شمیم کرہانی حیات، شخصیت اور شاعری" پر پی، ایچ، ڈی کا مقالہ سپردِ قلم کیا۔ مرحوم نثر نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ تحت میں پڑھتے تھے۔ جلد ہی داغِ مفارقت دے گئے۔

عبدالقدوس بقا درس و تدریس سے منسلک ہیں ۱۹۵۸ء سے ادبی زندگی کا آغاز کیا غزل اور نظم میں طبع آزمائی کرتے رہیں۔ ان کی تخلیقات اردو ٹائمز، بتول وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی مآل پر نظر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مل گیا خاک میں قطرے کی حقیقت کیا تھی
مل کے رہتا جو بقا آج وہ دریا ہوتا!

جناب پرواز رحمانی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ادارہ دعوت دہلی میں ملازم ہو گئے

الحال دعوت کے ایڈیٹر اور افکارِ ملی کے نائب مدیر ہیں۔ اصلاحی مضامین لکھتے
ہ۔ سہ روزہ دعوت میں مستقل کالم خبر و نظر لکھتے ہیں۔ شاعری میں قطعات و
باعیات، ان کی پسندیدہ اصناف ہیں۔ موصوف نے ۱۹۷۰ء میں انجمن تعمیر کردار
کی بنیاد ڈالی تھی اور ایک ماہنامہ "تعمیرِ کردار" جاری کیا تھا۔ ان کا ایک شعر
حظ فرمائیں ؎

سجا کر میری امیدوں کو زیرِ آسماں رکھدو
کوئی مسرت یہاں رکھدو کوئی حسرت وہاں رکھدو

افسانہ نگاری میں جناب مسعود علی جوہر کا نام سرفہرست ہے ان کا پہلا
سانہ ۱۹۶۱ء میں "برہی" شائع ہوا۔ اس کے بعد وفا کے نام پر، من پاپی، رہگذر
وہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ "درندہ" اور "ذہنیت کا سمندر" نامی ناول بھی لکھ چکے
۔ مختلف اخبارات و رسائل میں آپ کی تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔ اسی طرح
یر علی ناہدنے بھی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۱ء سے کیا۔ نثر میں کام کرتے ہیں۔
کے ادبی، سیاسی اور دینی مضامین ہوتے ہیں۔ کافی مضامین شائع ہو چکے ہیں
کل مختلف اخبارات کے لیے مضامین لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر علی شاد بھی
سانے اور کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات مختلف اخبارات میں شائع
ہ ہیں۔

صاحب کتاب شعراء و ادباء میں جناب ابراہیم خان شوق، جناب اقبال
ی اور ناچیز الحاج ڈاکٹر عبدالحفیظ عرفان کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ شوق
ی اردو جونیئر کالج آف سائنس اکوٹ میں بحیثیت لکچرار خدمات انجام
ے رہے ہیں۔ شعر گوئی کی طرف ان کا رجحان کم اور افسانہ نگاری سے زیادہ
ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "تم شوق سے کالج میں پڑھو"
ع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ موصوف کے مختلف اخبارات و رسائل میں مضامین اور

ہوگئے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اصلاحی تقاریر کے حامی ہیں۔
اقبال قلق ۱۹۶۵ء سے ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ خوش گو شاعر ہیں۔ ملک بھر کے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کا مجموعہ بعنوان "آثار" ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ معاشرہ کا برائیوں پر آپکی نظر ہے۔ جہیز کی لعنت کے تعلق سے فرماتے ہیں ؎

یہ سوچ کے گھلتی ہے مفلس کی جواں بیٹی
اک بوجھ ہے والد پر جب تک وہ کنواری ہے

اُردو کے متعلق قلق کہتے ہیں ؎

اُردو کی قلق کیسے حق تلفی گوارہ ہو
ہم جسم ہے اُردو کے وہ جان ہماری ہے

ناچیز الحاج ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "آنچل کے ستارے" ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ جو بچیوں کی علمی، ادبی اور ذہنی تربیت کیلیے مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دوسرا مجموعہ "روشن ستارے" ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ جو بچوں کیلیے ہے۔ تیسری تخلیق مختصر ڈراما "ایک خواب عام آدمی کا" ہے۔ جس میں تعلیمی اداروں میں پائی جانے والی برائیوں کے متعلق اشارے کیے گئے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں ناگپور یونیورسٹی نے "اُردو کا جمالیاتی ادب" کے موضوع پر مجھ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ فی الحال یہ مقالہ زیر طبع ہے۔ ویسے ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں ادبی، تاریخی اور تعلیمی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی شروع ہے۔ ان دنوں خواجہ یلیشن اُردو جونیئر کالج آکوٹ۔ میں بحیثیت لیکچرار خدمات انجام دے رہا ہوں۔
رفیق سراجی بھی صاحب کتاب ہیں۔ ان کا مجموعہ "طلوع سحر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو غزلوں، نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔

اِن کے علاوہ دوسرے شعراء میں جناب شہاب الدین ساحل اور رحمت اللہ رحمت
قابلِ ذکر ہیں۔ شہاب الدین ساحل کو شاعری اور افسانہ نویسی سے لگاؤ ہے
شاعری میں مذہبی اور اصلاحی رنگ غالب ہے۔ فرماتے ہیں ؎

روٹی کے لئے بکتی ہے مفلس کی جوانی
کہتے کو میری قوم میں زردار بہت ہیں

نوشعراء کے علاوہ ہزل گو شعراء میں رحمت اللہ رحمت کا نام سرِ فہرست ہے۔
رحمت تخلص استعمال کرتے ہیں تو کبھی بالغ۔ بالغ فرماتے ہیں ؎

ہیں یوں تو چوٹی یا امتحی ہی یہاں سب
اس شہر میں بالغ کو وہی کلدار سمجھنا

دوسری طرف فرماتے ہیں ؎

بیگم بھلا پکا کے کھلائے گی کیا تجھے
وہ خود منگا کے کھاتی ہے نبجے دکان سے

بس نوجوان شاعر سے سب کی امیدیں وابستہ ہیں وہ شاعر و ادیب ہے جناب
احمد واصف۔ درس و تدریس کے پیشہ سے منسلک ہیں۔ واصف کا حوصلہ بلند ہے
ہیں ؎

یہ تیرا پہلا سفر ہے، حوصلہ رکھ جلد ہی
راستوں کے پیچ و خم سے آشنا ہو جائے گا

مجھ پر میرے احباب ہی، تنقید کریں گے
دشمن، میرے احباب کی تقلید کریں گے

نوجوان شاعر کی تخلیقات بھی بہت سے اخبارات و رسائل میں شائع
اس کے علاوہ ادارہ ادبی سنگم کے تحت ماہانہ طرحی وغیر طرحی نشستوں اور
کا اہتمام کرتے ہیں ؎ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

جناب عاصی دینی اور اصلاحی شاعری کیا کرتے تھے۔ اس دنیا سے رخصت ہو گئے
لیکن ان کی آواز سنیئے ؎

ہم زیست میں سجاتے رہے محفلیں مگر
مرنے کے بعد برسوں کی تنہائیاں ملیں !!

کچھ شعراء حضرات کو وقت کی زنجیر نے قید کر رکھا ہے۔ اس کی غمازی نوجوان شاعر
میتق احمد شارق کی زبانی سنیئے ؎

لکھ دیا کاتب تقدیر نے تحریر میں
قید ہو کر رہ گئے ہم وقت کی زنجیر میں

ان کے علاوہ عبدالجبار شمش، عبدالحق وفا، رفیق خان عاصم، خواجہ نعیم الدین کوثر
عبدالوہاب آتش، محمد عادل راہی، انیس الدین راہی، عظیم اللہ وقار، ضمیر خان ندیم،
سلیم احمد سلیم، مشرخ مالوف عاقل، مشتاق احمد مشتاق کے نام لئے جاسکتے ہیں۔
ادب کی خدمت میں ان کا بھی حصہ ہے۔

مختصر یہ کہ آکوٹ گو اردو مراکز سے بہت دور ہے لیکن یہاں کی ادبی سرگرمیوں
کی چنگاریاں محفل ادب کو روشن کرتی رہتی ہیں۔ مشاعرے ہوتے ہیں۔ مذاکرے ہوتے
ہیں۔ نشستیں ہوتی ہیں۔ اس طرح الحمد اللہ ادب کا یہ قافلہ رواں دواں ہے۔

سلطان نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک بیج نکال کر دو لہا کے دائیں بازو پر لگا دیا۔
آخر میں سلطان نے شاہ رچرڈ کو سلام کیا اور اہل دربار کو ہاتھ اٹھا کر سلامتی کی دعا
دیتا ہوا سب کو حیران و ششدر چھوڑ کر اپنے خادموں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

سائیسوں کے خلاف ہونے والے اس فیصلہ کو اس پالیسی سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا
جاسکتا جو امریکی حکومت نے دین اسلام اور اسلامی تحریکوں کے تعلق سے اختیار کر
رکھی ہے۔

شاداب حیدرآباد

جلد: ۱۲
شمارہ: ۱۲
دسمبر: ۱۹۹۵ء

قیمت: ۶ روپے

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	منیجنگ ایڈیٹر
...رالدین صابری	رشید الدین	قدیر انصاری

مجلس مشاورت

...ہ عائشہ بیگم، ڈاکٹر نشاء الرحمن فراق نشاؤ، محترمہ سیدہ ہیرا، پروفیسر تراب مسلی
...یوسف الدین، محمد منظور احمد منظور، منیر احمد صدیقی

زرِ تعاون

	سالانہ	۲ سال	تاحیات
...ستان	۶۵ روپے	۱۲۰ روپے	۱۵۰۰ روپے
...ممالک	۲۰۰ "	۳۶۰ "	۳۲۰۰ "
	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
...ستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
...ان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ پاکستانی رو...

ترسیل زر کا پتہ :-

ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۰ ریڈ ہلز حیدرآباد

پرنٹر، پبلیشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے
نیز ... چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد
۱ ے-پی سے شائع کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

آدمی کی اصل قدر و قیمت

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين محمد وآله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين!

أما بعد!

میرے بھائیو اور عزیزو! میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ مجھے ایک بار پھر آپ
رزندوں سے، بھائیوں سے خطاب کرنے کا موقع ملا، میں جب یہاں آتا ہوں تو مجھے محسوس
یں ہوتا کہ میں کسی اجنبی جگہ گیا ہوں یا کسی دوسرے حلقۂ خیال اور مکتبِ فکر میں ہوں، بلکہ میں
تا ہوں کہ میں اپنے دارالعلوم ہی کے طلبہ سے خطاب کر رہا ہوں، وقت تھوڑا ہے باتیں کہنے
بہت ہیں، اور آپ کو سننے کا بھی موقع ملتا رہتا ہے، میں چھوٹا سا جملہ آپ کے سامنے عربی کا
کر تھوڑی سی اس پر روشنی ڈالوں گا، روشنی ڈالنا تو خیر بڑی چیز ہے آپ کو متوجہ کروں گا کہ
سے بھلے کلمات ماثورہ اور بہت سے وصایا، توجیہات اور تجربۂ زندگی کے جو کتابوں
بھرے پڑے ہیں، اور ان پر نظر پڑتی رہتی ہے، اور ان کو لوگ زبان سے بھی دہراتے

ہیں، تو پھر ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، ایک جملہ ہے، بہت ہی مختصر لیکن بہت پر
معانی ہے، اور بہت وسیع ہے، اور زندگی کے صرف ایک ہی موضوع پر وہ منطبق نہیں
بلکہ پوری زندگی پر منطبق ہوتا ہے "قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ" ہر شخص کی اصلی قدر و قیمت
یہ ہے کہ جس کام کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر جانتا اور کر سکتا ہو، اس وقت ہمارے
مدارس میں خدا کے فضل و کرم سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں نوجوان لاکھوں طلبہ تعلیم پا رہے ہیں
موجودہ نصاب پڑھایا جاتا ہے مفید نصاب ہے وہ تھوڑی ترمیم کے ساتھ اور تحفظ کے ساتھ
اور پڑھانے والے بھی خدا کے فضل سے ذی استعداد اور مخلص ہیں، لیکن جو امتیاز نہ
ہونا چاہیئے، کسی فن میں امتیاز خصوصی ہونا چاہیئے، جس سے اس کی طرف انگلیاں اٹھ
اور اشارے کئے جائیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی قدر ہو، اور اس کی طلب ہو، ا
اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری جد و جہد کی جائے اور وہ اپنے اپنے درجے اور ز
اور حالات کے مطابق ایک اچھے اور قابل ذکر حلقہ میں موثر طور سے کام کر سکے، اس
بڑا فقدان ہے، اور بہت دن سے یہ کمی محسوس کی جا رہی ہے، ہمارے علمی حلقوں میں، ت
حلقوں میں تصنیفی حلقوں میں اور تحقیقی حلقوں میں اور پھر تعلیم و تعلم کے حلقوں کا کیا ذکر
کہ سب کچھ پڑھا جاتا ہے، اور علم سے واقفیت پیدا کی جاتی ہے، لیکن وہ جس کو عر
زبان میں ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے ایک ڈگری ہوتی ہے، اس کی حرارت آ
برودت کا ایک ٹمپریچر ہوتا ہے ایک ڈگری ہوتی ہے۔ جو لفظ اردو میں عربی کے
ہیں ضروری نہیں کہ وہ عربی کے الفاظ کی طاقت کو پوری طرح منتقل کر سکیں، منتقل
تو ان سے تعلق رکھتا ہے، لیکن سمجھا سکے اس کو، اور خاص طور سے جو چیزیں ایک ز
سے منتقل ہو کر دوسری زبان میں رائج ہوتی ہیں اور زبان زد عوام و خواص ہو جاتی ہیں
سا تو درجہ حرارت اور درجہ برودت اور ان کی ڈگری جو ہے ان کا جو پرانا شے
نظر سے او جھل ہو جاتا ہے، تو عربی میں جب کسی چیز میں کہتے ہیں کہ اس میں درجہ کمال

سمجھا جائے اور اس میں امتیاز پیدا کیا جائے تو اس کے لیے عربی میں "الاحسان" کا لفظ
آتا ہے، یہاں تک کہ حدیث شریف میں بھی یہ لفظ بڑے خاص موقع پر آیا ہے۔ "ما الاحسان"
فرشتہ پوچھتا ہے کہ احسان کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دیتے ہیں کہ الاحسان ان
تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔

احسان کا لفظ اردو میں آ کر بہت ہی معمولی معنوں میں محدود ہو گیا ہے کہ احسان یہ ہے
کہ فقیر کو کچھ پیسے دے دیجئے، کسی کو کھانا کھلا دیجئے، کسی سے بات کر لیجئے، لیکن عربی میں
وہ اب بھی، جو لوگ عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں اور خدا کے فضل سے یہاں ایسے حضرات
موجود ہیں، میں نام نہیں لوں گا ان کے، وہ سمجھتے ہیں کہ عربی کا ایک سادہ لفظ جو ہے، جو زبان
زد عوام و خواص ہو گیا ہے وہ اپنے اندر اصل میں کیا طاقت رکھتا تھا، اور اہل زبان اس
سے سنتے سے کتنا متاثر ہوتے تھے اس لئے کہ لفظ میں بھی پارے کی طرح حرارت اور برودت
ہوتی ہے، جیسے آپ کسی چیز کو چھوئیں تو ایک درجہ کی حرارت ہو گی اور آپ کو محسوس
ہو گی۔ تھوڑی سی حرارت ہو گی تو آپ ہاتھ رکھ دیں گے لیکن اگر زیادہ ہو گی تو آپ ہاتھ
رکھ نہیں سکیں گے اور ہاتھ اٹھا لیں گے، تو بڑی مشکل پیش آ گئی ہے ایسی مشکل ہے کہ
اس کو مشکل کہنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ یہ تو فیضان بھی ہے اور احسان بھی ہے کہ عربی
کے الفاظ جو بہت طاقتور تھے وہ اردو میں عام استعمال ہونے لگے ہیں، اور انہوں نے اپنی
طاقت کھو دی اردو میں آ کر، انہیں میں ایک لفظ "الاحسان" ہے الاحسان کے معنی ہیں
کسی کام کو بہت بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دینا اور اس میں امتیاز پیدا کرنا۔ تو کہنے والے
نے یہ کہا "قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ" ہر شخص کی قیمت وہ ہے، اس کا درجہ اور اس کے
ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ اور اس کا معیار ہر شخص کا جو بلند معیار ہے وہ جس پر منحصر ہے وہ
موقوف ہے "ما یحسنہ" پر، تو انسان دوسروں کے مقابلہ میں دو چار کے مقابلہ میں
بعض مرتبہ بیس پچیس کے مقابلہ میں بعض مرتبہ سینکڑوں کے مقابلہ میں بعض مرتبہ ہزاروں

کے مقابلہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، اس چیز کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا
مدارس میں اس کی طرف سے توجہ ہٹتی چلی جا رہی ہے، یعنی اس کو عربی میں "مشارکت"
کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، ہم نے اپنے عرب اساتذہ اور ادیبوں
سے سنا ہے کہ "فلان مشارکۃ فی فلاں العین"۔ فلان مشارکۃ طیبۃ
هذا الفن" کسی چیز سے واقفیت رکھنا اور اس سے کام لے سکنا، اس سے فائدہ اٹھا
سکنا اس کو مشارکت کہتے ہیں، یہ بھی تعریفی لفظ ہے، عرب اہل زبان سے ہم نے سنا
فلان مشارکۃ فی کذا" لیکن ایک ہے مشارکت اور ایک ہے احسان، احسان یہ
دوسروں کے مقابلہ میں وہ جس کے مقابلہ میں سوچا اس کے مقابلہ میں بعض مرتبہ، وہ
نہیں ہے ایسے بہت سے لوگ گذرے ہیں جو لاکھوں کے مقابلہ میں وہ امتیاز
رکھتے تھے، مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں، اصحاب صحاح ہیں، امام بخاری ہیں،
ائمہ لغت ہیں، یا شارحین حدیث ہیں، اب آپ ایک "فتح الباری" کو لے لیجئے کہ کتنی
ہیں کس ملت میں بھی کسی مصنف کی کتاب اس طرح پیش نہیں کی جا سکتی جو یا
دائرۃ المعارف ہو، اور حاوی ہو، اور ایسے ہی "لسان العرب" کو لے لیجئے، ایک "قصیدہ
"قصیدہ بردہ" کو لے لیجئے اور ایسی ہی کتنی چیزیں ہیں کہ جو پورے اس موضوع پر وہ
امتیازی درجہ رکھتی ہیں، تو "الاحسان" کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو چند فنون پر عبور کا
اور آپ کی دسترس رہی ہو، اور لوگوں کو اس کے بارے میں نفع پہنچتا ہو، کھلا ہوا
پہنچتا ہو، اور افسوس ہے کہ یہ چیزیں بھی ہمارے تعلیمی حلقوں سے ختم ہوتی جا رہی ہیں
مشارکت ہے اس کا نام چلاؤ جس کو کہتے ہیں، اہل عرب کے محاورہ میں کام چلاؤ چیز تو
تو پڑھا لیں گے سمجھ بھی لیں گے، لیکن جس کو کہتے ہیں شان امتیازی اور کہتے ہیں شان
اجتہادی اور شان امتیاز سے بڑھ کر ایک شان ہے، شان اجتہادی اس میں
کو ایسا ملکہ ہو کہ جیسے طبیعیات، مذوقات اور ایسی چیزیں جو استنباط سے تعلق

ویسے ہی جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ ایک ہوتا ہے زبان کا ذوق اور ایک ہوتا ہے زبان کا ذائقہ۔ بعض لوگوں کو زبان کا ذوق ہوتا ہے اور ذائقہ نہیں ہوتا، اب میں اپنی زبان کے بارے میں کہتا ہوں۔ فخر کی بات نہیں ہے کہ میرے بڑے بھائی صاحب نے میرے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جن کے یہاں زبان ذوق کا درجہ نہیں ذائقہ کا درجہ رکھتی تھی، یعنی جب وہ اس لفظ کو کہتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان پر ایک کیفیت طاری ہو گئی، اور وہ کیفیت منتقل ہوتی دوسروں کی طرف یعنی وہ اپنے کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تھے جھومنے لگتے تھے اور کہتے تھے، کیا غضب کیا، کیا غضب کیا، کیا غضب کیا، ہمیں یاد ہے کہ ہم کراچی کسی میں تقریر کرنے گئے شعبہ عربی ادب میں، تو حسنِ اتفاق کہ اس شعبہ کی جو صدر تھیں وہ ہمارے استاذ کی صاحبزادی تھیں، شیخ خلیل بن محروب صاحب.. جن سے ہماری عربی کی اصل بنیاد اور عربی میں خدمت کرسکنے کی صلاحیت زیادہ تر ان ہی کی رہین منت ہے، ہم تقریر کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اس طرح ہمیں ہمارے استاذ نے عربی پڑھائی تو انہوں نے وہیں سے آواز دی کہ علی بھائی، والد صاحب کا کوئی پسندیدہ شعر سنایئے جس سے ان پر کیفیت طاری ہو جاتی ہو تو ہمیں یاد تھا کہ وہ بحتری کے بڑے قائل تھے، متنبی کے مقابلہ میں بحتری کو بہت ترجیح دیتے تھے، اور ہم نے یہ شعر پڑھے۔

بلونا ضرائب من قد نرى

فما إن رأينا لفتح ضريبا

هو المرء أبدت له الحادثا

ت عزما وشيكا ورأيا صليبا

فكالسيف إن جئته صارخا

وكالبحر إن جئته مستثيبا

تنقل في خلقي سودد

سماحا مرجى وبأسا مهيبا

ارے غضب! ارے غضب، ارے غضب کیا ارے ظالم،

ساحامرجی ویا سامہیا، ساحلمرجی ویا سامہیا ساحامرجی

ویا سامہیۃ ساحا کے لیے عربی کا لفظ لانا اور اس کے لیے عیب کا لفظ لانا، ایسے

ہوتے تھے کہ بعض مرتبہ باہر سے دیکھنے والا ڈر جاتا اور بعض مرتبہ کہتا غضب کیا ہے؟ یہ

عربی زبان کے متعلق کہہ دیا۔

آپ صرف اس فقرہ کو میری آج کی اس حاضری کی قیمت سمجھیں، آج کل کے
مدرسہ کے خادم اور ناظم سے تقریر کی فرمائش کرنا بڑی خطرناک بات ہے، معلوم نہیں
کیا کیا کہے گا کن کن چیزوں پر تنقیدیں کرے گا اور کیسے حرف گیری کرے گا، اور ہم
ایک برادری ہیں، ہم سب کو معلوم ہے کہ کیا کمزوریاں آگئی ہیں مدرسہ میں۔ اس لیے آ
خطرناک کام کیا، میں اس خطرہ سے اپنے کو بچاتا ہوں اور آپ کو بھی محفوظ رکھتا ہوں
آپ صرف اتنی بات میری یاد رکھیں کہ "قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ" ہر شخص کی
اصل جو ہے اور قیمت کا لفظ عربی میں بڑا قیمتی ہے۔ یہ بھی بتا دوں آپ کو قیمت یہ
ہے کہ اس کی یہ قیمت (بلکہ جس کی طرف امید و آس کی نگاہیں اٹھتی ہوں یہ ہے
فن میں سونے کے بھاؤ تولنے کے قابل) اور جس سے اس کو سر پر بٹھایا جائے اور جس
کو آنکھوں میں جگہ دی جائے اس سب کے لیے اگر منفرد لفظ کہا جائے عربی داں، یہاں مو
مولوی عبد اللہ عباس صاحب ندوی ہیں یہ سالہا سال سے عربوں میں رہتے ہیں اور
زبان کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں کہ قیمت کا لفظ جس کا ترجمہ اردو میں ہو نہیں سکتا،
کہہ لیجیے، اصل سند فضیلت کہہ لیجیے، احترام کی وجہ کہہ لیجیے اور جس سے سہارا ہو وہ
"قیمۃ کل امرئ" یہ نہیں کہ جو اس کو تنخواہ ملتی ہو وہ قیمت ہے اس کی نہیں، اس کی
اصل قدر و قیمت ہے اور اصل جو اس کے اعزاز اور احترام کا باعث ہے وہ "ما یحسنہ"
ہے جو کام وہ دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر جانتا ہو جس میں اس کو کمال اور دسترس"

ہو، جس میں شان امتیازی حاصل ہو، آج ہم ڈھونڈ رہے ہیں کہ قرآن میں کسی کو امتیاز حاصل ہو ملنا مشکل ہوتا ہے، اور حدیث میں اور زیادہ ملنا مشکل ہوتا ہے، تفسیر میں اور تدبر قرآن میں اور زیادہ ملنا مشکل ہوتا ہے، اور معمولی صرف و نحو پڑھاتے ہیں، ایسا ملکہ ہو کہ بالکل اس کو پڑھ لینے کے بعد خالی ہو جائے۔ اس سے آدمی چاہے اندھیرے میں جائے، چاہے کہیں جائے، کوئی اس کو پکڑ نہیں سکتا، لیکن ہم ہندوستان میں ، نقائص رہتے ہیں، ہم سنایا کرتے ہیں کہ علامہ بہجۃ البیطار نے ہم سے کہا "مجھے ایک مضمون پڑھنا تھا، مجھے دعوت دی گئی پہلی مرتبہ ۵۱ھ سے پہلے کی بات ہے کہ دمشق گیا تھا پہلی مرتبہ وہاں ہمارے جاننے والوں میں مصطفیٰ بہاالامیری مرحوم . . . تو ہم سے کہا آپ کی یونیورسٹی میں تقریر ہونی چاہیئے۔ اور اس زمانہ میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر ایک عیسائی تھا اور بڑا فاضل تھا، اور مسئلہ فلسطین کے اسباب کے بارے میں (مقالہ پڑھنا تھا) خیر ہم نے اس کی تیاری کی از سر نو مطالعہ کیا فلسطین پر، اور صلاح الدین ایوبی کی تاریخ پڑھی۔ اور اس کے بعد فلسطین کے بارے میں جو کچھ تھا لکھا، جب مضمون لکھنے بیٹھا ہوں تو بتاتا ہوں کہ آپ کے لیے مفید ہو۔ اگرچہ عربی لغت سے پڑھ چکا تھا اور عرب بھی کیسے عرب علامہ دکتور تقی الدین ہلالی مراکشی کی نظیر نہیں ملتی تھی، ہم نے ان کی نظیر کہیں پائی نہیں، الفاظ کی صحت کے بارے میں کہ علامہ امیر شکیب ارسلان اور علامہ رشید رضا میں جب کسی لفظ کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا کہ عرب اس معنی میں اس لفظ کو بولتے تھے کہ نہیں تو کہتے تھے کہ دکتور تقی الدین ہلالی بتائیں گے، تو شیخ تقی الدین ہلالی سے ہم پڑھ چکے تھے، لیکن جب ہم نے مضمون لکھا تو ہم نے مناسب سمجھا کہ بڑے عرب عالم اور نقاد کو پہلے سنا دیں، میں آپ کو بتاتا ہوں، آپ کے کام کی بات ہے، کیا تھا میں مضمون پڑھ دیتا، نہ مجھے کوئی اجرت ملی تھی اور نہ مجھے تعریف چاہیئے تھی، نہ ہی وہاں ملازمت کرنی تھی کہ اس کا فائدہ ہوتا ہے کہ نہیں لیکن ہم ان کے پاس گئے اور اول سے آخر تک ان کو سنایا کہ اعراب بھی ہم صحیح پڑھیں

اور لفظ بھی، آپ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ عربی میں صرف اعراب ہی پر انحصار نہیں
بلکہ حروف ثانی جو حرکات ہیں۔ مثلاً آپ فقر کو اگر وہ اعراب کی حیثیت سے
مرفوع ہے تو مرفوع کہیں گے اور منصوب ہے تو منصوب کہیں گے، لیکن قاف کا بھی ایک
اعراب ہے اگر آپ قاف کو متحرک پڑھیں گے تو سب پر پانی پھر جائے گا"
کہیں گے، فقر کو فقر کہہ دیں گے آپ متحرف کو شرف کر دیں گے تو متحرک کو ساکن پڑھیں
گے اور ساکن کو متحرک پڑھیں گے تو سب پر پانی پھر جائے گا۔

آپ کو بتاتا ہوں کہ زبان بہت ہی حساس چیز ہے، اس کی طرح حساس
بہت کم ہوتی ہیں، ایک ہلکی سی غلطی سے بالکل نظر سے گر جاتا ہے، خواہ اول سے
تک سینں، مجھے بھی احساس تھا لکھنے لگے آپ "الف لام کا استعمال بہت صحیح کر
نا ہوں پر اعلام پر اس میں بڑی غلطی کرتے ہیں ہندوستانی مکہ مکرمہ میں ایک ہند
عالم تھے ایک عرب عالم کے پاس گئے ہوئے تھے، انہوں نے کہا "أنا ذاهب
أذهب من المكة إلى المدينة فهل لكم حاجة" تو کہا "حاجتي الوحيدة
تأخذ الالف واللام من مكة وتضعها على المدينة" مجھے اسی کی ضرورت ہے
آپ مکہ سے الف لام نکال لیجئے، اٹھا لیجئے گا اور مدینہ کو ڈال دیجئے گا، اس لئے
بغیر الف لام کے ہے اور مدینہ الف لام کے ساتھ اور یہ سماعی ہے عرب میں، خود
میں کئی صوبے ایسے ہیں جو الف لام کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں، جیسے السند وغیرہ
بھی کہتے ہیں لیکن اور کسی ملک یا شہر پر الف لام داخل نہیں کرتے کیونکہ قاعدہ نہیں
ملک شام۔ الشام، العراق، لیکن مصر کیوں نہیں ہے المصر نہیں معلوم وجہ سے؛
تو مصر پر الف لام نہیں آئے گا، الایران نہیں آئے گا، لیکن العراق پر آئے گا"
آجائے گا، تو زبان کا مسئلہ ایسے ہی تھا جیسے معلوم ہے، بھی آپ کو بتاتا ہوں اس پر
سی غلطی آپ سے ہو گئی کہ فقہ ہی میں نہیں، فقر میں، حدیث میں اور کلام وغیرہ میں ا

جیا جاتا ہے اس میں تو ایک غلطی سے سب پر پانی پھر جاتا ہے پھر وہ نظر سے گر جاتا ہے اور کسی اور ذریعہ سے وہ اپنا کلام ظاہر کرنا چاہے تو اس کلام کا اثر نہیں ہوتا، بڑی نازک چیز ہے، خاص طور پر اہل زبان کے کسی معاملہ میں

اسی لیے ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے انہوں نے عربی زبان کو عربی زبان کی حیثیت سے پڑھنے کی پہلی مرتبہ دعوت دی ہندوستان میں، ورنہ عربی زبان کو ذریعہ کے طور پر مجھ سے خود کہا ایک بڑے عالم نے، مستند عالم نے نام نہیں لوں گا کہ عربی زبان کی قدر و قیمت اتنی ہے کہ فقہ و حدیث کی کتابیں سمجھ لی جائیں، بس اتنا کافی ہے، لیکن حضرت مولانا محمد علی مونگیری جیسے عارف باللہ، ان کا خط ہے میرے والد صاحب کے نام محفوظ ہے خطوط میں، کہ یہاں ایک عرب عالم ہیں بہت اچھی تقریر کرتے ہیں، ہم ان کو تیار کر رہے ہیں کہ وہ جائیں اور ندوہ میں پڑھائیں، اور دیکھئے اس کا خیال رکھئے گا کہ لڑکے عربی میں تقریر کر سکیں، اور اظہار خیال کر سکیں، اس وقت ان کو خیال تھا تو کہنے کی بات یہ ہے کہ صرف اتنا جملہ آپ کے لیے چھوڑتا ہوں بطور نصیحت کے یا بطور وصیت کے کہ "قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ" ہر شخص کی قیمت وہ ہے جس کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور کامیاب طریقہ پر جانتا ہو اور کر سکتا ہو، تو آپ کے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ آپ فقہ سمجھنے لگیں، مطلب نکالنے لگیں، مسئلہ بھول جائیں تو آپ کو معلوم ہو کہ یہاں سے نکال لائیں گے، یہاں ملے گا، وہ سب کر سکتے ہیں، لیکن کسی ایک فن میں آپ کا امتیاز بھی حاصل ہونا چاہئے اور ہمارے مدارس کا تو پیغام یہ ہے اور ان کی بنیاد اس پر ہے کہ ایک فن میں نہیں بلکہ تمام فنون جو وہاں پڑھائے جاتے ہیں ان سب میں آپ کو رسوخ ہونا چاہئے، "قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ" کا مطلب رسوخ بھی ہے، یعنی آپ کو صرف علم نہ ہو بلکہ رسوخ فی العلم بھی حاصل ہو، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف کی! "والراسخون فی العلم" یعنی اللہ تعالیٰ جب فرمائیں اور وہ کیا ہے،

الراسخون فی العلم تو رسوخ بھی کم سے کم علماء کے لیے جو دین کی خدمت کریں یا قائم کریں، مجالس میں تدریس کا فرض انجام دیں، یا افتاء کا فرض انجام دیں، ان کے لئے "قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ" بھی ان کے سامنے رہنا چاہیے، اور "الراسخ فی العلم" بھی رہنا چاہیے، بس اس کی آپ کوشش کیجئے، اس میں بڑا زوال تیز علمائے اور سطحیت پیدا ہو رہی ہے کسی ایک فن میں بھی کوئی جس کو کہتے ہیں استقرار اور تعمق، نہیں ہوتا، اس تعمق کو پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور خاص طور پر ایسے مدارس میں جو ہنگامے سے ہٹا ہوا ہے، اور بڑے سیاسی میدانوں سے اور ہرج کل کے جو مشاغل ہیں، آج کل تحریکیں ہیں، ان سب سے دور ہیں، یہاں یہ کام زیادہ آسان ہے بہ نسبت بڑے مدارس کے، یہاں تیاری کر لیجئے پھر آپ کو اختیار ہے، آپ دیوبند جائیے، یا جزیرۃ العرب کے کسی مدرسہ میں چلے جائیے، مگر صرف نحو کی بنیاد اور ابتدائی جو مقدمات ہیں ان میں آپ کو پختگی ہونی چاہیے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو توفیق دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ا۔ استاذ محترم جناب مولانا محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ، مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور استاذ محترم جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی مدظلہ، معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء

۲۔ ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنی، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مرزا انصر بیگ

اردو ذریعہ تعلیم اور عصری تقاضے

محبان اردو ! مجھے آج کے اس سیمینار میں شرکت کرتے ہوئے بے حد مسرت محسوس ہو رہی ہے کیونکہ میں خود بھی اردو کا ایک ادنیٰ خدمت گزار ہوں۔ یہاں اس محفل میں اردو زبان وادب کے اداروں اور تحریکات سے وابستہ ایسی سرکردہ شخصیتیں موجود ہیں جن کو مخاطب کرنا میرے لیے باعث عزوشرف ہے۔ انجمن ترقی اردو ہر اعتبار سے ایک فعال اور متحرک ادارہ ہے جس پر ہمیں ناز ہے کہ اردو زبان کی ترقی وترویج میں اس نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادب نے تقریباً تمام اصناف سخن مثل نظم ناول نگاری افسانہ نویسی اور FANTACY فنتاسی میں بڑی تیز رفتاری سے ترقی کی ہے اور ہمارے ادب کا ذخیرہ سرمایہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے ہمارا اردو ادب آج دنیا کی کسی بھی ترقی پذیر اور ترقی یافتہ زبان سے کم نہیں بلکہ ہم پلہ ہے۔ شاعری

میدان میں ہماری ترقی قابل رشک ہے خود ہمارے شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں (جس
کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ پر ناز و فخر ہے) اب بھی کئی صاحب طرز شاعر
و ادیب موجود ہیں اس ضمن میں اُردو اکیڈمی کو بھی اعزاز حاصل ہے کہ ہر سال مختلف
اصناف کی مطبوعہ کتابوں پر انعامات دیئے جاتے ہیں اور نئی کتابوں کے مسودات کی
اشاعت و طباعت کے لیے امداد فراہم کی جاتی ہے۔

آج آپ نے اس سیمینار کا موضوع

"اُردو ذریعہ تعلیم اور عصری تقاضے"

رکھا ہے اس کے لیے انجمن ترقی اُردو کے ارباب کو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں کیونکہ
حالات حاضرہ کے تحت اس کا بھرپور جائزہ لینا اس وقت کی ایک اہم ضرورت محسوس
کرنے لگا ہوں جب سے میں نے اُردو اکیڈمی کے صدر کا عہدہ سنبھالا ہے کئی اُردو اداروں
تنظیموں اور محفلوں میں مدعو کیا جانے لگا ہوں اور اس دو ماہ کے دوران کئی قابل احترام
مصنفین شعرا ادیب اور اساتذہ سے شرف ملاقات رہا ہے۔ اس دوران مجھے ایک
گونہ تشنگی کا بھی شدت سے احساس ہونے لگا ہے اس احساس کو میں پوری دیانت
کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

اس گفتگو کے دوران اگر آپ اس اظہار احساس کو "سخن گسترانہ" سمجھنے لگیں تو
میں معافی کا خواستگار ہوں یقین کیجئے اس سے قطع بحث مقصود نہیں ہے بلکہ آپ کو بالکلیہ
"اپنا" تصور کرتے ہوئے دل کی بات ایمانداری کے ساتھ اپنا حق جان کر آپ کے سامنے اپنے
ان ناقص خیالات کو پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم اُردو والوں نے اُردو
اور اُردو زبان کے درمیان موجود خط فاصل کو شاید نظر انداز کر دیا ہے اگر ہم اُردو کا ایک
مکمل زبان کی حیثیت سے جائزہ لیں کہ کیا یہ ترقی پذیر ہے یا مائل بہ تنزل تو کم از کم میں اپنی
دانست میں اسی نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوں کہ بہ حیثیت ایک مکمل زبان اُردو کا تنزل ہو رہا ہے۔

اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کے حال زار سے آپ سب بخوبی واقف ہیں اس
بوں حالی پر ہر اردو دوست خون کے آنسو بہاتا ہے اردو ذریعہ تعلیم کے مسائل میں معیاری
نصابی کتب کی عدم دستیابی سرکاری مدرسوں کی خستہ حالت مدرسوں میں طلبہ و اساتذہ کے
لئے بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی اساتذہ کی کمی اہم مسائل ہیں۔ دوسرے زمرے میں وہ مسائل
ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے دلی رنج اور تکلیف ہوتی ہے ان میں طلبہ کی گرتی ہوئی تعداد
ردو تدریس کا کمتر معیار اساتذہ کی عدم دلچسپی کا مسئلہ شامل ہے۔

اسکولی تعلیم کے مسائل کے سلسلے میں رام کرشنا کمیٹی کی رپورٹ میں جن مسائل کی
نشاندہی کی گئی ہے ان کے بعض اہم نتائج بتائے گئے ہیں۔ انہیں جان کر دکھ ہوتا ہے۔ مثلاً دو چار جماعتوں
تک پڑھنے کے بعد اچانک تعلیم ترک کرنے والے طلبہ جو DROP - OUTS کہلاتے ہیں
اردو میڈیم میں دیگر میڈیم کے اسکولوں سے زیادہ ہیں تعلیمی معیار کا اندازہ اس سے
لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ برس TEACHRS SELECTION TEST میں اردو ذریعہ
تعلیم کے 600 امیدواروں نے شرکت کی تھی ان میں ایم اے۔ بی ایڈ۔ ایس ایس سی اور ٹی ڈی سی
کامیاب امیدوار بھی تھے لیکن اتنی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے کے باوجود 600 میں سے صرف
۵۰ اساتذہ کامیاب ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹسٹ کا امتحانی پرچہ
objective type کا تھا اور امیدوار پرچہ حل کرنے کے گر سے ناواقف
تھے۔ اس مسئلے کی یکسوئی کی اردو اکیڈمی کوشش کر رہی ہے اب سلکشن ٹسٹ منعقد ہونے والا
ہے اس میں شرکت کرنے والے اردو امیدواروں کے لئے اردو اکیڈمی نے "کوچنگ کلاسس"
پروگرام بنایا ہے اس کے لئے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں ہر مضمون کے لئے امتحانی
پرچوں کے نمونے تیار کئے گئے ہیں ہر مضمون کے تقریباً ایک ہزار سوالات کی ان کو پریکٹس
(مشق) کروائی جائے گی اور کوچنگ کے دوران امیدواروں کا امتحان بھی لیا
جائے گا۔ امید ہے کہ اس کوچنگ کا اردو ٹیچروں کو فائدہ ہوگا اس وقت 350

اُردو میڈیم ٹیچرس کی نشستیں خالی ہیں مگر اس ٹسٹ میں جو حکومت شاید ختم ستمبر تک رکھے گی امیدوار کامیاب ہوجائیں تو انہیں سرکاری ملازمتیں ملیں گی۔

میری رائے میں اُردو کو روزگار سے جوڑنے کی ضرورت ہے اس کے علاوہ ان شرائط کی تکمیل ضروری ہے۔ جو حکومت عائد کرتی ہیں انتظامی اور دیگر سرکاری سطحوں پر اُردو استعمال ختم ہوگیا ہے اس کی جانب ہم نے توجہ نہیں کی ہم نے اپنی مادری زبان کی ضرورت کو مشاعروں ادبی محفلوں سیمنار اور مباحث تک ہی محدود رکھا ہے حال آں کہ اُردو زبان کی ضرورتیں ان کے علاوہ اور بھی ہیں علمی و فنی اعتبار سے اُردو کی ترقی پر ہم نے خاطر خواہ نہیں دیا جتنی صلاحیت توانائی اور وقت "عشقیہ شاعری" پر صرف کیا گیا اگر اس کا نصف حصہ بھی علمی و فنی پہلوؤں پر کیا جاتا تو آج یہ صورت حال پیدا ہوتی ہم نے اُردو کو معشوق کی زلفوں کے خم و پیچ میں اسیر رکھا لب و عارض کاکل و رخسار سے فرد کی تنہائی اور غم ذات کے نئے تصورات تک اُردو شاعری کا یہ سفر بہت طویل ہوچکا ہے میں اس سفر کا مخالف نہیں لیکن سفر میں اگر تنوع نہ ہو تو اس کی یکسانیت بھی ناگوار ہو جاتی ہے ہمیں اُردو کو عصری تقاضوں کو پورا کرنے کا متحمل بنانا ہوگا۔

اُردو کو حکومت کی جانب سے انصاف کی ضرورت ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اُردو کو انصاف جس انداز میں ملنا چاہیئے تھا نہیں ملا جہاں تک تلگودیشم حکومت کا تعلق ہے سابق ہماری سرکار نے اُردو کی تعلیمی و دیگر میدانوں میں ترقی کے لئے G.O جاری کیا تھا لیکن G.O کی اُردو کے بعض گوشوں نے سخت مخالفت کی چار مینار سے ایک ریالی نکالی گئی جس سابق چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چناریڈی نے سبز جھنڈی دکھائی اس وقت یہ عہد بھی کیا گیا کہ تلگودیشم کے G.O کے نقائص کو ختم کرکے ایک جامع جی او متبادل کے طور پر جاری کیا جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۹۹۰ میں کانگریس اقتدار پر آئی تو یہی سبز جھنڈی دکھانے والے اُردو میڈیم کے تحصیل یافتہ ڈاکٹر چناریڈی چیف منسٹر بنے تو انہوں نے اُردو والوں سے آنکھیں

پھر کہہ سکتا ہے کہ اردو بڑی تیز رفتار سے محض ادبی زبان بن رہی ہے کیا ہم نے سنجیدگی سے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ پچاس برس پہلے تک ہم نے کبھی اردو زبان میں اعلیٰ ترین فنی تعلیم دی تھی جامعہ عثمانیہ دنیا کی وہ پہلی دانش گاہ تھی جس نے اردو ذریعہ تعلیم سے نہ صرف سماجیات اور معاشیات سے طلبہ کو روشناس کرایا تھا بلکہ فنی علوم جیسے ایم بی بی ایس انجینئرنگ کیمیکل ٹکنالوجی اور سائنسی علوم کی تمام ڈگریاں بھی حاصل کی جاتی تھیں آج بھی اس محفل میں ڈاکٹر ایسے بہت سے موجود ہیں جنھوں نے اردو میڈیم سے ایم بی بی ایس ڈگری حاصل کی اور بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں جن میں ڈاکٹر حمید اللہ خان اور ڈاکٹر ایم اے مجید اور ڈاکٹر سی نارائن ریڈی (جو حکومت کے ثقافتی اڈوائزر رہیں) وغیرہ حضرات کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

عزیز دوستو! غور فرمایئے کہ آیا ہماری زبان نے ترقی کی ہے یا وہ علمی اعتبار سے انحطاط پذیر ہو گئی ہے کیا یہ تلخ حقیقت نہیں کہ اردو کے اس گہوارے حیدرآباد شہر میں جس کو اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کو جنم دینے کا فخر حاصل ہے آج انحطاط کا یہ عالم ہے کہ اردو میڈیم کی پرائمری تا ثانوی جماعتوں کی درسی کتب تک چھپا نہیں رہے ہیں۔ اعلیٰ جونیئر اور ڈگری سائنس میں درسی کتب کا ہے۔ تاریخ سماجیات معاشیات اور سیاسیات پر مستند کتابوں کا قحط ہو گیا ہے۔

گو اردو حیدرآباد اور ساری ریاست میں اردو دانوں کا یا ایسے حضرات کی کمی نہیں جو ان مضامین پر درسی کتب مرتب کر سکیں اگر ہم ان طلبہ کو جو اردو میڈیم میں پڑھ رہے ہیں درسی کتب فراہم نہ کر سکیں تو پھر ہم ان بچوں اور ہماری اردو زبان کے درخشاں مستقبل کا خواب کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ اگر دیکھتے ہیں تو پھر اس خواب کو پریشاں ہی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قواعد اور علمی اعتبار سے زبان کو ترقی دینے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ کہنا کہ چونکہ ہم ادب اور شاعری کی ترقی میں پیدا شدہ اس فاصلے کو ترقی سمجھتے ہیں انحطاط کی ایک

ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ ترقی کا سفر اوپر کی جانب اور انحطاط کی مسافت نیچے کی طرف ہوتی ہے
کتنے ہی علوم تھے جن میں ہم نے دنیا کی رہنمائی کی علم الجبرا، علم کیمیا، طبیعیات، فلکیات اور
علم نجوم کے ہم موجد تھے اور جب تک ہم نے حصول علم کو اپنا شعار بنائے رکھا ہمارے اسلاف
فاتح عالم بن کر ابھرے تھے ان علوم کے خزینوں کو اپنا کر اور انہیں یورپ میں منتقل کر کے
ہی اہل مغرب نے اپنی نشاط ثانیہ کی اساس رکھی ان علوم کے خزینوں کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے علامہ اقبال نے بڑے دردمندانہ انداز سے کہا تھا کہ

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی

اور کرب کے ساتھ کہا تھا کہ انہیں یورپ میں دیکھ کر ان کا دل سی پارہ ہوتا ہے ۱۲ ویں
صدی عیسوی کے بعد مسلم دنیا میں ہمارا نام نشان باقاعدہ رہا۔ آج علوم سے فراریت کے اس
رجحان نے ہمیں، تہی دامن کر دیا ہے ہمارے اجداد ابن خلدون، بو علی سینا ہمارے شاندار
ماضی کی زندہ جاوید مثالیں ہیں لیکن اردو زبان جو گویا ہمارا تہذیبی سرمایہ ہے ہم ماضی پرست
بن کر نہیں رہ سکتے ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ قومیں جو مستقبل ساز نہیں ہوتیں وہ
زمانے کی جدید علوم کو اپنے دامن میں نہیں سمیٹتیں وہ

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

کے مصداق قصہ پارینہ بن جاتی ہیں

میں اردو اکیڈمی کی جانب سے یہ کوشش کر رہا ہوں کہ جدید علوم اور
درسی کتب کی اشاعت عمل میں لائی جائے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کام مشکل ہے لیکن اگر
آپ جیسے اہل علم حضرات اور اردو کے مخلص خدمت گزاروں نیز اردو کے حوصلہ مند جیالوں کا
تعاون حاصل رہے تو یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے اور یہ چند باتیں۔ میں نے آپکے گوش گزار
کیں ان پر غور کیجئے اور اپنے صلاح و مشوروں سے مجھے نوازیئے اور اس کو آپ "سخن گسترانہ"
سمجھیں بھی تو معاف فرما دیجئے۔

محمد اسحاق

میرٹ کلاس

ایک ہی جماعت میں عام طور پر طلبہ کی درجہ بندی کچھ اس طرح ہو جاتی ہے ذہین اوسط اور اوسط سے کم تر ذہین استعداد مختلف ہونے کی وجہ ان کا تعلیمی معیار، فہم اور سوجھ بوجھ بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے توارث HEREDITY اور ماحول ENVIRONMENT کا۔ توارث ماں باپ کا عطیہ ہے۔ جو استقرار حمل کے بعد پھر اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہتی البتہ ہم ماحول کو جتنا چاہے مالدار بنا سکتے ہیں یہ ہمارے قابو کی چیز ہے۔ بچہ حواس خمسہ کے ذریعہ اپنے ماحول میں اطراف و اکناف میں سینکڑوں مشاہدات اور تجربات سے سیکھتا جاتا ہے لیکن موثر ماحول صرف تعلیم ہے۔ تعلیم ایک منصوبہ بند ماحول فراہم کرتی ہے۔ باوجود سب کو ایک ہی قسم کی تعلیم اور یکساں توجہ کے بعد بھی طلبہ میں فرق ہو جاتا ہے۔ وہ طلبہ جن کا توارث زرخیز ہے وہ تعلیم سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں اور جن کا توارث محدود اور غریب ہے، اچھی سے اچھی تعلیم ان کے لیے زیادہ فیض رساں نہیں ہو پاتی۔ I.A.S کی کوچنگ کلاس میں ہزاروں گریجویٹس دن رات تیاری کرتے ہیں۔ لیکن ہزار میں بس دو چار ہی ان اصلی امتحان اور انٹرویو میں پورے اترتے ہیں۔ بائبل اور قرآن شریف میں اس کی ایک اچھی مثال دی گئی ہے۔ آسمان سے باران رحمت تو زمین پر برستا ہے۔ لیکن جو بنجر، پتھریلی اور بنجر زمین پر پڑتی ہے وہاں کچھ بھی نہیں اگتا۔

اگ آتی ہے یہی بارش جب زرخیز زمین پر پڑتی ہے تو فصل شباب پر آتی ہے اور پھل پھول سے جاتی ہے۔ یہی حال ٹیچر کے سبق یا پروفیسر کے لیکچر کا ہوتا ہے۔ ذہین طلبہ تو بہت کچھ اس سے اخذ کرتے ہیں۔ کند ذہن طلبہ کے سروں پر سے یہ لیکچر نکل جاتا ہے۔

بچوں کی ذہانت کا معیار I.Q معلوم کرنے کے لیے سائنٹفک طریقے معلوم کر لیے گئے ہیں۔ اگر وراثت کا رقبہ وسیع ہو اور ماحول (تعلیم) بھی اچھا ہو تو ایسے طلبہ نمرود اپنے شعبہ میں کمال پیدا کرتے ہیں۔ اگر وراثت زرخیز ہو لیکن مناسب اور موثر ماحول (تعلیم) نصیب نہ ہو تو وہ پودا چند دنوں بعد کھاد پانی کی کمی کی وجہ سے مرجھا کر رہ جائے گا اسکے برخلاف وراثت کا تحفہ محدود اور معمولی رہ گیا ہے۔ تو اس کے لئے بہترین ماحول اور تعلیم کا انتظام کئے جانے کے باوجود اس میں ذہنی استعداد کی کمی کی وجہ سے یہ ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اعلیٰ امتحانات کے لیے عام طور پر کوچنگ ایک دو سال کے لئے گریجویشن کے بعد دی جاتی ہے۔ لیکن یہ کوچنگ بھی عام طور پر فارغ جاتی ہے۔ کیونکہ ایک دو سال میں اس پتھر میں جونک نہیں لگ سکتی۔ ہوش مند اور دور اندیش لوگ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے پانچ چھ سال کی عمر سے ایک پندرہ سالہ تعلیمی منصوبے اور پروگرام کے تحت ان بچوں کو ملک کے اعلیٰ امتحانات کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اچھے پبلک سکولس جن کی تعداد ملک میں ایک فی صد سے بھی بہت کم ہے۔ یہاں ہر بچے کو ابتدا ہی سے حکومت اور اقتدار کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

ہمارے اسکولوں میں ذہین طلبہ کی بڑی مشکل یہ ہے کہ انہیں کند ذہن، غبی اور لاپرواہ طلبہ جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، کے ساتھ رہنا پڑتا ہے ان کے سامنے مسابقت کے لیے کوئی اچھا گروپ نہیں ہوتا وہ ان تمام طلبہ میں اپنے آپ کو لیڈر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ٹیچرس کو نصاب کی تکمیل کی فکر رہتی ہے وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک اور توجہ کے پابند ہیں۔

ذہین طلبہ جماعت کے اس ماحول اور گھٹن کو محسوس کرتے ہیں۔ ماحول کچھ ایسا

پڑتا ہے کہ ان کی اٹھان کو کھینچ کر نچلی سطح پر لے آتا ہے۔ یہ کیفیت تقریباً سب
گورنمنٹ اور پرائیویٹ اسکولوں کی ہے۔

مثال کے طور پر شہر حیدرآباد کے پرانے محلوں میں کئی ایک اسکول ہیں، یہاں ہر جماعت
میں ایک دو طالب علم ذہین مل جائیں گے لیکن انہیں اچھی معیاری تعلیم دینا ایک مشکل
مسئلہ ہے۔ شہر حیدرآباد کی بعض جانی پہچانی فعال شخصیتیں ایک عرصے سے اس بات پر
غور کر رہی ہیں کہ ایسے ذہین طلبہ جو شہر کے مختلف اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں اگر ان
کا انتخاب کر کے۔ ان کے لئے اچھی معیاری تعلیم کا انتظام کیا جائے تو ضرور ان میں کچھ جوہر نایاب
نکل آئیں گے اور اکثر اچھی تعلیم کی وجہ سے وہ معاشرے میں اپنا ایک باوقار مقام بنا لیں گے۔

اس سکیم کو محض نظریاتی سطح پر نہیں بلکہ اس تعلیمی سال سے عملی قدم اٹھانے
کے لیے اس اسکیم کا خاکہ تیار کر لیا جائے۔ انگلش میڈیم کے وہ طلبہ جو ساتویں جماعت کامیاب
کر چکے ہیں تو بعد سلکشن ٹسٹ اور انٹرویو کے ۲۰ ذہین طلبہ کو چھانٹ لیا جائے اور کسی
ایسے اسکول میں جس کی انتظامیہ اس میرٹ کلاس کو اپنے اسکول میں چلانے کے لئے
رضامند ہوں وہیں پر ان کی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔ اس کلاس کو پڑھانے کے
قابل اور ٹرینڈ اساتذہ کو اچھے مشاہرہ پر منتخب کر کے، اس کلاس کی تعلیم کی ذمہ داری
سونپ دی جائے، اور ان کی تعلیم و تربیت کا اور خاص کو چنگ کا انتظام کیا جائے۔
ان طلبہ کو ٹیوشن فیس کی رعایتیں، یونیفارم، کتب اور اسٹیشنری سے مدد کی جائے انہیں
موجودہ دور میں صنعت و حرفت کے میدان میں جو انقلاب آئے ہیں ان سے روشناس
کروانے کے لئے قرب و جوار میں جو صنعتی کارخانے ہیں مہینہ میں ایک مرتبہ ان کارخانوں
کو دیکھنے کا انتظام کرنا بھی شامل کیا جائے۔

آٹھویں جماعت سے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک یا پانچ سال کے لئے ان طلبہ کی
بہتر تعلیم، تربیت اور نگرانی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور اس مدت میں طلبہ کی تعداد

۲۰۰ ہو جائے گی۔ اس کا پہلا بیاچ ۹۶۔ ۹۵ کے تعلیمی سال سے شروع ہو کر تین سال بعد ۹۹۔ ۹۸ء میں میٹرک کے امتحان میں شریک ہوگا تب ہی ایک اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان طلبا کا معیار علم طلبہ سے کس حد تک اونچا ہے۔ اس کلاس کو کسی اسکول میں چلانے کے لیے چند احتیاطی تدابیر ضروری ہیں۔ کیوں کہ سمندر میں یہ ایک جزیرہ ہوگا یا صحرا میں نخلستان کچھ عجب نہیں کہ یہ جماعت طلبہ اور اساتذہ کے رشک وحسد کا شکار نہ ہو جائے۔ پیر اس جماعت کے معیار تعلیم کو مسلسل اونچی سطح پر قائم رکھنے کے لیے متعلقہ اساتذہ کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت اور پروگرام بنانا ضروری ہے۔

میرٹ کلاس کی اسکیم انوکھی اور دلچسپ ہے۔ پانچ سال بعد یہ معلوم ہوگا کہ یہاں کے طلبہ کن پیشہ وارانہ کالجوں میں داخلہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ اسکیم ضرور کامیاب ہو گی بشرطیکہ تعلیمی پروگرام پر نہ صرف گہری نظر ہو بلکہ اس کی کامیابی کے لیے مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ کے کارجبر کا تعاون بھی حاصل ہو۔ تعلیم کا کام دیرپا اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اس قسم کی عملی شروعات نہایت مبارک اور تعلیم کے میدان میں ایک فال نیک ہے۔

سلامت ۳۳

دیئے تھے کہ مرثیوں کی خوبی کا اندازہ دو ایک بندوں سے نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے بہت سے نقادوں نے اقبال کے اشعار زیادہ لکھے ہیں اور اپنے خیالات کم۔ اسی طرح اردو میں تنقید کی ابتدا تاثراتی تنقید سے ہوئی۔ اور دوسرے تنقیدی نظریات کے اثر انداز ہونے کے بعد بھی تاثراتی تنقید نے اپنا اثر باقی رکھا۔ اچھی تنقید خود تخلیق ہوتی ہے اور تخلیقی ادب کی طرف مائل کرتی ہے۔ تخلیقی ادب پر کوئی تنقید ادب سے بے نیاز رہ سکتی۔ تخلیقی ادب میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ تنقید اس کے بنیادی خیال تک پہنچ کر اسے واضح کر دیتی ہے۔ تنقید کے یہ تمام اثرات تاثراتی تنقید میں موجود ہیں۔

محمد انوار الاسلام صدیقی

فِراق کی رباعیاں

انسان کی طرح شاعری کے بھی مختلف ادوار ہوتے ہیں۔ جوانی میں آہ و بکا اور
سرور اور ایک دور شراب و کباب اور رقص و سرود سے فیضیاب ہونے کا۔ اس دور میں
شاعر غزل کو اپنے خیالات کا ترجمان بناتا ہے۔ اسکے بعد جوانی ڈھلتی ہے اور نشہ اترتا
تو غزل میں سنجیدگی آجاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ تصوف یا فلسفہ کو اپناتا ہے سب
آخری دور پند و نصائح کی طرف میلان کا ہوتا ہے تو رباعیات کو اپناتا ہے۔ فارسی شعرا
رباعیات میں پند و نصائح پر ہی گذارا کرتے رہے البتہ عمر خیام نے قدیم روش میں تبدیلی
کی۔

اردو شعراء نے رباعیات کے علاوہ نظم کا بھی سہارا لیا۔ شاعری میں تنوع نہ
ہونا ایک عیب ہے۔ انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ - eatest poet
(varied) ہے۔ بڑے شاعر کے یہاں ہمیشہ تنوع ہوتا ہے۔ اردو شعراء میں فراق
گورکھپوری کو یہ مقام حاصل ہے۔ فراق کا گھرانا اسے مذہبی روایات کے اعتبار سے
ہندو فلسفہ کا قائل تھا۔ اسلیے فراق کا ذہنی پس منظر سراسر مشرقی تھا جس نے انکو سود

اور تلسی داس سے آشنا کرایا۔ خاندان کے ادبی ذوق نے میر۔ آتش۔ انیس۔ غالب اور
نظیر کے کلام سے روشناس کرایا تو انگریزی تعلیم کی بدولت کیٹس۔ شیلے۔ بائرن۔ ورڈسورتھ
اور شیکسپیر کے علمی ذخائر سے واقف ہوئے۔ اسی لیے ان کے یہاں ہندی زبان کی مٹھاس۔ اردو
فارسی کی شیرینی اور انگریزی شاعری سا تنوع نظر آتا ہے اگر چہ کہ انکی طبیعت میں اردو ادب
کا ماضی رچا لیا ہے تو دوسری طرف اپنے زمانے کی روح اور مستقبل کی ضرورتوں سے بھی
بے خبر نہیں۔ اسی لیے انکا نکھرا ہوا ذوق ترقی پسند شعراء کو بھی سراہتا ہے۔

اردو۔ فارسی کے تقریباً تمام شعراء نے رباعیاں کہی ہیں۔ شاعری میں جب پختگی فن
کی منزل آتی ہے تو شاعر رباعیاں کہنے میں لطف محسوس کرتا ہے۔ فارسی میں مشہور رباعیوں
میں درس اخلاق۔ یا پند و نصائح پائے جاتے ہیں اور رباعیات کا تمام تر ذخیرہ اصلاحی
رنگ کا نظر آتا ہے۔ اور انہی کی اتباع اردو شعراء نے کی ہے عاشقانہ رنگ کی رباعیاں
اساتذہ قدیم میں جرأت نے کہی ہیں انیس کی رباعیاں بھی اخلاقی رنگ کی ہیں۔ حالی کا
ناصحانہ رنگ نمایاں ہے۔ اکبر نے اپنی ظرافت سے قدیم روش ترک کر کے رباعیات کو
دلکش بنا دیا۔ آسی فانی یگانہ کی رباعیاں اپنے دور کی بہترین عاشقانہ رباعیاں ہیں۔
جگت موہن لال رواں کی رباعیاں بھی خاص ہیں۔ اور جوش ملیح آبادی کی رباعیاں تکمیل فن کا
بہترین نمونہ ہیں۔ لیکن فراق گورکھپوری کی رباعیوں میں ایک نئی چیز نظر آتی ہے انکی رباعیوں
میں مغربی کلچر۔ یونانیوں کا جمالیاتی نظریہ۔ ایرانی کلچر کے ساتھ قدیم ہندو آرٹ کا رقص
و نغمہ۔ سب نے مل کر ان رباعیوں کو ایک عجیب چیز بنا دیا ہے۔ چند رباعیاں پیش ہیں۔

جب پریم کی گھاتوں میں ساغر اچھلے
جب رات کی وادیوں میں تارے چھلکے
لہراتی ہوئی فضا کو آئی دیوی
جیسے شبھو کے جٹا سے گنگا اترے

چڑھتی ہوئی جمنا کا تیز ریلا ہے کہ زلف
لہرایا ہوا سیاہ کوندا ہے کہ زلف
گوکل کی اندھیری رات دیتی ہوئی لو
گھنشیام کی بانسری کا لہرا ہے کہ زلف

○

نرمل جل میں نہا کے رس کی پتلی
بالوں سے ادر گجے کو خوشبو لپٹی
ست رنگ دھنش کی طرح باہوں کو اٹھائے
پھیلاتی ہے الگنی پہ گیلی ساڑی

○

لچکیلا گات اور اوستھا ہے کشور
وہ چال کہ بن میں رقص کرتا ہوا مور
کرکے اٹھتی ہیں کویں وہ کالی زلفیں
منہ تکتا ہے چندرماں کے دھوکے میں چکور

○

گل ہیں کہ رخ گرم کے ہیں انگارے
بالک کے نین سے ٹوٹتے ہیں تارے
ممتا کا فرشتہ بن کے دیتی ہے سزا
ماں ہی کو پکارے اور ماں ہی مارے

○

ہر جلوے سے اک درسِ نمو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

○

انگت ہے کہ گھنگھروؤں کی مدھم جھنکار
جوبن ہے کہ پچھلی رات بجتا ہے ستار
سرشار فضاؤں کی رگیں ٹوٹتی ہیں
چٹکاتا ہے انگلیاں جوانی کا خمار

○

یہ رنگ یہ بو - یہ بھیگا ہوا نور
جھرمٹ میں گیسوؤں کے جیسے حور
لو دیتا ہے رات کے دھندلکے میں بدن
یا رودِ چمن میں جل رہا ہے کافور

○

موتی کی کان رس کا ساگر ہے بدن
درپن آکاش کا سراسر ہے بدن
انگڑائی میں راج ہنس تولے ہوئے پر
امرت سے بھرا مان سرور ہے بدن

○

جو بن رس پتلیوں کے اندر ڈبو لے
اس نرمل جل میں روپ مریم دھولے
یہ نرم نظر کی سیج پلکوں کی یہ چھاؤں
سوئی ہے سہاگ رات ۔ گیسو کھولے

○

کتنا بھرپور من تھا تو تھا جب پاس
گاتے ہوئے لمحوں کا وہ رنگیں احساس
جاتے ہی ترے ہوا وہ عالم جیسے
تیوہار کے بعد شام سونی اور اداس

○

فراق کی اکثر رباعیاں خالص ہندو کلچر کی تصویر کشی کرتی ہیں اور انکا انداز بہاری لال، پدماکر اور رسیس کے دوہوں جیسا ہے ۔ ادب کا وہ حصہ جس میں خارجیت ہی کے حسن کو پیش کیا جاتا ہے وقتی لطف و تفریح کی چیز ہوتی ہے۔ فراق خارجیت سے گذرنے کے بعد معنویت کی طرف متوجہ ہوئے جسکی لذت دیرپا ہے اسلئے فراق کی رباعیاں عرفان کی حیثیت اختیار کرینگی۔

محمد قمر الدین صابری
ایڈیٹر شاداب

تاثراتی تنقید کے خد و خال

تنقید کیا ہے۔ تنقید عربی لفظ ہے' نقد سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھرا کھوٹا پرکھنے اور قدر کے متعین کرنے کے ہیں' تنقید انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتی ہے۔ اور ادبی تخلیق کا ایک مقام متعین کرتی ہے۔ تنقید وضاحت، صراحت اور ترجمانی ہے' تنقید تجزیہ، تحلیل اور تشریح ہے' تنقید جھوٹ سچ' ادنیٰ اعلیٰ اور پست و بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید ایک فن ہے اور ایک مشکل فن ہے' تنقید ایک تخلیق ہے۔ اچھی تنقید کس طرح اچھی تخلیق سے کم نہیں بلکہ بعض وجوہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے۔ اچھی تنقید کے لئے زبان و ادب کا علم اور مہارت نہایت ضروری ہے۔ زیر تنقید تخلیق کے نفس مضمون سے کما حقہ' واقفیت ضروری ہے' اچھی تنقید محض تلخیص یا تخلیق کی خوبیوں اور خرابیوں کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ اچھی تنقید وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ ایک ماہر نفسیات' ایک ادیب اور ایک شاعر کرتا ہے۔ اچھی تنقید کے لیے اصلی تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ وہ فن کے اندر چھپی ہوئی بصیرت تلاش کرے۔ اور فہم و فکر کے دریچے کھول دے۔

بقول ڈاکٹر سید جعفر "تنقید دراصل بے لاگ جانچ پڑتال اور امتیازات کے جذبہ سے بلند ہو کر تعین قدر و مقام کا نام ہے۔ تنقید تحلیل و تجزیہ، ترجمانی، ادراکِ حقیقت اور ادبی محاسبہ ہے۔ وہ آرٹ کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ صادر کرنے اور نپے تلے محاکمہ کا نام ہے۔"

غرض ادبی تنقید کسی ادبی تخلیق کے معائب و محاسن کو واضح کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ کسی ادبی فن پارہ کی تفسیر بھی ہے اور اس پر اضافہ بھی۔ یہ تخلیقی فن کی دقیق جانچ بھی ہے اور زندگی کے لیے ایک مشعلِ راہ بھی۔ یہ ادب کی نوعیت و ماہیت معلوم کرنے کے متعلق سنجیدہ غور و فکر کے دروازے کھولتی ہے۔ تنقید ادب کے علمی مطالعہ کا نام ہے۔ اور نقاد مختلف علوم کی مدد سے ادب فہمی کے مراحل طے کرتا ہے۔ اور نقاد کے میلانِ طبع کے لحاظ سے تنقید کبھی نفسیاتی نظر آتی ہے، کبھی تاریخی، کبھی جمالیاتی، کبھی تشریحی، کبھی ترکیبی اور کبھی تاثراتی دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح مختلف تنقیدی نظریات قائم ہوتے ہیں۔ اور ہر نظریہ کے کچھ اصول اور ضوابط بھی متعین ہوتے ہیں۔

نقاد جب کسی ادبی تخلیق کا جائزہ لیتا ہے تو تنقید کے مختلف نظریات کی کسوٹی پر اُسے پرکھتا ہے۔ یا کسی ایک ہی نظریہ تنقید کے تحت اس کی تشریح و تحلیل کرتا ہے۔

مختلف تنقیدی نظریات میں تاثراتی تنقیدی نظریہ ایک اہم نظریہ ہے۔ ناقد جب کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق پڑھتا ہے۔ اور پڑھنے کے بعد اُس کے ذہن پر مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن اثرات اور تاثرات کو قارئین کے سامنے پیش کر دینا اُس کے لئے کافی ہے۔ تاثراتی مکتبِ فکر کی بنیاد انیسویں صدی میں رومانی تحریک کے زیرِ اثر وجود میں آئی۔ اس مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ شعر و ادب کے مطالعہ کے بعد جو جذبات و احساسات

ہوتے ہیں وہی شعر و ادب کی قیمت کا تعین کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ کسی ادبی
تخلیق کو پڑھ کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ بذات خود تنقید ہے اور اس سے
تنقید کا کوئی طریقہ موجود نہیں ہے۔ اچھی نثر دل سے نکلتی ہے، دل پر اثر کرتی
ہے، اچھا شعر اپنے قاری کو مسرت و نشاط سے ہمکنار کرتا ہے، اچھی بات جو دل
سے نکلتی ہے، پر نہیں رکھتی مگر طاقت پرواز رکھتی ہے ۔ اور تاثراتی تنقید اسی بات
کا اظہار کرتی ہے۔

تاثراتی تنقید نگار کو ادیب یا شاعر کی زندگی اور اس کے ماحول سے کوئی سروکار
نہیں ہوتا۔ اس کا خیال ہے کہ جو ناقد تخلیق کار کی زندگی، تاریخ، سماجی اور اجتماعی
حالات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ تنقید کے بجائے دوسرے میدانوں میں جا پڑتے ہیں
اور صحیح تنقید کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں، تاثراتی تنقید نگار زندگی کے بنیادی
حقائق سے صرف نظر کر کے کسی ادبی تخلیق کے صرف حسن و قبح کے بیان کو کافی سمجھتے
ہیں۔ اس طرح زندگی اور ادب کے باہمی رشتہ کا ذکر بھی نہیں کرتے اور ادب برائے زندگی
کے نظریہ سے ہٹ کر صرف ادب برائے ادب کے قائل نظر آتے ہیں۔

تاثراتی تنقید نگار صرف فن سے حاصل ہونے والی لذت و اثر کو دیکھتا ہے
معنی کی پیچیدگیوں میں نہیں پڑتا وہ صرف ان محاسن کو دیکھتا ہے۔ جو حواس
و احساسات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہیں تاثراتی تنقید کی حدیں جمالیاتی تنقید سے
مل جاتی ہیں۔ جمالیاتی قدروں کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے، جس طرح تخلیق کار اپنی
تخلیق میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح تاثراتی ناقد
جب ادیب یا شاعر پر تنقید کرتا ہے اس کی ادبی تخلیق کے بارے میں جو تاثرات
اندر محسوس کرتا ہے ان کی تحلیل سماجی، خارجی اور نفسیاتی احوال کی روشنی میں
کرتا ہے اور تخلیق کار نے جس ذہنی فضا میں ادبی تخلیق کی ہے اسی فضا کو اپنی تنقید میں

دوبارہ پیش کر دیتا ہے۔ گویا کسی ادبی تخلیق کو پڑھ کر جو اثرات ذہن پر نقش ہوتے ہیں، ان کا اظہار تنقید ہے۔ اس طرح یہ تاثراتی تنقید بھی ایک تخلیق ہے۔ اس میں وہ سرمایہ فکر وفن بھی موجود ہوتا ہے جسے تخلیق کار نے پیش کیا ہے اور اس میں وہ اضافہ بھی ہوتا ہے جو ناقد اپنے تاثرات کے ذریعہ اس میں داخل کر دیتا ہے گویا تاثراتی ناقد ایک فنکار ہے جو تخلیقی عمل میں مصروف رہتا ہے۔ تاثراتی تنقید دراصل تاثر بھی ہے اور اظہار رائے بھی۔ تخلیق کار کے افکار پر تاثراتی ناقد اپنی رائے کا اضافہ کرتا ہے۔ وہی تاثر اور رائے تاثراتی ناقد کی تخلیق ہے۔

تاثراتی تنقید خود ایک طرح کی ادبی فنکاری ہے اور بذات خود ایک مقصود ہے۔ اس کے تین بنیادی اصول نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

۱) تاثراتی تنقید Impressionism ہے جو قوت احساس یا حساسیت پر مبنی ہے۔ مشہور ناقد پیٹر PATER لکھتا ہے۔ کہ ناقد ادب کے لیے ایک مخصوص طرز کا مزاج ضروری ہے جس میں حسین اشیاء کے ساتھ حرکت کی طاقت پوری طرح کارفرما ہو۔ آسکر وائلڈ WILDE کہتا ہے۔ کہ ایک ایسی طبیعت جو حسن سے متاثر ہونے والی ہو، ناقد کے لیے نہایت بنیادی اہمیت کی حامل ہے عرب ناقد ابن قتیبہ کہتا ہے کہ فنکار کے لئے الطبع یعنی طبیعت نہایت ضروری ہے۔ مذاق طبع میں ادبیت ہونی ضروری ہے

۲) تخلیق کار اور فنکار خود بھی ایک ایسی شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ جو حسن سے اثر قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے اس بنا پر خود تخلیق کار اور فنکار کو بھی نقد شمار کیا جاسکتا ہے۔

۳) تاثراتی ناقد حقیقت میں خود ایک فنکار اور تخلیق کار ہے تنقید خود ایک فن ہے جو ذہن کو ایک مستقل اور پاکیزہ خیالات کا آئینہ بنا دیتا ہے۔ تاثراتی تنقید تخلیق کار کے ذہنی [illegible] سے بلند کر [illegible] اعتماد

قی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ تاثراتی تنقید مغرب سے اُردو میں آئی ہے۔ عربی
تنقید جو صدیوں پہلے وجود میں آئی ہے، بڑی حد تک تاثراتی تنقید ہے۔ اور اس نے فکر و فن
اصلی نمونے پیش کئے ہیں۔ اردو کے ابتدائی ناقدین مولانا شبلی اور مولانا آزاد وغیرہ
عربی تنقید کا اثر قبول کیا اور تاثراتی طرز تنقید کو اپنایا۔ عرب ناقد ابن قتیبہ لکھتا
: بہترین شعر وہ ہے جس میں پڑھنے والا کھو جائے۔ یعنی قاری پر اتنا شدید تاثر
کہ اسی شعر کو بہترین شعر قرار دیا جائے اور ناقد اسی ایک شعر کی بناپر شاعر کو
شاعر عظیم قرار دیدے۔ مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ اس خاص شعر کی حد تک وہ شاعر شاعر عظیم ہے۔
اردو کے تاثراتی ناقد اپنے تاثرات کی تشکیل میں صرف اپنے وجدان کو
تا بناتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ ان تاثرات کو جو فنی کارنامے
کے دل و دماغ پر مرتسم کئے ہیں پڑھنے والوں تک بعینہٖ منتقل کر دے۔ حسن
، اور اس کی معنوی، جذبات کی تلگارنگی اور احساسات کا ادراک اُردو
ناقدین کا مطمح نظر رہے ہیں۔ اور داخلیت کے اسی شعور پر انکی تنقید
ہے۔ تاثراتی تنقید ایک طرح سے تحسین شناسی ہے۔ جو اسے دوسرے تنقیدی
ممتاز اور ممیز کرتی ہے۔
لب حقیقت ہے۔ کہ تخلیق بغیر تنقیدی شعور کے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اور
بغیر تخلیقی استعداد کے بے جان ہوتا ہے۔ اُردو میں وجہی سے نے کر حسرت موہانی
شاعر کا اور واضح اور کار آزمودہ تنقیدی شعور ملتا ہے۔ اور یہ شعور تاثراتی
رہا ہے۔ غالب، انشاء، سودا کے شعر کو "حدیث قدسی" کہتے تھے۔ آتش، زہیر کے
صورت حسن کی داستان بتلاتے تھے۔ شیفتہ، تیر کے کلام کو سونیا نہ بتاتے
شعر میں مومن نے دگر کے قائل تھے اور مومن کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان
شبلی نے حصہ انیس و دبیر میں مرثیوں کے طویل اقتباسات لکھ کر

پروفیسر یونس نگرامی

اقوام متحدہ کے شاہانہ مصارف

آج کل اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ منائی جارہی ہے۔ اس عالمی ادارہ کے ممبران کی تعداد ۱۸۵ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقوام متحدہ سردست مالی دشواریوں سے گزر رہا ہے کیونکہ ممبر ملکوں نے اپنے حصہ کی رقوم کی ادائیگی نہیں کی ہے جو تین ارب ڈالر ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت اس کے ملازمین کی تعداد صرف ۱۵۰۰ تھی۔ جواب بڑھ کر ۵۲ ہزار ہو گئی ہے۔ جن میں سے ۱۴ اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر نیویارک میں کام کر رہے ہیں اور ۹۶۰ ایسے افراد ہیں جو سکریٹری جنرل کے مشیر اور خصوصی ایلچی کے طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کا دوسرا سب سے بڑا دفتر جینوا (سوئزرلینڈ) میں قائم ہے اس کے علاوہ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ۱۵۰ تنظیمیں اور ادارے اور بھی ہیں جو پوری دنیا میں مختلف ناموں سے کام کر رہے ہیں۔

اس وقت اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری بطرس غالی کی سالانہ تنخواہ ۲۵.... ڈالر ہے دوسری سہولتیں اس کے علاوہ ہیں۔

۹۲-۱۹۹۳ء کے مالی سال میں اقوام متحدہ نے اپنے ملازمین کی تنخواہ پر ۲.۴ ملین ڈالر خرچ کئے تھے۔ جبکہ ۹۰-۹۱ کے مالی سال میں دس ملین پونڈ خرچ کئے گئے تھے۔

شاہانہ خرچ کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ سال ۹۲-۹۳ء میں اقوام متحدہ نے پچاس ملین ڈالر سے زیادہ رقم اپنے ملازمین کے ہوائی جہاز کے ٹکٹوں کی قیمت ادا کی تھی جو دنیا کے مختلف ملکوں کے سفر کے لیے خریدے گئے تھے۔ ان بے پناہ مصارف کے بعد آپ دیکھیں کہ دنیا کے سلگتے ہوئے مسائل پر اقوام متحدہ کی کارکردگی کیا رہی ہے۔

مسئلہ فلسطین کم و بیش پچھلے ۴۵ سالوں سے اقوام متحدہ کے سامنے پیش ہے اور صیہونی حکومت اسرائیل اس پورے عرصہ میں اپنی جارحیت پر قائم رہی اور اقوام متحدہ قراردادوں کے پاس کرنے کے علاوہ اور کوئی بھی موثر قدم نہیں اٹھا سکی۔ ۱۹۶۷ء میں عربوں کی شکست کے بعد اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر ۲۴۲ پاس کی تھی جس کی نئی تشریح و تعزیراب ۲۵ سالوں کے بعد اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری بطرس غالی کر رہے ہیں۔ اور جس کے مطابق اسرائیل اور عرب ملکوں کے درمیان امن معاہدے کرائے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے عربوں کے درمیان اختلافات بڑھے ہیں۔ مسئلہ فلسطین کا حقیقی حل سیاست کے اندھیروں میں کھو گیا ہے اور اسرائیل سب سے زیادہ فائدہ میں ہے۔

افغانستان کے مسئلہ پر اقوام متحدہ نے ۱۹۸۲ء میں مداخلت کی تھی اس کے خصوصی ایلچی چھ سال تک کابل، اسلام آباد، تہران، ماسکو، نیویارک، جنیوا کا سفر کرتے رہے اور اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ افغانستان میں نجیب کی حکومت قائم کر دی جائے۔ اور افغان مجاہدین کو حکومت سے دور رکھا جائے اور اس بات کا بھی انتظام کر لیا گیا تھا کہ ۲۷ر اپریل ۱۹۹۲ء کو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام کر لیا گیا تھا کہ ۲۷ر اپریل ۱۹۹۲ء کو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام جنیوا میں بلائی گئی کانفرنس میں نئی حکومت کا اعلان کر دیا جائے لیکن اچانک افغان مجاہدین کے کابل پر قبضہ کر لینے سے اقوام متحدہ کا یہ منصوبہ خاک میں مل گیا۔

پچھلے چند برسوں سے قبرص کے مسلمانوں کا مسئلہ بھی اقوام متحدہ کے سامنے

مسئلے کے لیے پیش سے تھے اور پطروس غالی نے اب وہ نقشہ تیار کیا ہے جس کے بموجب
جس کا بڑا حصہ یونان کو دے دیا جائے گا لیکن قبرصی مسلمانوں کے لیڈر رؤف دنکتاش نے
اس تجویز کو سکریٹری جنرل سے نیویارک میں نومبر ۱۹۹۲ء میں اپنی ملاقات کے دوران
نامنظور کر دیا ہے۔

خانہ جنگی کا شکار اور قحط زدہ صومال کے ساتھ اقوام متحدہ نے جس بے توجہی
رویہ اختیار کیا ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی نے
کہا ہے کہ اقوام متحدہ نے صومالیہ کے ساتھ بہت ہی لاپرواہی برتی ہے اگر اس نے
وقت موثر قدم اٹھاتے ہوئے تو مزید تباہی سے بچا جا سکتا تھا۔ خصوصی ایلچی نے
یہ کہا ہے کہ یہ اقوام متحدہ ہی ہے جس کی بے حسی اور بے فکری کی وجہ سے تین لاکھ سے
زیادہ افراد خانہ جنگی اور قحط سے ہلاک ہو گئے ہیں۔

بوسنیائی مسلمانوں کے ساتھ اقوام متحدہ نے جو یک طرفہ رویہ اختیار کر رکھا ہے
دنیا کے انصاف پسندوں سے پوشیدہ نہیں ہے اور اس نے اب تک کوئی بھی
اقدام نہیں اٹھایا ہے جو بوسنیائی مسلمانوں کی جان ومال عزت وآبرو کی حفاظت
کرے۔ مزید یہ ہے کہ ان کو اپنی مدافعت و حفاظت کے لیے بھی دوسرے ملکوں سے
ہتھیار لینے اور خریدنے کی اجازت نہیں ہے۔ جبکہ سربیا مددگاروں کو ہر طرف سے کمک
حاصل ہو رہی ہے۔

دوسری طرف یہ عالمی ادارہ داخلی طور پر بدنظمی اسراف اور بدعنوانی
کا بھی شکار ہے کچھ دنوں پہلے سنڈے ٹائمز نے لکھا تھا کہ اقوام متحدہ چار سو ملین ڈالر
اسراف بے جا میں برباد کر دیتا ہے اس کی کچھ تفصیلات اس طرح ہیں ۱۹۸۹ء
پناہ گزینوں سے متعلق ادارہ کے سربراہ نے اچانک اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ان
پر الزام تھا کہ انہوں نے نہ صرف نصف ملین ڈالر فرسٹ کلاس ہوائی جہاز کے ٹکٹ
ستارہ ہوٹلوں میں قیام اور غیر ضروری ناشتا کی خریداری پر صرف کر دیتے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے خلاف کوئی بھی کارروائی نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ ان کی ملازمت سے الگ کرکے ایک لاکھ پونڈ سالانہ پنشن دے دی گئی ہے۔ اسی طرح یوگنڈا اور جبوتی کے پناہ گزینوں پر کام کرنے والے اقوام متحدہ کے ایک اعلیٰ افسر نے بھی استعفیٰ دے دیا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ایک ملین پونڈ کا خرد برد کیا گیا ہے جس میں غذا، دوا اور کپڑوں کی تقسیم میں بے ایمانی کی گئی ہے اور پناہ گزینوں کے نام پر جمع کی گئی رقم کا استعمال اس طرح کیا گیا۔ اس افسر کو بھی بجائے ملازمت سے ہٹانے سے پہلے تو جبوتی میں اور اعلیٰ عہدہ پر بھیج دیا گیا۔ لیکن جب بات بہت بڑھی تو اس کو بھی ریٹائر کرکے ایک لاکھ پونڈ سالانہ پنشن مقرر کر دی گئی ہے۔

۱۹۹۳ء میں ایک بوسینائی بچی ارما کی دردناک صورت حال جب دنیا کو معلوم ہوئی تو دنیا کا ضمیر بے چین ہو گیا تھا۔ اس وقت اقوام متحدہ کے زیر اہتمام چلنے والے پناہ گزینوں کی بہبود سے متعلق ادارہ نے دنیا سے اپیل کی تھی کہ وہ زخمی اور بیمار افراد کو محفوظ جگہوں پر پہنچانے کے لیے عطیات دیں۔ رپورٹوں کے مطابق اس فنڈ میں بھی تقریباً ایک ملین ڈالر کا ہیر پھیر کر دیا گیا۔ اس افسر کے خلاف بھی کوئی تادیبی کارروائی نہ کرکے اس کو دوسرا منصب دے دیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے موجودہ جنرل سکریٹری بطروس غالی نے جب اپنا عہدہ سنبھالا تھا تو جینیوا میں قائم اقوام متحدہ کے دفتر کا معائنہ کیا اور اس معائنہ کے بعد انہوں نے اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس دفتر میں زائد افراد کام کر رہے ہیں۔ لیکن نصف تعداد کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ سنڈے ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری کے لئے جو ۹۶۰۰ مشیر اور ہوم ایجنسی کام کر رہے ہیں ان میں بہت سے افراد ایسے ہیں جن پر رشوت اور بد عنوانی کا الزام ہے۔ لیکن پھر بھی ان کو دوبارہ ملازمت دے دی گئی ہے اور دوسرے اہم عہدوں پر فائز کر دیا گیا ہے۔

پاکستان کے شہر پشاور میں افغان پناہ گزینوں کی مدد کے لئے آغاخان کی

سربراہی میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ۱۰۰ ملین ڈالر کا فنڈ قائم کیا گیا تھا جس کا
ہ دہ تر حصہ ملازمین کے تنخواہوں، ان کی تفریحات اور موٹروں کے خرچ پر برباد کر دیا
اور ایک بھی افغانی پناہ گزین کو غالباً ایک ڈالر بھی نہیں مل سکا۔ جاپان جو اس فنڈ
، عطیہ دینے والوں میں سب سے زیادہ عطیہ دینے والا ملک تھا۔ ۱۹۹۱ء میں اس
بدعنوانی کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ بھی کیا تھا لیکن پراسرار طریقوں سے یہ فائل
ئہ کے سپرد کر دی گئی ۱۹ ستمبر ۱۹۹۳ء کو امریکی ٹیلی ویژن نے اپنی ایک رپورٹ میں بتلایا
ز اقوام متحدہ کے بجٹ سے سالانہ کئی ملین ڈالر بدنظمی، بدعنوانی میں ضائع ہو جاتے
،۔ اسی طرح کمبوڈیا میں بھی اقوام متحدہ کا فنڈ خورد برد کیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ کے
باقی حساب کتاب دیکھنے والے ایک افسر کا کہنا ہے کہ سب سے زیادہ بدعنوانی
ام متحدہ کے اس فنڈ میں ہوتی ہے جو پناہ گزینوں اور قحط زدہ عوام کے لیے مخصوص ہوتا ہے

سلام ۴۸

،اس راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ ایک فنکار کی آنکھ سے جب ہم آرٹ کو دیکھتے ہیں
ٹ ہمیں حسین تر نظر آتا ہے۔ مثلاً

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے

نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو

جگن ناتھ آزاد کا کلیدی خطبہ شروع ہونے سے قبل صدر جلسہ، برطانیہ میں
ستان کے ہائی کمشنر ایکسیلینسی وجاہت شمس الحسن نے پروفیسر آزاد کا تعارف کراتے
نے کہا کہ جگن ناتھ آزاد کا شمار دنیا کے ممتاز ترین ماہرین اقبالیات میں ہوتا ہے۔ اور
ہ کے آخر میں انہوں نے پروفیسر آزاد کے لیکچر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لیکچر
سننے کے بعد ہم اقبال اور اقبال کی تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے متعلق زیادہ علم
ل کر کے جا رہے ہیں۔

(اردو نیوز سروس، دہلی)

○

جلسہ بیاد ڈاکٹر عابد علی خاں مرحوم

حیدرآباد ۱۳ نومبر ۹۵ء حیدرآباد کی علم پرور فضا میں جو شخصیتیں روشنی کا مینار بن کر ابھریں
میں ایک ڈاکٹر عابد علی خاں بھی تھے جو حیدرآباد کے کلچر اور تہذیب کے نمائندہ تھے۔ ان کا
سے بڑا کارنامہ اخبار سیاست ہے جس نے اردو صحافت کو اعتبار عطا کیا۔ اس
میں مقامی، ملکی اور عالمی خبروں کے علاوہ ادبی سیاسی اور تہذیبی مسائل پر بھرپور مضامین
و مباحث کی اشاعت عابد علی خاں کی صحافیانہ بصیرت کی مظہر ہے۔ ان کی یاد کو باقی
ہوئے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ نے اردو کی ترویج و اشاعت میں جو کام انجام
وہ بے مثال ہیں ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے مکتبہ شاداب'
ب اور محفل علم و فن کے زیر اہتمام ڈاکٹر عابد علی خاں کی یاد میں منعقدہ اجلاس میں
کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے عابد علی خاں کی علمی وصحافیانہ
پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ صحیح معنوں میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایسے ادارے
جانے چاہئیں جو ان کے مشن کو آگے بڑھا سکیں قوم میں ٹکنیکل تعلیم عام کرنے کے لئے
لی ٹکنک قائم کر کے اسے عابد علی خاں کے نام معنون کیا جانا چاہیئے۔ اجلاس کے
مہمان خصوصی جناب منظور احمد منظور نے کہا کہ سیاست نے اعلیٰ معیار کی صحافت کو فروغ
وں نے عابد علی خاں کی خدمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ادبی ٹرسٹ' اردو گھر مغل پورہ
ے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان کے علاوہ عابد علی خاں نے مشاعروں کے ذریعہ فنڈ جمع

کر کے ادارۂ ادبیات اُردو، انوار العلوم کالج اور اُردو آرٹس کالج کو مضبوط کیا۔ اس ادبی اجلاس میں ڈاکٹر حسن نے عابد علی خاں مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اجلاس کے ایک اور مہمان ممتاز ماہر تعلیم جناب محمد اسحق نے پولیس ایکشن کے بعد پیدا ہونے والی مایوسی کا ذکر کرتے ہوئے اخبار سیاست کے اداریوں کا ذکر کیا جو اس تاریکی میں روشنی کی ایک کرن تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس اخبار کی خصوصیت اس کا توازن ہے۔ صدر اجلاس جناب قمر الدین صابری نے نہایت جامع انداز میں ڈاکٹر عابد علی خاں کی شخصیت اور ان کی خدمات کے مختلف گوشوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عابد علی خان کی شخصیت بذات خود ایک تحریک تھی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی خدمات غیر معمولی ہیں جن کی وجہ سے انہیں نابغۂ روزگار کہا جاسکتا ہے۔ قمر الدین صابری نے عابد علی خان کی مقناطیسی شخصیت کے خد و خال واضح کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اردو بولنے والوں کو ایک نئی سمت اور حوصلہ دیا۔ اقلیتوں کے لیے پالیسی تھنک ٹینک قائم کرنے کی تجویز کو انھوں نے نیک فال قرار دیتے ہوئے اس کے قیام میں محفل علم و فن اور مکتبۂ شاداب کی جانب سے ممکنہ تعاون کا یقین دیا۔ جناب ایس اے رضوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ عابد علی خان نام و نمود اور شہرت سے ہمیشہ دور رہا کرتے تھے۔ اس اجلاس کو جناب اکمل حیدرآبادی، عزیز بھارتی اور رحمت کوثر نے بھی مخاطب کیا۔ اجلاس کے بعد شعری نشست کی صدارت جناب منظور احمد منظور نے کی جس میں اظہر علی اظہر، عزیز ناگپوری، ثاقب بنارسی، قمر الدین صابری، عزیز بھارتی، حلیم بابر، محبوب نگر اور معتمد مشاعرہ ڈاکٹر سید حسن کے علاوہ مہمان خصوصی اکمل حیدرآبادی، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی اور صدر مشاعرہ جناب منظور احمد منظور نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔ جناب عزیز بھارتی نے اجلاس کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

محبوب نگر میں جشن سلیم عابدی کا عظیم الشان بین الریاستی مشاعرہ

سلیم عابدی ہم سب کے پسندیدہ شاعر (جناب آر چندر شیکھر ریڈی ایم ال اے گورنمنٹ وہپ) سلیم عابدی کو میں ہی کیا ہر شخص دل و جان سے چاہتا ہے (ڈاکٹر این جنار دھن ریڈی وزیر نشہ بندی) جناب بی وینکٹ رام ریڈی کارگزار صدر جشن کمیٹی اور جناب حلیم بابر کنوینر مشاعرہ کے پریس نوٹ کے بموجب جشن سلیم عابدی کے سلسلہ میں ۲۶ر نومبر بروز اتوار دوپہر میں ادبی اجلاس کے کامیاب انعقاد کے بعد رات ۱۰ بجے ایک عظیم الشان بین الریاستی مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جسکی صدارت استاد شاعر ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے فرمائی۔ عزت مآب ڈاکٹر این جنار دھن ریڈی وزیر نشہ بندی حکومت آندھرا پردیش اور جناب آر چندر شیکھر ریڈی ایم ال اے ونپرتی و گورنمنٹ وہپ (اے پی) نے بحیثیت مہمانان خصوصی شرکت فرمائی۔ مولانا سید شاہ غفور الحق، ڈاکٹر صادق نقوی ڈاکٹر بیگ احساس، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی اور جناب سید نور محمد پروپرائٹر اعجاز پریس حیدرآباد نے بحیثیت مہمانان اعزازی شرکت فرمائی۔

جناب بی وینکٹ رام ریڈی ایڈوکیٹ کارگزار صدر جناب محمد یوسف علی کمشنر بلدیہ نائب صدر جناب صادق زیدی تحصیلدار موظف صدر تیاری کمیٹی اور جناب حلیم بابر (صدر بزم کہکشاں) کنوینر مشاعرہ نے مہمانوں کا پرجوش استقبال کیا۔ پہلے صدر مشاعرہ اور مہمانوں کی گل پوشی عمل میں آئی۔ جناب سلیم عابدی کی مختلف ادبی انجمنوں کی جانب سے کثرت سے گلپوشی کی گئی اس موقع پر جناب سلیم عابدی کی شعری تصنیف "متاع سخن" کی رسم اجرا بدست جناب آر چندر شیکھر ریڈی گورنمنٹ وہپ عمل میں آئی جبکہ جمیل نظام آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ گونج "سلیم عابدی فن اور شخصیت نمبر" کا رسم اجرا بدست جناب ڈاکٹر این جنار دھن ریڈی (وزیر نشہ بندی) عمل میں آیا۔

جناب بی وینکٹ رام ریڈی ایڈوکیٹ نے شہریان محبوب نگر کی نمائندگی فرماتے ہوئے تالیوں کی گونج میں سلیم عابدی کو شال پیش کرکے گل پوشی کی۔ مدینہ ایجوکیشنل سوسائٹی محبوب نگر کے بانی جناب محمد [illegible]ت کاربی نے سلیم عابدی کو کیسہ زر پیش کیا۔ وزیر موصوف ڈاکٹر جنار دھن ریڈی نے مومنٹو اور جناب شیکھر ریڈی ایم ایل اے نے توصیف نامہ پیش کیا، اور بعد میں ہر دو نے اپنی تقاریر میں سلیم عابدی سے دیرینہ رفاقت

ستائش کرتے ہوئے دل کھول کر مبارکباد پیش کی اور گہرے جذبات کا اظہار کیا۔ نہ صرف ٹاؤن ہال محبوب نگر زرق برق کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ بے شمار سامعین جگہ کی عدم فراہمی کی بنا باہر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک بات یہاں قابل ذکر یہ ہے کہ اس قدر بے شمار شاعروں، ادیبوں اور سامعین کے امتزاج کا شاید یہ پہلا موقع تھا جو کر کھلے دل سے ایک شاعر کی خدمات کے اعتراف میں شرکت فرما کر ادبی اجلاس اور مشاعرہ کو عالیشان پیمانے پر کامیاب بنا کر عظمت بخشی۔ اس سے سلیم عابدی کی شہرت اور ادبی صلاحیت اور خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مشاعرہ کی کارروائی کرناٹک کے مقبول شاعر جناب محب کوثر (گلبرگہ) نے اپنے مخصوص انداز میں چلا کر مشاعرہ کی فضا کو اختتام تک برقرار رکھا۔ اس موقع پر جواں سال صحافی جناب مقصود سہروردی منیجنگ ایڈیٹر روزنامہ بزم سیاست گلبرگہ بھی بطور خاص شرکت فرمائی اور پروگرام کو ریکارڈ کیا۔ اس شاندار مشاعرہ میں حیدرآباد سے صدر مشاعرہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی صاحب کے علاوہ مسرز صلاح الدین نیر، اکمل حیدرآبادی، رحمٰن جامی، رئیس اختر، خورشید مہندی، ڈاکٹر صادق نقوی، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، عزیز بھارتی، مضطر مجاز، بشیر امجد، علی الدین نوید، محسن جلگانوی، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، شاغل ادیب، ضیا عرفان حسامی، شفیع اقبال، ابوالفاروق شعور، حکیم خواجہ ضمیر، مصطفیٰ نیاز، قمر الدین صابری، نذیر انصاری، اظہر علی اطہر، بجگجیون لعل آستھانہ سحر، تقی عسکری، الفت اشرفی، ڈاکٹر فرید الدین صادق کے علاوہ دیگر مقامات سے مسرز محب کوثر (گلبرگہ) محترمہ صغریٰ عالم (گلبرگہ) گوہر کریم نگری، جمیل نظام آبادی، قادر ریاض (گلبرگہ) جمیل السعدی (نرمل) اور ضلع محبوب نگر کے مقامی شعرا میں صاحب جشن سلیم عابدی کے علاوہ مسرز محمد عبدالعزیز عزیز، صادق فریدی، نور آفاقی، حلیم بابر، بلال عارف، ظہیر ناصری، احمد خان احمد، سلطان شاہد، شکیب زیدی، تقی احمد تقی، بصیر خالد، شکیل فاروقی، مظہر اقبال صدیقی، حلیم رضا، عظیم بانالی، منان، حبیب شاہ پوری، عابد انور، عبدالغنی اثر اور عزیز معصوم نے اپنا اپنا منتخب کلام سنا کر سامعین سے کافی داد حاصل کی۔ آخر میں طنز و مزاح کے ممتاز شعرا مسرز اقبال احمد اقبال، رؤف رحیم، شاداب بے دھڑک مدراسی اور پاگل عادل آبادی نے کافی دیر تک محفل کو قہقہہ زار بنایا۔ آخر تک تمام باذوق سامعین ہر شاعر کو دل کھول کر داد سے نوازتے رہے اور محبوب نگر کی ادب دوستی کی روایت کو برقرار رکھا۔

ناظم مشاعرہ جناب محب کوثر (گلبرگہ) کے شکریہ پر یہ دلنواز مشاعرہ شب کے ساڑھے تین بجے اختتام کو پہونچا۔

محبوب نگر میں جشن سلیم عابدی کا تاریخی انعقاد

ادبی اجلاس و کل ہند مشاعرہ

کسی شاعر کی خدمات کا اعتراف کرنا، اپنی زبان، اپنی تہذیب اور انسانیت کی اعلیٰ و ارفع قدروں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

سلیم عابدی شعر و ادب کیلئے ایک ورثہ (پروفیسر غیاث متین)

جناب محمد عبدالرحیم کنوینر ادبی اجلاس کے پریس نوٹ کے بموجب ۲۶ر نومبر ۹۵ء کا دن محبوب نگر کی ادبی و تہذیبی زندگی کا ایک اہم اور یادگار دن رہے گا۔ اسی دن محبوب نگر میں جشنِ سلیم عابدی کا انعقاد عمل میں آیا جو ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ پُرسکون ماحول فضا میں ایک عظیم الشان جلسہ اور کل ہند مشاعرہ کا ٹاؤن ہال محبوب نگر میں کامیاب انعقاد معمولی بات نہیں۔ شاید یہ سلیم عابدی کی غیر معمولی مقبولیت اور چاہت کا نتیجہ ہے جو ہر کس و ناکس کے دل میں گھر کئے ہوئے ہے۔ بتاریخ 26 ر نومبر بروز اتوار دوپہر کو ٹاؤن ہال میں منعقد ہونے والے اس شاندار ادبی اجلاس کی صدارت اردو کو اعلیٰ اقدار سے ہمکنار کرنے والے پروفیسر غیاث متین، صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کی۔ جناب ، اچندر شیکھر ایم ال اے سابق وزیر ٹرانسپورٹ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، چیرمین بورڈ آف

اسٹیڈیز عثمانیہ یونیورسٹی اور جناب محمد غوث سینئر ٹریڈ یونین لیڈر نے بحیثیت مہمان
شرکت فرمائی۔ پروگرام کی شروعات سے پہلے اپر پرائمری اسکول کی طالبات نے
اقبال پیش کیا۔ جناب اے۔ بی۔ وینکٹیشور راؤ آئی۔ پی۔ ایس سپرنٹنڈنٹ آف
محبوب نگر نے شمع جلاکر پروگرام کا آغاز فرمایا اور اپنی افتتاحی پرلطف اردو
محفل کو قہقہہ زار بنایا۔ جناب محمد عبدالرحیم کنوینر جشن (معتمد اقبال اکیڈیمی)
نظامت کے فرائض نہایت عمدگی سے ادا کئے اور انہوں نے اپنی ابتدائی تقریر
میں فرمایا کہ یہ سلیم عابدی محبوب نگر کے ایک ذہین شخص، معتبر اور باوقار
جو سارے ہندوستان میں ادبی اور شعری افق پر چھائے ہوئے ہیں کی
خدمات کا اعتراف کرنا اپنی زبان اپنی تہذیب اور انسانیت کی اصلی
کو خراج تحسین پیش کرنا ہے۔

اس موقع پر جناب محمد عبدالرحیم نے ہندوستان اور بیرونی ممالک
سلیم عابدی کے سلسلہ میں پیامات بھیجنے والے بے شمار احباب، ادیبوں، شاعروں
نثر نگاروں کے اسمائے گرامی پڑھ کر سنائے۔ جناب پی چندر شیکھر نے اردو میں
تقریر سے سلیم عابدی کی زندگی ملی کا تذکرہ کیا اور اردو میں منظوم تہنیت پیش
عقیل ہاشمی نے سلیم عابدی کی شاعری کو سراہا، اور متاع سخن شعری تخلیق پر
تبصرہ کیا۔

جناب محمد غوث نے سلیم عابدی کو ٹریڈ یونین تحریک کا ایک کامیاب
دیا جس نے ہزاروں ملازمین کے مسائل برسوں سے حل کروانے میں اپنی زندگی
موتیوں میں جناب یوسف علی کمشنر بلدیہ محبوب نگر نے اپنے مقالہ میں سلیم عابدی کے
مختلف پہلوؤں کو پیش کیا۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی ریڈر شعبہ اردو حیدرآباد
نے سلیم عابدی کی تیس سالہ دوستانہ زندگی اور شعر و ادب کے بے شمار واقعات

ڈاکٹر صادق نقوی پروفیسر شعبۂ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی نے سلیم عابدی سے پندرہ سالہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی اچھوتی اور پُرمعنی شاعری پر روشنی ڈالی، جناب محمد اسحاق سابق پرنسپال کالجس آف ایجوکیشن و ماہر تعلیم نے اپنی تقریر میں کہا کہ سلیم عابدی مشاعروں اور محفلوں کے ساتھ ساتھ سیاست میں قدم رکھیں تاکہ اس وسیلے سے قوم و ملت کی بڑی حد تک خدمت کرسکیں کیونکہ ان میں وہ تمام جراثیم موجود ہیں جو ایک سیاست داں میں ہونے چاہیئے۔ ابھی وہ (۹) اداروں کے اہم عہدوں پر فائز ہیں
ڈاکٹر بیگ احساس ہیڈ شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے نہایت سائنٹفک انداز میں، سلیم عابدی کی شعری تخلیق "متاعِ سخن" کے محاسن اور خامیوں پر بصیرت افروز روشنی ڈالی اور ان کی شاعری کو قدیم روایت اور جدید لب ولہجہ کا درمیانی درجہ قرار دیا۔ جس میں ایک چاشنی جھلکتی ہے۔ ڈاکٹر بیگ نے مزید کہا کہ سلیم عابدی کو خصوصاً عزم، حوصلہ، غم، انا، جیسے الفاظ سے زیادہ انس ہے جس کا انہوں نے مختلف پہلوؤں اور مختلف انداز سے استعمال کیا ہے، اور اس پر موصوف نے سلیم عابدی کے بے شمار شعر بھی پیش کئے جسکو سامعین نے بیحد پسند کئے۔

جناب بشیر انجم نے سلیم عابدی کو ایک مقبول اور خوش طبع شاعر قرار دیا۔ جناب سلیم عابدی نے اپنی تقریر میں ان سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں بہ نفس نفیس آگے بڑھ کر مدد فرمائی، جناب سلیم عابدی نے کہا کہ آج کی یہ ساری کامیابی محض محبوب نگر کے عوام کی کامیابی ہے، آج میں جو کچھ بھی ہوں، صرف اور صرف شہریان محبوب نگر کی دعاؤں اور حوصلوں کا بدولت ہوں، محبوب نگر نے ہی مجھے یہ مقام عطا کیا ہے جو میں چار لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوں اور دیگر مقامات پر میری پذیرائی ہے اس موقع پر سلیم عابدی نے والدین اور استاذ محترم ڈاکٹر مسلم احمد جلیسی کی تربیت کا بطور خاص تذکرہ

کیا اور کہا جن کے اصلی اقدار نے میری شعری اور ادبی زندگی کو جلا بخشی۔

آخر میں پروفیسر غیاث متین صدر شعبہ اردو اور صدر ادبی اجلاس اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ سلیم عابدی کی شعری اور ادبی صلاحیت سراہنا چاہیئے جس نے تیس سال سے شاعری کی ڈور کو مضبوطی سے ا میں تھامے ہوئے ہے۔ سلیم عابدی اپنے خاص لب و لہجہ سے راست سامع دل میں اتر نے کی کوشش کرتا ہے اور اس فن میں وہ کامیاب بھی ہے کا جشن منانا، اسکی خدمات کا اعتراف کرنا واقعی نیک فعال اور وقت تقاضہ ہے اور آج وہ نیک ساعت آئی ہے۔ سلیم عابدی شعر و ادب کی دنیا وارث ہے جس نے شاعری کی اصلی اقدار کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ جلسہ کے دوران جناب محمد عبدالرحیم نے وقفہ وقفہ سے محترمہ صغریٰ عالم (گلبرگہ) حکیم خواجہ فہیم نیر الزمان نیر، جناب وقار ریاض، جناب ضیاء عرفان حسامی اور جناب نور آ آفاقی جنہوں نے چند اشعار کے ذریعہ سلیم عابدی کو منظوم تہنیت پیش کی۔ محمد عبدالرحیم اور جناب الفت سعری نے جناب سلیم عابدی کو شالیں پیش کرکے گلپوشی کی، مختلف ادبی اداروں سے تعلق رکھنے والے عہدیداروں اور مقامات سے تشریف لانے والے مہمانوں اور شہریان محبوب نگر نے سلیم ع کثرت سے گلپوشی کی۔ محبوب نگر کا ٹاؤن ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ دو ادبی اجلاس رات میں منعقد ہونے والے کل ہند مشاعرہ کو پیش نظر رکھ رات سات بجے جناب محمد عبدالرحیم کے شکریہ پر اختتام کو پہونچا۔

اقبال اور فنونِ لطیفہ : اسلامی تخلیقیت کا ورثہ

برمنگھم یونیورسٹی برطانیہ میں بین الاقوامی اقبال کانفرنس

اقبال کی شاعری نے جمالیات کا عملی تصور پیش کیا ہے : جگن ناتھ آزاد

نئی دہلی ۔ ۲۵ نومبر ۱۹۹۵ء (ڈاک سے) اقبال اکیڈمی برطانیہ کے زیرِ اہتمام "اقبال اور فنونِ لطیفہ : اسلامی تخلیقیت کا ورثہ" کے موضوع پر بین الاقوامی کانفرنس میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کی نظم "مسجدِ قرطبہ" میں ہمیں جو حسن نظر آتا ہے، وہ اس حسن سے مختلف ہے جو ہمیں سنگ تراشی، فنِ تعمیر، افزا دیا خوبصورت پرندوں میں نظر آتا ہے۔ اس نظم میں حسن اپنے بنیادی تصورات کو لیے ہوئے ایک ایسی خالص، صاف اور تابناک صورت میں موجود ہے جسے ظاہر کی آنکھ سے نہیں بلکہ باطن کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے

جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی جمالیات پر مفصل بحث کرتے ہوئے کہا کہ دنیا میں جو حسن ہمیں نظر آتا ہے، وہ یقیناً ہماری توجہ حقیقی حسن کی جانب مبذول کرتا ہے لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حسن کے مختلف پہلوؤں کو اپنی نظم "مسجدِ قرطبہ" میں یکجا کرنے کے لیے اقبال نے کیا عمل ادا کیا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ اقبال اس نظم میں ظاہر کے حسن سے بڑھ کر باطن کے حسن تک قاری کی

رہنمائی کرتے ہیں اور یہ باطن کا حسن ہے جو اقبال کو روحانیت میں (خواہ وہ افرا
جلوہ گر ہو یا اداروں میں) مہذب سماج میں اور اسلام کی تعلیم میں نظر آتا ہے ا
طرح یہ نظم حقیقی حسن (essential beauty) کا جو کسی قسم کی
سے آلودہ نہیں مرتبع پیش کرتی ہیں۔

اس ضمن میں اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی اُ
RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT AN ISLAM
کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ بقول اقبال "گزشتہ پانچ سو برس سے مسلمانوں کے تفکر پر
جمود طاری ہے۔" اور اقبال کے لفظوں میں اس کا علاج پیش کرتے ہوئے پورا قبالا
مذکورہ کتاب میں مندرجہ اقبال کے درج ذیل جملے دہرائے جن میں اقبال کہتے

"اس لیے آج مسلمانوں کے سامنے ایک اہم مرحلہ ہے
انہیں ماضی سے مکمل طور پر لاتعلق ہوئے بغیر نظام اسلام
پر دوبارہ غور کرنا ہے۔ ہمارے سامنے واحد راستہ
یہی ہے کہ ہم جدید علوم کی جانب مودبانہ اور آزادانہ
رویہ اختیار کریں اور انہی علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام
کو سمجھیں خواہ اپنی اس کوشش میں ہمیں اپنے پیش روؤں
سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

اس اقتباس کے بعد پتے ایک گھنٹے کے لیکچر میں پروفیسر آزاد نے پھر اقبال ک
میں جمالیات کی جانب رجوع کیا اور کہا کہ اقبال اپنی شاعری کے ذریعے۔
کی تائیدان کی نثر یوں کرتی ہے۔ ساری دنیا کو موجودہ حالت سے اونچا اٹھا کر زیبا
بنانا چاہتے ہیں۔ اقبال ایک عظیم فلسفی شاعر ہیں اور انہوں نے اردو اور فارسی
میں جمالیات کو ایک شعری صورت دے کر اسے ایک انقلابی کیفیت سے آشنا کیا
باقی

غزل

حضرت غلام علی عادی
19-3-262/17/2
جہاں نما حیدرآباد

کیف وہ کیف ہے محبت میں
جو ادا ہی نہ ہو عبارت میں

کس کو دیکھا ہے تیری صورت میں
آئینہ روبرو ہے حیرت میں

حسن کی شان ہے متانت میں
لاکھ شوخی رہے طبیعت میں

صبر کو جبر بھی تو کہتے ہیں
کر ادا شکر ہر مصیبت میں

حسن پر جب نہیں کوئی مائل
ہے معمد کی شان صورت میں

گو مدارِ عمل ہے نیت پر
لیکن اخلاص بھی ہو نیت میں

سر اُٹھاتے ہیں خاک کے پتلے
آگ ہے شاید اِن کی طینت میں

عقل معذور ہے تو دل مجبور
کون مختار ہے محبت میں

اس پُر آشوب دور میں عادی
اپنا جینا بھی ہے کرامت میں

سر سیدؒ

حسن داد خان
بی کام، بی ایس، اے ایس
اکاؤنٹنٹ آنبیر، 479-2-20
جوہری گلی۔ حیدرآباد

اس ایک شخص نے ملت کو راہ دکھلائی		عطا ہوا تھا جسے خرقۂ مسیحائی

ٹھٹھرتی سہانپتی شمعوں نے زندگی پائی		چراغ علم کا روشن کیا اندھیروں میں

شکستہ پا کو ہوا شوقِ جادہ پیمائی		جو کم نگاہ تھے ان کو ملا مذاقِ نظر

کسی کے عزم نے پربت کو کردیا رائی		توہمات کے بت ٹوٹنے لگے آخر

وہ سرزمیں جو کسی باغباں کو راس آئی		مہک رہی ہے علیگڈھ کی سرزمیں اب تک

پنپ سکی نہ قدامت کی کارفرمائی		کھلا دیئے گل وگلزار دستِ پُر فن سے

روش روش ہے کسی خوش نظر کا جوشِ جنوں
چمن چمن ہے کسی دیدہ ور کی بینائی

○

اکمل حیدرآبادی
ٹولی چوکی حیدرآباد

غزل

مری وفا پہ جو آجائے اعتبار تجھے
تمام عمر نہ آئے کبھی قرار تجھے

خدا کے نام کے سجدوں میں بھی ہے تو حائل
ذرا لحاظ نہیں اے خیالِ یار تجھے

محبتوں کا یہ عالم یہ ترکِ عشق کی بات
نہ سازگار مجھے ہے نہ سازگار تجھے

غمِ معاش نے ستولا دیئے کئی چہرے
خدا کرے کہ نہ ہو فکرِ روزگار تجھے

چلو یہ ترکِ محبت بھی ہے قبول مگر
یہ شرط ہے کہ نہ دیکھوں گا اشکبار تجھے

خدا نہیں ہوں جو توبہ کو فیصلہ سمجھوں
تو کر خطائیں میں بخشوں گا بار بار تجھے

اسی خطا پہ زمانہ خفا ہے اکمل سے
کہ [illegible] بار بار تجھے

○

غزل

روحی قادری
17-3-702
یاقوت پورہ بڑا بازار حیدرآباد۔

آرزو کیا ہے مُدعا کیا ہے
کوئی پوچھے تو پوچھنا کیا ہے

حسنِ یکتا کر ماجرا کیا ہے
تم ہی تم ہو تو آئینہ کیا ہے

رات روتی ہے اپنی قسمت پر
یہ ستاروں کا ٹوٹنا کیا ہے

اک مکمل سکوت ہے دل میں
ہم سمجھتے ہیں یہ صدا کیا ہے

تم مسیحا ہو یہ خیال رہے
میں تو مرجاؤں گا مرا کیا ہے

گم ہوں لطفِ سوال میں اب تک
اس نے پوچھا تھا مُدعا کیا ہے

جانتا ہوں مگر کہوں کس سے
وقت کیا ہے یہ فاصلہ کیا ہے

میری صورت سے ہے مقام اس کا
ورنہ پتھر ہے آئینہ کیا ہے

دل سے نکلے تو تیر ہے روحی
لب پہ آجائے تو دعا کیا ہے

○

ملو خان اخگر
۱/ جہاں نما حیدرآباد

ہم ان کے سامنے جب پیار کا اظہار کرتے ہیں
نظر جھکتی ہے ایسی جیسے وہ بھی پیار کرتے ہیں

محبت کی نظر پہچاننا بھی ہم کو آتا ہے
نہ جانے آپ کیوں انکار پر انکار کرتے ہیں

جنوں کا تو تقاضہ ہے گریباں چاک کر دیجے
مگر ہم ضبط کرتے ہیں لحاظِ یار کرتے ہیں

نگاہِ خاص کی اک آزمائش کے لیے شاید
مری سوئی ہوئی قسمت کو وہ بیدار کرتے ہیں

بناتے ہیں ہمیشہ آشیاں ہم برق کی زد میں
بقائے گلستاں کے واسطے ایثار کرتے ہیں

سرِ میخانہ بن جاتا ہے وہ مرکز نگاہوں کا
وہ اپنی مست نظروں سے جسے سرشار کرتے ہیں

حرم والوں کو اخگر پوچھتے ہیں کب حرم والے
جنابِ شیخ کی عزت تو کچھ مئے خوار کرتے ہیں۔

رؤف رحیم
ادبستان دکن حیدرآباد

مزاحیہ غزل

گھر سے باہر گھر کے اندر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے
پاؤ گے مجھ سا نہ شوہر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

چاہتے ہو تم اگر مخلص بھی ہو بے لوث بھی
زندگی بھر ایسا لیڈر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

بم دھماکے سے اڑا دے گا تمہیں بیوٹ سے
اور تم جیبوں میں تنخواہ ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

مہمانو! تم اگر اتنا ستاؤ گے مجھے
وہ پتہ دوں گا کہ تم گھر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

مادہ مل جائے تو چھٹ کے ہوگا وہ فرار
اور تم اپنا کبوتر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

نشہ بندی ہو گئی ہے میکدے سب بند ہیں
شاعری میں جام و ساغر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

دیکھ کر ٹی وی پہ عریاں تر کوئی منظر رحیم
راستوں میں پھر وہ منظر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

Telephone : 229161
No 37/979/84 Postal Regd. No. H/HD593
MONTHLY SHADAAB HYD.
11-5-147, RED HILLS, HYD-A.P.
ol. 12 No. 12 DECEEMBER 1995

شاداب بک کلب

۱۱-۵-۱۴۷، ریڈ ہلز۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ (اے پی)

- اردو کتب و رسائل خرید کر پڑھنے اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ اس مد پر خرچ کرنے کی عادت ڈالنے کیلئے "شاداب بک کلب" قائم کیا گیا ہے۔
- شاداب بک کلب کی رکنیت فیس -/25 روپے ہے۔
- ہر رکن کو سالانہ -/500 روپے کی کتب و رسائل خریدنے ہونگے۔ یہ رقم وہ پیشگی جمع کروائیں گے یا ہر ماہ -/50 روپے پیشگی ادا کریں گے۔
- مکتبہ شاداب کی مطبوعہ کتب پر (25) فیصد ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا دیگر کتب پر ۱۵ فیصد ڈسکاونٹ دیا جائے گا۔
- کتب کی فہرست مکتبہ پر موجود رہیگی اور منتخب کتب کی فہرست "شاداب" میں چھپتی رہے گی۔
- ہر رکن کو اپنی پسند سے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔
- مکتبہ شاداب میں غیر موجود کتب کی خواہش پر انھیں حاصل کرکے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- اگر کوئی رکن سال کے ابتدائی دس ماہ تک -/500 روپے کی کتب فراہم کرنے کی خواہش نہ کریں تو ادارہ اپنی پسند کی کتب روانہ کرے گا